برگ و ساز ما کتاب و حکمت است
ایں دو قوت اعتبارِ ملّت است

اقبالؒ اور قرآن

فکر و پیامِ اقبالؒ ـــــ قرآن کی روشنی میں

جلد اوّل

پرویز

طلوعِ اسلام ٹرسٹ ۲۵ بی، گلبرگ ۲، لاہور

نام کتاب	------	اقبال اور قرآن
مصنف	------	غلام احمد پرویز
جلد	------	اول
ایڈیشن	------	چہارم 1996ء (بلا ترمیم)
ناشر	------	طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
	------	25-B گلبرگ II لاہور 54660
	------	فون : 576 4484
طابع	------	دوست ایسوسی ایٹس
	------	الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور 54000
	------	فون 712 2981
مطبع	------	عصمت اسلم پرنٹرز

طلوع اسلام ٹرسٹ کی شائع کردہ کتب کی

جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

(طبع اوّل ــــــ مارچ ۱۹۵۵ء)

ہمارا دَور اس اعتبار سے خوش بخت ہے کہ اس میں (تیرہ سو سال کے بعد) پھر سے قرآن کی آواز بلند ہوئی ہے۔ اس میں شُبہ نہیں کہ اس آواز کے اوّلون السابقون میں بہت سی قابلِ قدر ہستیوں کے نام فخر و مسرت سے لئے جا سکتے ہیں۔ لیکن جس انداز سے علامہ اقبالؒ نے قرآنی انقلاب کی آواز سے فضا کو معمور کیا ہے، اس کا جواب نہیں ملتا۔ مبداءِ فیض کی کرم گستری سے انہیں نظر کی وسعت، فکر کی بلندی اور جذبات کی گہرائی کے ساتھ اسلوبِ بیان بھی اس قدر حسین اور دلکش عطا ہوا تھا کہ جس کے کان میں ان کی آواز پڑ گئی، وہ جھومنے لگ گیا۔ اقبالؒ نے اپنے سب سے پہلے مرتب کلام (مثنوی اسرار و رموز) میں اس حقیقت کا اعلان کیا کہ انہوں نے جو کچھ سمجھا قرآن سے سمجھا ہے اور ان کی شاعری سے مقصود یہ ہے کہ وہ قرآنی پیغام کو لوگوں تک پہنچائیں۔ اس کے بعد وہ عمر بھر اس اعلان کو (مختلف انداز سے) دہراتے رہے اور آخر تک یہی پکارتے رہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کو، کسی خاص نکتہ کے متعلق ان کی قرآن فہمی یا قرآنی استدلال سے اختلاف ہو لیکن اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنی مسلسل سعی و کاوش اور سوزِ پیہم سے ہمارے دَور کے اربابِ فکر و نظر کا رُخ قرآن کی طرف ضرور موڑ دیا۔ اور یہ جو آپ کو آجکل "رجعت الی القرآن" کی آواز چاروں طرف سے سنائی دیتی ہے، یہ اسی سعیِ مسلسل کی بار آوری ہے۔ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِى السَّمَآءِ ۙ (۱۴/۲۴)

پھر جس طرح یہ حقیقت ہے کہ قرآن کی آواز بلند کرنے والوں میں علامہ اقبالؒ کا نام سرِ فہرست نظر آتا ہے، اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ جنہوں نے اقبالؒ کے اس قرآنی پیغام کو صحیح طور پر سمجھا اور اُسے

آگے پھیلایا۔ ان میں محترم پرویز صاحب کا نام بھی سرِ عنوان دکھائی دیتا ہے۔ وہ مسلسل بیس پچیس برس سے اس فکر کی نشر و اشاعت اور اس پیغام کی تشریح و تفسیر میں مصروف ہیں۔ ان کی ضخیم مجلدات طلوعِ اسلام کے ہزارہا صفحات، اور مختلف اجتماعات میں ان کی سحر آفریں تقاریر، ان کی سعی و کاوش کی زندہ شہادات ہیں۔ یوں تو ان کی تصنیفات کی ایک سطر اور ان کی تقاریر کا ایک ایک لفظ بتا دیتا ہے کہ انہیں اقبالؒ اور قرآن پر کس قدر عبور حاصل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی قرآنی فراست، اقبالی بصیرت اور علمی تبحر کا اندازہ ان مجالس میں جا کر ہوا جس میں انہوں نے، حلقۂ درویشانِ اقبالؒ میں اقبالؒ کے کلام کو (یوں کہیئے کہ) درساً درساً سمجھایا۔ یہ مجالس ڈاکٹر عبدالوہاب عزام سابق سفیر مملکتِ مصر (متعینہ پاکستان) کے ہاں (قونصلیہ مصر میں) منعقد ہوا کرتی تھیں۔ جن خوش نصیب حضرات کو ان مجالس میں شرکت کا موقعہ ملا ہے وہ اس سے متفق ہوں گے کہ علومِ قدیمہ اور جدیدہ کی روشنی میں، قرآن اور اقبالؒ کو بیک وقت اپنے سامنے مشہود دیکھنے کے اس قسم کے مواقع اور کہیں نہیں مل سکیں گے۔ افسوس ہے کہ یہ تشریحات قلمبند نہ کی جا سکیں ورنہ ان کے بعد اقبالؒ کو سمجھنے کے لئے کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

پیامِ اقبالؒ کے متعلق، ایک جامع تصنیف کا خیال محترم پرویز صاحب کے سامنے مدت سے ہے لیکن چونکہ انہوں نے قرآن سے متعلق امور کو اپنی زندگی کے مقاصد میں سب سے مقدم رکھا ہے، اس لئے وہ جب تک ان سے فارغ نہیں ہو جاتے، اقبالؒ سے متعلق مستقل تصنیف کی باری نہیں آ سکتی۔ آج کل وہ "قرآنی لغت" اور "قرآنی مفہوم" کی تیاری میں ہمہ تن مصروف ہیں[2] اور جب تک ان کی تکمیل نہیں ہو جاتی، کسی دوسری طرف دھیان نہیں دے سکتے۔ لیکن ہمارے پاس مسلسل تقاضے پہنچ رہے تھے کہ پیامِ اقبالؒ کے متعلق پرویز صاحب کی تصریحات کا کتابی شکل میں (بلا مزید توقف) قارئین کے سامنے آ جانا نہایت ضروری ہے۔ ان تقاضوں کے پیشِ نظر ہم نے مناسب سمجھا کہ ان کے ان مضامین (اور تقاریر) کا مجموعہ شائع کر دیا جائے جو وقتاً فوقتاً طلوعِ اسلام میں چھپتے رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ مجموعہ حاضر ہے۔ ان میں سے کچھ تو طلوعِ اسلام کے دورِ اول (دہلی[3]) میں شائع ہوئے تھے اور باقی اس کے دورِ جدید (کراچی[4]) میں۔ آخری مضمون البتہ ابھی تک کہیں شائع

---

[1] جواب مرحوم ہو چکے ہیں، (۱۹۷۵ء)۔ [2] لِلّٰہ الحمد کہ یہ دونوں شائع ہو چکے ہیں، (۱۹۷۵ء)۔ [3] (۱۹۳۸ء)

[4] ۱۹۵۸ء سے یہ ادارہ لاہور منتقل ہو چکا ہے۔

نہیں ہوا. ان مضامین کے متعلق اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ قرآن کی روشنی میں علامہ اقبالؒ کی پرویزی تشریحات ہیں. ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ آپ سند ہے.

ان مضامین کے متعلق البتہ ایک بات قابلِ تصریح ہے. آپ دیکھیں گے کہ ان میں اقبالؒ کے فلسفہ سے بہت کم بحث کی گئی ہے اور اس کے پیغام کے عملی پہلوؤں کو زیادہ نمایاں کیا گیا ہے. اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان مضامین کا بیشتر حصہ ان تقاریر پر مشتمل ہے جو مختلف اجتماعات میں کی گئیں اور یہ ظاہر ہے کہ عام اجتماعات میں فلسفیانہ مباحث کا کوئی موقعہ نہیں ہوتا. وہاں ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ عام فہم انداز میں زندگی کے عملی گوشوں کے متعلق گفتگو کی جائے. دوسرے یہ کہ (ویسے بھی) محترم پرویز صاحب علامہ اقبالؒ کی اس تاکیدی تلقین کو بڑی اہمیت دیتے ہیں کہ

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بُری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

وہ ملّتِ اسلامیہ کے لئے "زمین کے ہنگامے" سہل کرنے کی تدابیر سوچتے اور زیادہ تر انہی گوشوں کے متعلق قرآن کی تعلیم اور اقبالؒ کے پیغام کو عام کرنے کی فکر کرتے رہتے ہیں. اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ان مباحث کے فلسفیانہ پہلو کو اہمیت نہیں دیتے. مقصد یہ ہے کہ ان مضامین میں فلسفیانہ پہلو کے لئے موزوں مقام نہیں تھا. ویسے ان میں زندگی کی ان مستقل اقدار کے متعلق کافی بحث آگئی ہے جن پر قرآن' انسانی عمل کی عمارت استوار کرتا ہے. جہاں تک فلسفۂ اقبالؒ کا تعلق ہے، پرویز صاحب کے پیشِ نظر یہ بھی ہے کہ حضرت علامہ کے خطبات (تشکیل جدید) کا تشریحی ترجمہ شائع کیا جائے. یہ خطبات (جو اس وقت تک بالعموم کتابِ مختوم کی حیثیت رکھتے ہیں) اس قدر اہم ہیں کہ ان کے ترجمہ اور تشریحات کی بڑی ضرورت ہے. اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے پرویز صاحب سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے. لیکن یہ کچھ اسی وقت ہو سکے گا جب وہ اپنے پیشِ نظر قرآنی پروگرام سے فارغ ہو جائیں گے. اللہ تعالیٰ انہیں ان اہم مقاصد کی تکمیل کے لئے عمر، صحت اور توفیق عطا فرمائے کہ ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوا کرتے.

مارچ ۱۹۵۵ء　　　　طلوعِ اسلام ٹرسٹ
۲۵/بی' گلبرگ ۲. لاہور

پیش لفظ

(طبع ثانی ——————— ۱۹۷۵ء)

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جو ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا مشتمل تھا پرویز صاحب کے اس وقت تک کے خطابات اور مقالات پر. اُس ایڈیشن کے ختم ہو جانے پر اس کے دوسرے ایڈیشن کے لئے تقاضے موصول ہونے شروع ہو گئے، لیکن پرویز صاحب کے پیشِ نظر ایک ایسی خود مکتفی تصنیف تھی جس میں علامہ اقبالؒ کے فلسفۂ کلام اور پیام پر سیر حاصل بحث کی جائے اور بتایا جائے کہ ان کی فکر کا سرچشمہ کیا تھا اور ان تمام جگر گدازیوں اور اخترشماریوں کا مقصد کیا! لیکن اُس تصنیف کی باری قرآنِ مجید سے متعلق پروگرام کے بعد آسکتی تھی. پرویز صاحب اس تمام دوران میں اس قرآنی مشن کی سرانجام دہی میں اس قدر مصروف رہے کہ دیگر موضوعات کے لئے انہیں بہت کم فرصت مل سکی. چنانچہ ان کی معرکہ آرا لغات القرآن (چار جلدیں) اور شہرۂ آفاق مفہوم القرآن (مکمل قرآنِ کریم کا مفہوم)، علاوہ دیگر اہم تصانیف مثل کتاب التقدیر، جہانِ فردا، شاہکارِ رسالتؐ ان کی اس مصروفیت کا حاصل ہیں. نیز، تبویب القرآن (قرآنی انسائیکلوپیڈیا) جو نمعلوم کتنی جلدوں میں طبع ہو، بھی اسی عرصہ میں تکمیل تک پہنچا. بنابریں، وہ اپنی شدتِ آرزو کے باوجود فکر و پیغامِ اقبالؒ سے متعلق اپنی پیشِ نظر تصنیف کی طرف متوجہ نہ ہو سکے ـــ اور اس دوران میں "اقبالؒ اور قرآن" کے جدید ایڈیشن کے تقاضے بڑھتے چلے گئے. جو اب پیشِ خدمت ہے.

ممکن ہے ہم اس (جدید ایڈیشن) کی اشاعت میں مزید تاخیر گوارا کر لیتے لیکن بدلتے ہوئے حالات نے پکار پکار کر کہنا شروع کر دیا کہ اس باب میں مزید تاخیر مناسب نہیں. جس طرح ہمارے صدرِ اوّل کے بعد ایک ایسی سازش وجود میں آئی جس نے اسلام کے نام کے زیرِ نقاب حقیقی اسلام کو مسخ کر کے رکھ دیا گیا (تفصیل اس اجمال کی شاہکارِ رسالتؐ میں ملے گی)، اسی طرح، اب کچھ عرصہ سے یہاں ایک ایسی سازش پرورش پا رہی ہے

جس میں اقبالؒ کے نام کی آڑ میں فکر و پیغامِ اقبالؒ کو بُری طرح مسخ کیا جارہا ہے۔ مقصد اس کا بالکل واضح ہے۔ اقبالؒ ہی نے صدیوں کے بعد اسلام کے صحیح نظریات و تصوّرات کا احیاء کیا۔ اس نے اسلام کے بنیادی مسئلہ "دو قومی نظریہ" کا تصور دیا۔ اسی نے اس فراموش کردہ حقیقت کو ازسرِنو اجاگر کیا کہ اپنی آزاد مملکت کے بغیر دین پر عمل پیرا نہیں ہوا جاسکتا۔ انہی بنیادوں پر اس نے ایک جداگانہ مملکت کا تصور پیش کیا اور پاکستان وجود میں آگیا۔ اگر اقبالؒ کو ایک قومیت پرست، سوشلسٹ، مغرب کی سیکولر جمہوریت کے علمبردار کے پیکر میں پیش کردیا جائے تو ظاہر ہے کہ نہ مملکتِ پاکستان کے جداگانہ وجود کی وجہِ جواز باقی رہ سکتی ہے اور نہ ہی اس خطۂ زمین میں حقیقی اسلام کے احیاء کا امکان۔ طلوعِ اسلام اس سازش کا مسلسل مقابلہ کئے چلا آرہا ہے اور اس سلسلہ میں ضروری سمجھا گیا ہے کہ "اقبالؒ اور قرآن" کا نیا ایڈیشن بلا مزید تاخیر شائع کردیا جائے جس میں پرویز صاحب کے اس وقت تک کے مقالات و خطابات شامل ہوں۔ ان سے آپ کو اس کا اندازہ ہوجائے گا کہ فکر و پیغامِ اقبالؒ کو مسخ کرنے کی کیا کیا کوششیں کی جارہی ہیں اور پرویز صاحب ان کے خلاف کس طرح مصروفِ جہاد ہیں۔ اسی سے آپ اس کا بھی اندازہ لگا سکیں گے کہ اس جہاد سے مقصود "محمد اقبال" نامی ایک شخص کی مدافعت اور تائید نہیں۔ اس سے مطلوب اقبالؒ کے پیش کردہ قرآنی مسلّمات کی حقیقت کشائی ہے جو پرویز صاحب کی زندگی کا مشن ہے۔ علامہ اقبالؒ کے متعلق بہت کچھ لکھا اور کہا جاچکا ہے۔ لیکن اس نقطۂ نگاہ سے ان کے متعلق بہت کم سوچا اور کہا گیا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ فکرِ اقبالؒ کے ساتھ ساتھ قرآنِ مجید پر بھی غائر نگاہ ہو۔ پرویز صاحب کو بفضلِ ایزدی یہ دونوں سعادات حاصل ہیں۔ اس لئے وہ اس زاویۂ نگاہ سے پیغامِ اقبالؒ کو پیش کرنے کے لئے موزوں ترین صاحبِ فکر و نظر ہیں۔ اگر آپ زیرِ نظر تالیف کا اس نگاہ سے مطالعہ کریں گے تو ہمیں امید ہے کہ آپ اسے بیحد مفید اور منفرد پائیں گے۔

پرویز صاحب کی قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی خوش بختی ادارہ طلوعِ اسلام کے حصہ میں آئی ہے جس پر یہ جس قدر بھی فخر کرے کم ہے۔ جہاں تک ان کتابوں کے حسنِ صوری کا تعلق ہے، اس ادارہ نے اپنے سامنے ہمیشہ بلند معیار رکھا ہے۔ اس گرانی (اور بعض اعلیٰ پیمانہ کی اشیاء ضروریہ کی کمیابی بلکہ نایابی) کے زمانے میں اس روایتی معیار کا قائم رکھنا بڑا دشوار ہے۔ بایں ہمہ، ہم اس کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں کہ معیار گرنے نہ پائے۔

والسلام

جون ۱۹۷۵ء

طلوعِ اسلام ٹرسٹ
۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور

اقبالؒ اور قرآن

(پہلے یوم اقبالؒ، جنوری ۱۹۳۸ء کی تقریر)[1]

تمہید | باوجودیکہ قرآنِ کریم میں باعتبارِ بلاغت ہر وہ حسن موجود ہے جو ایک بہترین شعر میں ہونا چاہیئے مگر متعدد مقامات پر اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ قرآن کریم شاعری نہیں. رسول اکرمؐ شاعر نہیں.

وَ مَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۙ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّ يَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۳۶/۶۹-۷۰)

اور ہم نے اس (رسول) کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ ہی یہ اس کے شایانِ شان تھی. بلکہ یہ تو (زندگی کی فراموش کردہ حقیقتوں کی) یاددہانی ہے اور واضح قرآن (اور اس کا مقصد یہ ہے کہ) ہر اس شخص کو جس (کے خون میں) زندگی کی تڑپ موجود ہو (خدا کے اٹل قوانین سے) آگاہ کردے اور نہ ماننے والوں پر (ان کی ہلاکت و بربادی سے پیشتر) اتمامِ حجت ہوجائے.

اس سے معلوم ہوگیا کہ قرآن کی رُو سے محض "شاعری" کیوں کسی پیغمبر کے شایانِ شان نہ تھی اور ایک رسول کا پیغام شعر کی تمام لطافتیں اپنے اندر رکھتے ہوئے کس طرح "شعر" سے مختلف ہوتا ہے. اس لئے کہ وہ پیغام جس کا سرچشمہ خدائے حیّ و قیّوم کا علمِ ازلی ہو' اس کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ قوموں کے عروقِ مُردہ میں خونِ زندگی دوڑا دے' مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک دے.

---

[1] منعقدہ لاہور.

یہی خصوصیت ہے جس کے لئے نوعِ انسانی کو قرآن کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (۸/۲۴)

اے ماننے والو! اللہ اور اس کے رسولؐ کی دعوت پر لبیک کہا کرو، جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشتی ہے۔

"شعر" اور قرآن کے اس نمایاں فرق کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ "شاعروں" کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ

اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۙ وَ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۙ

(۲۶/۲۲۴ - ۲۲۵)

وہ یوں ہی اِدھر اُدھر صحرا نوردیاں اور دشت پیمائیاں کرتے پھرتے ہیں اور ان کے قول و فعل اور قلب و زبان میں کبھی ہم آہنگی نہیں ہوتی۔

شاعر اور اقبالؒ میں فرق

ظاہر ہے کہ جس شخص کے سامنے کوئی منزلِ مقصود ہو گی، زندگی کا کوئی منتہیٰ ہو گا اس کا ہر قدم ایک خاص سمت میں اُٹھے گا، اُس کا رُخ خاص قبلۂ مقصود کی طرف ہو گا۔ برعکس اس کے جس شخص کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو گا، کوئی منزلِ مقصود متعین نہ ہو گی، وہ شُترِ بے مہار کی طرح جدھر مُنہ اٹھائے گا چل دے گا۔ کبھی تخیلات کی اس حسین و جمیل وادی میں، کبھی تصورات کے اس ہولناک اور بھیانک صحرا میں۔ مقصد پیشِ نظر صرف گرمیٔ سخن ہو گا۔ اور اس کی خاطر اکثر و بیشتر یہی کرنا پڑے گا کہ دل کچھ محسوس کرے اور زبان کچھ کہے۔ برعکس اس کے ایک شخص ہے جس کے سامنے زندگی کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ مقصد بھی اپنا متعین کردہ نہیں بلکہ وہ ہے جسے اس قرآنِ کریم نے متعین کیا ہے جس پر اس کا ایمان ہے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے قلب و دماغ، اپنے جذبات و افکار کو اس چیز کے تابع رکھے جس پر اس کا ایمان ہے۔ وہ سوچے تو اس کی مدد سے، سمجھے تو اس کی روشنی میں، دیکھے تو اُس کے نور سے، وہ حقائق کو پرکھے تو اسی کسوٹی پر، اور قبول کرے تو اسی کو جو اس کی رُو سے قبول کئے جانے کے قابل ہو اور ردّ کرے تو اس کو جو اس کے نزدیک مردود ہو، اب اگر ایسا مردِ مومن اپنے خیالات کو (جو دراصل قرآنِ پاک ہی کے حقائق ہوں گے) زبانِ شعر سے ادا کرے تو مومنین کے اس زمرہ میں آجائے گا جس کا ذکر قرآنِ کریم نے اس آیت میں کیا ہے جو مذکورہ صدر آیت سے متصل ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ ذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ انْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ..... (۲۶/۲۲۷)

مگر وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں، اعمالِ صالحہ کرتے ہیں اور قوانینِ خداوندی کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھتے ہیں اور اپنی مدافعت اس وقت کرتے ہیں جب ان پر زیادتی کی گئی ہو۔

اقبالؒ اسی زمرہ میں شامل ہے اور علومِ حاضرہ کے متعلق فکر اور قرآن فہمی کی جن بلندیوں پر وہ پہنچ چکا تھا، ان کی رُو سے بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ عالمِ اسلام نے اس سے پہلے کبھی ایسا مفکّر پیدا نہیں کیا۔ لہٰذا، اگر یہ درست ہے کہ کسی مفکّر کے پیام میں عروسِ معنی کو بے نقاب دیکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے ان جذبات و خیالات کی تہ تک پہنچا جائے جس پر اس کی فکر کی اساس ہے اور اس سرچشمہ سے واقفیت حاصل کی جائے جو اس کے تخیلات کا ماخذ ہے تو بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ اقبالؒ کا کلام کما حقہٗ سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک قرآنِ کریم نگاہوں کے سامنے نہ ہو۔ جو اس زاویہ نگاہ سے پیغامِ اقبالؒ کو دیکھے گا وہ جہاں ایک طرف یہ محسوس کرے گا کہ قرآنِ کریم انسان کو کن بلندیوں تک لے جاتا ہے، دوسری طرف یہ بھی دیکھ لے گا کہ حضرتِ علّامہ قرآنِ کریم کے ان حقائق اور ادق مسائل کو کس خوبصورتی سے ایک شعر میں حل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے ایامِ جاہلیت میں اقبالؒ کو محض ایک "شاعر" کی حیثیت ہی سے دیکھا اور ان کے کلام سے محض "شاعری" ہی کا لطف اٹھایا تھا۔ لیکن جب یہ حقیقت سامنے آ گئی کہ کلامِ اقبالؒ کا سرچشمہ کیا ہے تو اس کے بعد ان کی شاعری کی نوعیت ہی بدل گئی اور پھر سمجھ میں آیا کہ اقبالؒ کیا کہتا ہے، کیوں کہتا ہے اور کیسے کہتا ہے۔ اور یہ راز بھی کھل گیا کہ وہ کون سی شاعری ہے جس کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اس کا اتباع راہ گم کردہ لوگ ہی کیا کرتے ہیں۔ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ (۲۶/۲۲۴) اور وہ کون سی ہے جو اس منزلِ مقصود کے لئے چراغِ راہ کا کام دیتی ہے جس کی طرف صراطِ مستقیم لے جاتا ہے۔ ایسے شاعر کے متعلق حضرت علّامہ فرماتے ہیں۔

سرچشمۂ فکرِ اقبالؒ

شاعر اندر سینۂ ملّت چو دل ملّتے بے شاعرے انبارِ گِل

سوز و مستی نقشبندِ عالمے است

شاعری بے سوز و مستی ماتمے است

شعر را مقصود اگر آدم گری است شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

بہرکیف یہ ہے وہ انداز جس سے میں نے حضرت علامہ کے کلام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے. میں نے قرآنِ کریم کو جس نوعیت سے سمجھا ہے اس کی اجمالی سی کیفیت آپ کو معارف القرآن کے ان حصّوں سے معلوم ہو گئی ہو گی جو اس وقت تک شائع ہو چکے ہیں[1]. قرآن فہمی کے اس اسلوب کی طرف میری رہنمائی کرنے میں جن گراں مایہ ہستیوں کے بارِ احسان سے میری گردنِ تشکر ہمیشہ نگوں سار رہے گی. ان میں حضرت علامہ اقبالؒ کی ذاتِ گرامی ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے. بارہا ایسا ہوا کہ میں قرآنِ کریم کے کسی مشکل مقام پر جا کر رُک گیا تو علامہ کے ایک شعر نے ذہن میں بجلی کی سی ایسی چمک پیدا کر دی جس سے صحیح راستہ فوراً نگاہ کے سامنے آ گیا. دوسری طرف ایسا بھی ہوا کہ حضرت علامہ کے کسی شعر کے متعلق اُلجھاؤ پیدا ہوا تو کسی آیتِ قرآنی نے اپنے "سمسم" کے اعجاز سے قفلِ ابہام کو کھول دیا. حقیقت یہ ہے کہ حضرت علامہ کی صحیح عظمت ہی اس میں ہے کہ انہوں نے اس دَور میں جب کہ مسلمان قرآنِ کریم سے بہت دُور جا چکے تھے، ان کے سامنے قرآنی تعلیم کو اس حسین و دلکش انداز میں پیش کیا کہ سعید روحیں اپنے بربطِ ہستی کے تاروں اور اس سازِ نغمۂ الست کے پردوں میں ایک کھوئی ہوئی ہم آہنگی یوں محسوس کرنے لگیں جیسے اِن کوہسار کی چاندنی رات میں دُور سے بنسری کی ہلکی ہلکی آواز کسی بھولے ہوئے افسانہ کی یاد تازہ کر دیتی ہے. قوم کے نوجوانوں کو مذہب سے چڑ سی ہو چکی تھی اور مذہب پرست طبقہ ان کے کھلے ہوئے الحاد اور دہریّت کی وجہ سے ان کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا. حضرت علامہ نے دین کو ایسے انداز میں پیش کیا کہ اس کی رُوح پھر سے ان کے خون کے ذرّوں میں جذب ہو گئی اور اس طرح وہ غیر محسوس طور پر قرآنِ کریم کے قریب لا کر کھڑے کر دیئے گئے. میں نے اکثر دیکھا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان جو مذہب سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہو چکا ہو لیکن کلامِ اقبالؒ سے اسے کچھ ذوق ہو اس کے سامنے اگر قرآنِ کریم کو اس کی اصلی شکل میں پیش کر دیا جائے تو وہ اسے ایک جانی پہچانی ہوئی حقیقت محسوس کرنے لگتا ہے.

---

[1] معارف القرآن کی حسبِ ذیل مجلّدات اب تک شائع ہو چکی ہیں. ابلیس و آدم، جوئے نور، برقِ طور، شعلۂ مستور، معراجِ انسانیت، جہانِ فردا، من و یزداں، کتابُ التقدیر وغیرہ.

جب حقیقت یہ ہے کہ اقبالؒ کا پورا پیام قرآنِ حکیم ہی کی تعلیم کی تفسیر ہے تو پیامِ اقبالؒ پر قرآن کریم کی روشنی میں تمام و کمال تبصرہ ناممکن ہے جب تک پورے کا پورا قرآن سامنے نہ لایا جائے۔ اس مقصدِ جلیلہ کے لئے میں نے معارف القرآن کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس وقت قرآن کی اساسی تعلیم کے ایک آدھ گوشہ پر طائرانہ سی نگاہ ڈالی جا سکے گی۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ اقبالؒ کا پیام کس طرح قرآنی حقائق کو اپنے جاذب و دلکش انداز میں پیش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نقطۂ نگاہ سے پیامِ اقبالؒ کا تجزیہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ یہ ضرورت میرے پیشِ نظر ہے اور اگر توفیقِ ایزدی نے میری یاوری کی تو معارف القرآن کی تکمیل کے بعد اس طرف بھی توجہ دوں گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی قرآن فہمی کے لئے جس قدر حضرت علامہ کی بصیرت کا رہینِ منت ہوں، اس کے سپاس گذاری کے تقاضے سے میں اپنے اوپر یہ فرض سمجھتا ہوں کہ میں اقبالؒ کے پورے پیغام کو قرآن کی روشنی میں پیش کروں، میں اللہ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس اہم فریضہ سے سبکدوش ہونے کی ہمت اور فرصت عطا فرمائے۔

اگر کوئی شخص قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم کو دو لفظوں میں بیان کرنا چاہے تو وہ نہایت اطمینان سے کہہ سکتا ہے کہ قرآنِ کریم جو پیغام نوعِ انسانی کو دیتا ہے وہ ہے لَآ اِلٰہَ — اِلَّا اللّٰہُ۔ اس کلمہ کے دو حصے ہیں۔ ایک سلبی

لَآ اِلٰہَ — اِلَّا اللّٰہُ

یعنی اس امر کا یقین، اس حقیقت کا اعتراف کہ دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں جس کے سامنے سر جھکایا جائے، جس کی غلامی اختیار کی جائے، جسے آقا تسلیم کیا جائے، جسے اپنی حاجات کا قبلۂ مقصود سمجھا جائے، جس کے قانون کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنایا جائے۔ یہ نفی کا پہلو ہے۔ تخریبی پہلو ہے۔ یعنی جو کچھ پہلے ذہن میں موجود ہے اسے مٹا دینا ہوگا، بھُلا دینا ہوگا۔ جب زمین یوں صاف ہو جائے تو پھر اس پر ایک نئی عمارت تعمیر ہوگی۔ پھر ایجابی پہلو آئے گا۔ تمام قوتوں کے انکار کے بعد اس امر کا اقرار آئے گا کہ ہاں! مگر ایک قوت ایسی ہے جس کی غلامی اختیار کرنا ضروری ہے۔ جس کے قانون کے سامنے جھکنا زیبا ہے اور جسے اللہ کہتے ہیں۔ تمام قوتوں کو راستے سے ہٹا کر یوں خدا اور بندے کا براہِ راست تعلق پیدا کر دینا یہ ہے قرآنِ کریم کی تعلیم۔ دنیا

ہیں اس تعلیم کو سب سے پہلے ایک منضبط شکل میں پیش کرنے والے حضرت خلیل اللہ تھے۔ ان کی حیات مقدسہ کا یہ اہم واقعہ سب کو معلوم ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنی قوم کے صنم کدہ میں بتوں کو پہلے توڑا اور اس کے بعد خدائے واحد کی طرف دعوت دی[1]۔ پہلا قدم لَا اِلٰہ تھا اور اس کے بعد اِلَّا اللہ۔ جب تک مکان خالی نہ ہو، نیا مکین آکر نہیں بستا۔ اس حقیقت کے متعلق حضرت علامہ فرماتے ہیں۔

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے جو پوشیدہ لَا اِلٰہ میں ہے

اسی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی تفسیر سورۂ بقرہ میں یوں آئی ہے۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶)

جو شخص ہر سرکش قوت کا انکار کر کے فقط ایک اللہ پر ایمان رکھتا ہے اس نے ایک ایسے مضبوط سررشتہ کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

اسی کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ سے ایک شخص مسلم بنتا ہے۔

بیا کہ مثلِ خلیل ایں طلسم درشکنیم ۔۔۔ کہ جز تو ہر چہ دریں دیر دیدہ ام صنم است

شرک کے متعلق بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ کسی پتھر کی مورتی کے سامنے جھک جانے کا نام ہے اور بس۔ لیکن قرآنِ کریم کی رُو سے شرک یہی نہیں بلکہ اللہ کے سوا جو طاقت بھی ہو، اس کے سامنے جھک جانے کا نام شرک ہے۔ اور یہ قوتیں وہ بت ہیں جن کی تعمیر کسی سنگ تراش کے ہاں نہیں ہوتی یہ خود ذہنِ انسانی کے کارخانے میں ڈھلتے ہیں۔ ان کا مسکن کوئی مندر نہیں ہوتا خود قلبِ انسانی ہوتا ہے۔ مال و اولاد کا بُت، عزت و جاہ کا بُت، دولت و ثروت کا بُت، حکومت و سلطنت کا بُت، ملک و نسب کا بُت۔ اور نہ معلوم کون کون سے لات و منات اور کون کون سے ہبل و عزیٰ ہیں جو ہر آن اس کے حجلۂ دماغ میں تراشتے رہتے ہیں جن کے سامنے کھڑا یہ کانپتا ہے، لرزتا ہے، گڑگڑاتا ہے، سجدے کرتا ہے، ماتھے رگڑتا ہے۔ یہ ہیں وہ بُت جن کے متعلق حضرت علامہ فرماتے ہیں۔

رہ مدہ در کعبہ اے پیرِ حرم اقبالؒ را ۔۔۔ ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے، جوئے نور۔

یہ بُت انسان کی خواہشات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں اور یہ ہے شرک کی وہ خوفناک اور بھیانک گھاٹی جہاں سے پھسل کر انسان سیدھا ہلاکت اور بربادیوں کے ہولناک جہنم میں گر جاتا ہے. قرآنِ کریم نے اسی شرک کے متعلق فرمایا ہے.

اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـہَہٗ ہَوٰىہُ وَ اَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلۡمٍ...(۴۵/۲۲)

(کیا تُو نے اس کو بھی دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو ہی اپنا معبود بنا لیا؟ یہ ہے وہ جسے خدا کے قانونِ ہدایت نے باوجود علم و عقل کے سیدھے راستے سے ہٹا دیا.

کہ علم کا تقاضا تھا کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کرتا لیکن جب جذبات عقل پر غالب آجائیں جب خواہشات دماغ پر قابو پالیں تو پھر علم و عقل کبھی صحیح راستہ کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتے. یہی وہ بُت ہیں جن کی وجہ سے انسان قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے. فرماتے ہیں.

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر
رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

ایک زنجیر سے اس کا پاؤں نکالا جاتا ہے تو یہ اُسے دوسری میں الجھا دیتا ہے. ایک کی غلامی کا طوق اس کے گلے سے اتارا جاتا ہے تو یہ دوسرے کی غلامی کا طوق پہن لیتا ہے حالانکہ جس رسولِ اکرمؐ کی امت ہونے کا یہ مدعی ہے، ان کی بعثت کا مقصد ہی ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے.

وَ یَضَعُ عَنۡہُمۡ اِصۡرَہُمۡ وَ الۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡہِمۡ ؕ(۷/۱۵۷)

وہ انسانوں کے طوق و سلاسل اتارنے کے لئے بھیجا گیا ہے. ان کے بوجھ ہلکے کرنے اور ان کے پاؤں سے زنجیریں اتروانے کے لئے.

لیکن اس کی کیفیت یہ ہے کہ:-

فکرِ انساں بُت پرستے بُت گرے ہر زماں در جستجوئے پیکرے
باز طرحِ آذری انداخت است تازہ تر پروردگارے ساخت است
کاید از خوں ریختن اندر طرب نام او رنگ است وہم ملک و نسب
بر سرِ ایں باطلِ حق پیرہن تیغِ لَا مَوۡجُوۡدَ اِلَّا ھُوَ بزن

جب تک دماغ سے ان غیر خدائی قوتوں کو نکالا نہ جائے، خدا کا صحیح تصور ذہن میں نہیں آسکتا. جب تک

لوحِ قلب صاف نہ ہو توحید کے حروف و نقوش اس پر لکھے نہیں جا سکتے۔ فرماتے ہیں۔

بری ں ہیں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے ترے دماغ میں بتخانہ ہو تو کیا کہیئے

یہی منفی اور مثبت کے دو ٹکڑے ہیں جن کے جوڑنے سے کلمۂ توحید بن سکتا ہے۔ جب تک آپ دوسرے آقاؤں

نفی اور اثبات

سے رُخ نہیں موڑ لیتے، نئے آقا کی غلامی اختیار نہیں کر سکتے جب تک اس پرانی دنیا کو ویران نہیں کیا جاتا، جہانِ نَو کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس زنگ کو اتارا نہیں جاتا تلوار پر نئی آب نہیں چڑھ سکتی۔ رموز میں ارشاد ہے۔

آتشے افروز از خاشاکِ خویش شعلۂ تعمیر کن از خاکِ خویش

اس کو برنگِ ریختہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ غارت گرِ باطل بھی تو

حق آنے سے باطل خود بخود فنا ہو جاتا ہے۔ اندھیرے کی فطرت ہی یہ ہے کہ جب چراغ آ جائے تو اندھیرا گھر چھوڑ جائے۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۝ (۱۷/۸۱)

کہیئے کہ حق آیا اور باطل غائب ہو گیا۔ باطل تو بنا ہی اس لیئے ہے کہ فنا ہو جائے۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس فروغِ حق کے لئے کرنا کیا چاہیئے۔ فرمایا۔

ہو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی تڑپ پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوّتِ پنہاں کو کر دے آشکار تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے

حضرت علامہ کے کلام میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے الفاظ کے انتخاب میں جہاں "حسنِ شعریت" ملحوظ ہوتا ہے، وہاں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہتی ہے کہ ان الفاظ کا استعمال محض برائے "وزنِ بیت" نہ ہو بلکہ غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے الفاظ بھی قرآنِ کریم کے مختلف حقائق کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اگر میں اس لحاظ سے ان کے اشعار اور اشعار کے الفاظ کی تشریح کرنے لگوں تو ظاہر ہے کہ ؏

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

ہرچند جی چاہتا ہے کہ ایسا بھی ہوتا کہ ان کے کلام کی عظمت پورے طور پر سامنے آجائے لیکن عدم گنجائش مانع ہے۔ مثال کے طور پر مذکورہ صدر اشعار کے پہلے شعر میں "صداقت کے لئے مرنے کی تڑپ" کا ذکر ہے، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ شوکتِ الفاظ شعر میں حرارت پیدا کرنے کے لئے ہے لیکن حقیقت اس سے کہیں بلند ہے۔ نبیؐ اکرمؐ کے سامنے یہود وغیرہ بہت سی حجتیں پیش کرتے۔ بحث و جدل کا تقاضا کرتے۔ لیکن قرآنِ کریم نے سچے اور جھوٹے کی پہچان کے لئے ایک اور ہی معیار پیش کر دیا اور چیلنج دے دیا کہ آؤ اس کسوٹی پر پورے اُترو۔ فرمایا۔

معیارِ صداقت | فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲/۹۴)

اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کر کے دکھاؤ۔ مرنے کی تڑپ پیدا کرو۔ یہ ہے صداقت کی پہچان۔

دیکھیے حضرت علامہ اس حقیقت کو ایک مصرع میں کس خوبصورتی سے بیان کر گئے ہیں۔ دوسرے مصرع میں "پیکرِ خاکی میں جاں" پیدا کرنے کے الفاظ آئے ہیں۔ لیکن ان کی تشریح کے لئے مجھے قرآنِ کریم کی روشنی میں پورے نظریۂ ارتقاء (THEORY OF EVOLUTION) کو بیان کرنا ہوگا اس لئے اس مقام پر اس کی تفصیل سے اجتناب کرتا ہوں[۱]۔

ہاں تو کہا یہ جا رہا تھا کہ جب لَا کی تخریب کے بعد اِلَّا کی تعمیر کی جائے، تب آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپ ایک قدم آگے بڑھے ہیں۔ دورِ حاضرہ جو یکسر اضطراب اور عدم اطمینان کا دور ہے، اپنی ہر روش پر لَا ہی کا مسلک اختیار کئے جا رہا ہے اور اس تخریب کو جہادِ زندگی سمجھ رہا ہے حالانکہ یہ محض استہلاک (DESTRUCTION)، ہے تعمیر (CONSTRUCTION) نہیں۔ مذہبی معتقدات، اخلاقی اصول، سوسائٹی کی مسلّمہ روایات سب اسی سیلابِ لَا کی نذر ہو چکے ہیں اور اس کے بعد اِلَّا کی تعمیر کہیں شروع نہیں ہوئی۔ حالانکہ تخریب سے غرض ہی ایک نئی تعمیر ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

فضائے نور میں کرتا نہ شاخ و برگ و بر پیدا　　سفر خاک کی شبستاں سے نہ کر سکتا اگر دانہ
نہادِ زندگی میں ابتدا لَا انتہا اِلَّا　　پیامِ موت ہے جب لَا ہوا اِلَّا سے بیگانہ

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے "ابلیس و آدم"۔

عصرِ حاضر کے متعلق ارشاد ہے۔

لبالب شیشۂ تہذیبِ حاضر ہے مۓ لَا سے ٭ مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ اِلَّا

روس اس لَا کے جنون میں سب سے زیادہ شدت سے گرفتار ہے۔ اشتراکیت کی بنیاد ہی نفی سے شروع ہوتی ہے۔ خدا کی نفی، کلیسا کی نفی، ملوکیت کی نفی، حکومت کی نفی۔ (یعنی کمیونزم کے انتہائی دور میں) عائلی زندگی کی نفی۔ تدریجی منازل کی نفی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض چیزوں کی نفی تھی بھی ضروری۔ لیکن محض نفی سے تو کام نہیں چل سکتا۔ نفی کے بعد اثبات کی بھی تو ضرورت تھی۔ توہمات کو چھوڑیئے تو حقائق پر ایمان لائیے۔ یہ تفریط (EXTREMISM) اسی یکسر کفر (انکار) ہی کا تو نتیجہ ہے کہ دنیا بھر میں انقلاب کے مدعی خود اپنے اصولوں میں اس قدر عجلت سے تبدیلیاں پیدا کر رہے ہیں کہ باریک بین نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ کچھ عرصے کے بعد وہ پھر وہیں پہنچ جائیں گے جہاں سے چلے تھے۔ روس کے متعلق ارشاد ہے۔

اشتراکیت کا بحرانِ نفی

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ ٭ لاسلاطیں، لاکلیسا، لَا اِلٰہ
فکرِ اُو در تندِ بادِ لَا بماند ٭ مرکبِ خود را سوئے اِلَّا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں ٭ خویش را زیں تند باد آرد بروں
در مقامِ لَا نیاساید حیات ٭ سوئے اِلَّا می خرامد کائنات
لَا و اِلَّا سازو برگِ اُمتاں ٭ نفیِ بے اثبات مرگِ اُمتاں

دو ہی صفحے پہلے ہے۔

نکتہ می گویم از مردانِ حال ٭ اُمتاں را لَا جلال اِلَّا جمال
لَا و اِلَّا احتسابِ کائنات ٭ لَا و اِلَّا فتحِ بابِ کائنات
ہر دو تقدیرِ جہاں کاف و نوں ٭ حرکت از لَا زاید از اِلَّا سکوں

اس آخری مصرع کو غور سے دیکھئے جب تک قومیں لَا کے بحران میں رہتی ہیں، عدمِ سکون و فقدانِ طمانیت کے گرداب میں چکر کھاتی ہیں کسی محکم چٹان پر ان کا قدم نہیں جمتا۔ آج ایک نظریہ قائم ہوتا ہے۔ دنیا میں شور

---

[1] روس تو اب قریب قریب پھر نظامِ سرمایہ داری تک پہنچ رہا ہے۔

مچ جاتا ہے کہ بس وہ مداوا ہاتھ آگیا جس سے تمام دنیا کے دُکھ درد دُور ہو جائیں گے۔ ابھی چار قدم بھی اس کی روشنی میں چلنے نہیں پاتے کہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جسے تریاق سمجھ رہے تھے وہ زہر ہے۔ جسے چشمۂ حیوان تصور کئے بیٹھے تھے وہ سراب ہے۔ اسے ڈھا دیا جاتا ہے اور پہلے کی طرح ایک اور فریب تیار کر لیا جاتا ہے۔ دو چار قدم اس کی روشنی میں چلتے ہیں پھر اندھیرے میں ٹاک ٹوئیاں مارنے لگ جاتے ہیں ــــ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَ اِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ (۲/۲۰) جب ذرا بجلی چمک پڑتی ہے تو اس میں دو قدم چل لیتے ہیں اور جب وہ روشنی غائب ہو جاتی ہے تو پھر کھڑے ہو کر آسمان کی طرف تکنے لگ جاتے ہیں۔ یہ ہے متذبذب زندگی کا وہ جہنم جس میں آج ساری دنیا گرفتار ہے اور یہ نتیجہ ہے اِلّا کے نہ ہونے کا۔ اس عملی شرک کا۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝ (۲۲/۳۱)

جو اللہ سے شرک کرتا ہے اس کی حالت یوں سمجھئے گویا وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آگرا۔ یا جیسے (مرغی کے چوزے کو) کوئی (عقابی پنجوں والا) پرندہ اُچک کرلے جائے۔ یا جیسے تند و تیز ہوا کے جھونکے (پرِکاہ کی طرح) اسے کسی دور دراز مقام پر پھینک دیں۔

گویا اس نظام کا مرکزِ ثقل گم ہو جاتا ہے جس میں لَا ہی لَا ہو، اِلّا نہ ہو۔ وہاں حرکت ہی حرکت ہوتی ہے۔ سکون نہیں ہوتا۔ اسے کہیں جم کر کھڑے ہونے کے لئے جگہ نہیں ملتی۔ اسی لئے فرماتے ہیں کہ

بخود خزیدہ و محکم چوں کوہساراں زی   مزی چوں خس کہ ہوا تند و شعلہ بیباک است

اس تعمیر کا سبق وہ ملّتِ اسلامیہ کے ان نوجوانوں کو دیتے ہیں جو لاعلمی کی وجہ سے اس قسم کی نفی کی طغیانیوں میں بہے چلے جا رہے ہیں۔

کہنہ را درشکن و باز بہ تعمیر خرام   ہر کہ در ورطۂ لَا ماند بہ اِلّا نرسید

اور ان مسلمانوں کو جو ہزار ہزار دانے کی تسبیح پڑھنے کے باوجود لَا اِلٰہ ــــ اِلَّا اللّٰہ کے معنی نہیں سمجھتے پھر سے یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں کہ

کافر اِدلِ آوارہ دگر بارہ بادبند   بر خویش کشادیدہ و از غیر فرو بند

دیدن دگر آموز ندیدن دگر آموز

پھر سے سیکھ کہ لَا کہاں تک جائے گا اور اِلَّا کہاں سے شروع ہوگا۔

جب تک انسان لَا کے بھنور میں رہتا ہے وہم و قیاس آرائیوں کا تختۂ مشق بنا رہتا ہے۔ اور آپ سمجھ

خدا کا دستِ قدرت

سکتے ہیں کہ اس تذبذب اور گمان میں قلبِ انسانی کس جہنم میں رہتا ہے' اطمینان و سکون یقین میں ہے اور یقین پیدا نہیں ہو سکتا جب تک اس سلبی لَا کے بعد ایجابی اِلَّا نہ آجائے۔ اس کیفیت کے متعلق فرماتے ہیں۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

مومن خدائے لم یزل کا دستِ قدرت کیسے بنتا ہے' اس کی تفسیر دیکھنی ہو تو قرآن کریم میں واقعۂ بدر دیکھئے کہتے ہیں کہ واٹرلو کی لڑائی نے یورپ کی تاریخ بدل دی۔ لیکن جن کی نگاہیں دُوررس اور دقیقہ شناس واقع ہوئی ہیں ان کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہے کہ بدر کی لڑائی نے دنیا کی تاریخ بدل ڈالی۔ اگر اس وقت خدا نکردہ مسلمان مجاہدین کی وہ مٹھی بھر جماعت جو اونٹوں کی پسلیاں اور کھجوروں کی ٹہنیاں لے کر سربکف میدان میں آگئی تھی کہیں ضائع ہو جاتی تو آج دنیا پر توہم پرستی کے گھناؤنے بادل منڈلا رہے ہوتے اور کوئی نہ جانتا کہ علم و عقل' شعور و ادراک' حکمت و فلسفہ کیا شے ہے اور کوئی نہ پہچانتا کہ انسان کی اس دنیا میں صحیح پوزیشن کیا ہے۔ آج نہ اقبال ہوتا نہ اقبال کے یہ قلب و دماغ میں چمک پیدا کرنے والے حقائق اور روح میں برقِ تپاں بن کر دوڑ جانے والے شعر۔ ہاں تو اس بدر کی لڑائی میں جب کہ تین سو بارہ بظاہر بے کس و بے بس مسلمانوں کا مقابلہ قوت اور سامان کے ہجوم کے ساتھ تھا۔ مومنین کے دست و بازو خدا کے ہاتھ بنے۔ فرمایا کہ

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ص وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ج (۸/۱۷)

تم نے ان دشمنوں کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا ہے۔ تم نے تیر اندازی نہیں کی بلکہ وہ تو اللہ نے کی ہے۔ (تلواریں تمہاری تھیں اور ان میں بجلیاں ہمارے غضب کی کوندر ہی تھیں۔ تیر تمہارے تھے اور ان کی انیوں کے ساتھ قضائیں ہماری لپٹ رہی تھیں)۔

یہ تھے وہ دست و بازو جن کے متعلق فرمایا کہ

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زورِ بازو کا　　　نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

لیکن برعکس یقین کے جو شخص مغلوبِ گماں رہتا ہے۔ جو ایمانِ محکم کی بجائے تذبذب و وساوس میں الجھا رہتا ہے۔ اس کی تمام محنتیں اکارت جاتی ہیں۔ تمام کوششیں ضائع ہوجاتی ہیں۔ تمام ساز و سامان، تمام جیوش و عساکر دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ بعینہٖ جس طرح کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گولی چلانے والا اپنا کارتوس بھی ضائع کردیتا ہے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ز (۵/۵)

جس نے ایمان و یقین سے انکار کیا تو اس کے تمام اعمال ضائع ہوگئے۔

لیکن جب اس میں ایمان پیدا ہوجاتے تو پھر انہی بازوؤں کی پرواز حدود فراموش اور انہی ہاتھوں کی قوتیں وسعت ناآشنا ہوجاتی ہیں۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کرلیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

قرآنِ کریم میں انہی لوگوں کے متعلق ہے کہ

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ (۴۱/۳۰)

یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہہ دیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس یقین پر جم کر کھڑے ہوگئے تو ان پر خدا کے فرشتے نازل ہوتے ہیں (جو انہیں بشارت دیتے ہیں کہ) مت ڈرو، بالکل نہ گھبراؤ، تمہارے لئے خوشخبری ہے اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

جب انسان میں ایمان و یقین کی یہ کیفیت پیدا ہوجاتی ہے تو پھر اس کی نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے۔ وہ ہر ایک شے کو نئے نئے انداز سے دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھ پر کسی خارجی اثر کا رنگین چشمہ نہیں ہوتا۔ گویا وہ ہر چیز کو اپنی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہاں پہنچ کر حضرت علامہ فرماتے ہیں۔

میانِ آب و گِل خلوت گزیدم　　　ز افلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزۂ چشم　　　جہاں را جز بچشمِ خود ندیدم

قرآنِ کریم نے علم کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ سمع، بصر اور قلب کی شہادت سے حاصل ہوتا ہے۔

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۳۶/۱۷)

جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ یاد رکھو سمع، بصر اور قلب ہر ایک کی بابت پرسش ہو گی۔

علم و عقل

پوچھا جائے گا کہ جس چیز کو تم نے بطور علم کے تسلیم کیا تھا اسے تم نے سماعت و بصارت کی رُو سے، تجربات و مشاہدات کے ذریعے پرکھ کر دیکھ لیا تھا کہ واقعی یقینی شے ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تمہارے قلبِ سلیم کو بھی اپیل کرتا تھا۔ اس کے برعکس، ان ذرائع سے کام نہ لینے والے کو قرآنِ کریم نے جہنمی قرار دیا ہے۔

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۚ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۚ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۚ (۱۷۹/۷)

وہ لوگ جو دل و دماغ رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے، تو یہ بالکل ڈھور ڈنگر ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ ان سے بھی زیادہ بے راہ رو۔

بیکن نے علم کے متعلق یہی نظریۂ استقراء پیش کیا اور یورپ کی کایا پلٹ دی۔ اور قرآنِ کریم نے چودہ سو برس پیشتر علم کی یہی تعریف بیان فرمائی۔ لیکن قرونِ اُولیٰ کے بعد مسلمانوں نے اسے غلاف اڑھا کر اونچے اونچے طاقوں میں نہایت ادب و تعظیم سے رکھ چھوڑا اور خود اندھوں کی طرح دوسروں کی لکڑی کے سہارے چلتے گئے کہ وہ گڑھے میں گریں تو یہ بھی ساتھ ہی جائیں۔

حضرت علامہ، علم کی اس قرآنی تعریف کے متعلق فرماتے ہیں کہ "جہاں را جز بہ چشمِ خود ندیدم"۔ اسی "چشمِ خود" کے متعلق 'ضربِ کلیم' میں ہے۔

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے	افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے
خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے	ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے	شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہنر سے
اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی	کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

یہ ہے جہان کو اپنی نظر سے دیکھنا۔ یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو پھر دیکھئے کہ آپ کی دنیا میں کیسا تحیّر انگیز انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ نگاہ کے بدل جانے سے ہر شے کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ دنیا کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ اشیاء کی قیمتیں بدل جاتی ہیں اور قرآنِ کریم کے الفاظ میں یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ۔ یہ زمین بدل جاتی ہے، یہ آسمان بدل جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

بخود نگر، گلہ ہائے جہاں چہ گوئی
اگر نگاہِ تو دیگر شود جہاں دگر است

جاوید نامہ میں ہے۔

تبدیلیٔ نگاہ

ایکہ منزل را نمی دانی زرہ
قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگہ
نوعِ دیگر بیں، جہاں دیگر شود
ایں زمین و آسماں دیگر شود

یہی وہ نگاہیں ہیں جن سے قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں اور یہی وہ نگاہیں ہیں جو بدبختی سے ہماری قوم کے نوجوانوں سے چھن چکی ہیں۔ جنہیں وہ بزعمِ خویش اپنی نگاہیں سمجھتے ہیں وہ اپنی نہیں ہوتیں دوسروں سے مستعار لی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہی وہ متاعِ گراں بہا ہے جس کے چھن جانے پر ہر رونے والی آنکھ روتی ہے اور ہر تڑپنے والا دل تڑپتا ہے۔ یہی نوجوانوں کی "بے بصری" اقبالؒ کو بھی لہو رلاتی ہے اور اس نے اپنے قلب و دماغ کے بہترین جوہر اسی جہاد میں صرف کر ڈالے ہیں کہ کہیں سے یہ فردوسِ گم گشتہ پھر نوجوانوں کو مل جائے۔

لیکن مومن کی یہ "چشمِ خویش" یہ اپنی آنکھ اس وقت اپنی بنتی ہے جب یہ قرآنِ کریم کی روشنی میں اس آنکھ سے کام لے کہ جس طرح آنکھ بیرونی روشنی کے بغیر بیکار ہے، دیدۂ عقل قرآنِ کریم کے نورِ مبین کے بغیر بالکل کور ہے۔ اس کے متعلق نبیِّ اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔ یہ خدا کا نور قرآنِ کریم ہے۔ ایک مردِ مومن دنیا کی ہر شے کو قرآنِ کریم کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ اس کے

قرآن کی روشنی

افکار و آراء اس کے تابع چلتے ہیں۔ اس کا علم و فلسفہ اس کی پیروی کرتا ہے۔ یہ ہے فرق ایک مومن اور غیر مومن حکیم میں۔ غیر مومن یا تو تنہا اپنی عقل کے زور پر چلتا ہے اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے یا دوسرے انسانوں کے پیچھے پیچھے قدم بقدم چلتا ہے کہ اگر وہ جہنم کا راستہ اختیار کئے ہیں تو یہ بھی وہیں پہنچے گا۔ برعکس اس کے ایک حکیم مومن اپنی عقل و خرد سے قرآنِ کریم کی روشنی میں کام لیتا ہے اور چونکہ وہ روشنی خدائے علیم و خبیر کی عطا فرمودہ ہے اس لئے وہ اشیاء کی حقیقتوں کو بے نقاب کر دیتی ہے اور انسان پھر کبھی لغزش نہیں کھاتا۔ یہ ہے وہ حصہ اوّل جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور جس سے

محروم رہنے کی وجہ سے آج دنیا جہنم زار بن رہی ہے اور یہ حصّہ الاؔ یہ خدا کے غیر متبدّل قوانین، یہ فطرت کے اٹل حقائق، سوائے قرآنِ کریم کے دنیا میں آج کہیں نہیں ہیں. چونکہ حضرت علامہ کو معلوم ہو چکا ہے کہ قرآنِ کریم انسانوں کو کس قسم کی بصیرت عطا کرتا ہے، یہ نگاہوں کو کس اوج تک پہنچا دیتا ہے، یہ قلبِ انسانی میں کیا کیا انقلاب پیدا کر دیتا ہے. یہ کس طرح اس کی ساری دنیا بدل دیتا ہے. اس لئے جہاں کہیں وہ قرآنِ کریم کا ذکر کرتے ہیں، وجدِ مسرت سے جھُوم اُٹھتے ہیں. ان کے ایک ایک لفظ سے قرآنِ کریم سے عشق و محبت کی چاشنی ٹپکتی ہے. وہ خود بھی اس میں جذب ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی جذب کر لیتے ہیں۔

رموز میں فرماتے ہیں.

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست	زیرِ گردوں سرِ تمکینِ تو چیست
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم	حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات	بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ او را ریب نے تبدیل نے	آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
نوعِ انساں را پیامِ آخریں	حاملِ او رحمۃ للعالمیں

اور سنئے.

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است	ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں مسلماناں اگر داری نظر	در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست	عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست	ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش	می دہد قرآں جہانے دیگرش

دو چیزیں قابلِ غور ہیں. ایک تو "ضمیرِ خویش" اور دوسرے "عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست"۔ اس "عصرہا پیچیدہ" کی خوبصورتی دیکھنے سے علاقہ رکھتی ہے. قرآنِ کریم کی آیات کو کھولتے جائیے، جہاں اندر جہاں زمانہ در زمانہ، ان کے اندر لپٹا ہوا ملے گا. قرآن کتابِ فطرت ہے یعنی جس طرح فطرت کی کوئی شے ایسی نہیں جو کسی زمانے میں بھی جا کر یہ کہہ دے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی، اسی طرح قرآن بھی یہ کبھی نہیں کہے گا کہ بس اب

قرآن اور رموزِ کائنات

میں تھک گیا. جو کچھ میرے اندر تھا سب باہر آچکا. اب میں خالی برتن ہوں. اب کسی اور رہبر کی تلاش کرو. قطعاً نہیں. فطرت کی کسی چیز کو لیجئے. مثلاً پانی. آدم کے وقت لوگ اتنا ہی جانتے ہوں گے کہ اس سے پیاس بجھائی جاتی ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس سے نہایا بھی جاتا ہے. لیکن اس پانی کے اندر چھپی ہوئی خصوصیات زمانہ کی عقل و علم، تجربہ و مشاہدہ، وسعت و بلندی کے ساتھ ساتھ یوں کھلتی گئیں جیسے وہ اس کی لہروں کے پیچ میں لپٹی ہوئی تھیں. آج دیکھئے، اسی پانی سے کس قدر کام لئے جا رہے ہیں. کیا آدم کے وقت کے پانی میں یہ خصائص موجود نہ تھے! یا کیا دنیا آج یہ کہہ سکتی ہے کہ پانی میں جو کچھ تھا سب معلوم کر لیا گیا ہے. دنیا اپنے تجربات کی جن بلندیوں تک چاہے اڑتی چلی جائے، فطرت کی اشیاء ان کا ساتھ دیتی جائیں گی. اسی فضا کو دیکھئے جو کل تک خالی سمجھی جاتی تھی، آج اس میں ایتھر کی امواج نے کیا کچھ کر دکھایا ہے. کیا ایتھر پہلے موجود نہ تھا! کیوں نہ تھا. اسی فضا میں لپٹا ہوا تھا، پیچیدہ تھا. یہی قرآنِ کریم کی کیفیت ہے. زمانہ عقل و علم کی جن پہنائیوں تک چاہے بلند ہوتا چلا جائے، قرآن اس سے بھی آگے نظر آئے گا. جو بات آج سمجھ میں نہیں آسکتی اسے کل کی آنے والی نسلیں، جو اگر تجربات و مشاہدات میں موجودہ نسل سے آگے ہوں گی، خود بخود سمجھ جائیں گی. اسی طرح قرآنِ کریم کی ایک ایک آیت حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آتی جائے گی. اس وقت اس کی کوئی آیت متشابہ نہیں رہے گی. سب محکم ہو جائیں گی. یہ میں نہیں کہتا. خود قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ:

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ (۴۱/۵۳)

ہم ان کو اپنی نشانیاں اس نظامِ کائنات میں اور خود نفسِ انسانی کے اندر دکھاتے جائینگے یہاں تک کہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن فی الواقعہ حق ہے.

انسانوں کی صحیح پوزیشن

اس نظامِ کائنات میں انسان کی صحیح پوزیشن کیا ہے، اسے سب سے پہلے قرآنِ کریم ہی نے متعین کیا. یہ اعلان آپ کو قرآن ہی میں ملے گا کہ

وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ (۴۵/۱۳)

جو کچھ زمین اور آسمانوں کے اندر ہے. جو کچھ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہے،

اس نے ان سب کو تمہارے لئے تابع فرمان کر رکھا ہے۔

یہ تو اس کائنات سے متعلق ہے لیکن قرآن کریم تو اس سے بھی آگے جاتا ہے (اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا)۔ قرآن کریم کوئی علم الحیات (BIOLOGY) کی کتاب نہیں کہ اس میں ان امور کی ریسرچ دے رکھی ہو۔ بایں ہمہ، جہاں کہیں ضمناً تخلیقِ انسانی کا ذکر اس میں آگیا ہے، جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ وہی ہے جس پر انسان اپنے کمالِ تحقیق کے بعد پہنچے گا۔ یہی حالت دیگر علومِ سائنس کے متعلق ہے۔ قرآن میں تبعاً اور ضمناً جہاں جہاں ان کا ذکر آگیا ہے وہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ انسانی انکشافات جس نتیجہ پر پہنچیں قرآن اس کے خلاف ہو، بشرطیکہ وہ انکشاف حقیقت کی حد تک پہنچ چکا ہو۔ محض قیاس آرائی نہ ہو۔ انسانی انکشاف ہے کیا۔ یہی ناکہ فطرت کی ایک حقیقت پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ نظروں سے اوجھل تھی۔ انسانی کدوکاوش نے وہ پردہ اٹھا دیا۔ وہ حقیقت جیسی تھی سامنے آگئی۔ اسی کو انکشاف کہتے ہیں۔ ایتھر اس فضا میں موجود تھا۔ بجلی کی لہریں یہیں تڑپ رہی تھیں۔ لیکن پہلے وہ نگاہ سے اوجھل تھیں۔ اب بے نقاب ہو کر سامنے آگئیں۔ لیکن خدا وہ ہے جس نے ان تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ اگر یہ چھپی ہوئی ہوتی ہیں تو انسانوں کی نگاہوں سے چھپی ہوئی ہیں۔ خدا کی نگاہوں سے چھپی ہوئی نہیں ہوتیں۔ اس لئے جہاں کہیں خدا ان کا ذکر کرے گا وہ تو ایسے ہی کرے گا جیسے کوئی اس چیز کی بابت کہے جو اس کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب موجود ہو۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ انسانی انکشافات کے نتائج اور قرآنِ کریم کا بیان باہم متضاد ہوں۔ جہاں کہیں تضاد ہو، سمجھ لیجئے کہ انسانی تحقیق میں ابھی غلطی ہے جسے وہ حقیقت سمجھ رہا ہے، قیاس آرائی ہے۔ جب حقیقت، حقیقت ہو کر سامنے آجائے گی تو وہ وہی ہوگی جو اس حقیقت کے پیدا کرنے والے نے اپنی کتاب میں بیان فرمائی ہے۔ اسی نظریۂ ارتقاء کو لیجئے جسے دورِ حاضرہ کے انکشافات میں ایک معرکۃ الآراء کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اس نظریہ میں جو چیزیں بطور حقیقت کے معلوم ہو چکی ہیں جن کا ذکر قرآنِ کریم میں موجود ہے اور جن کی روشنی میں اسلامی مفکرین مثلاً فارابی اور ابنِ مسکویہ نے ویلیس اور ڈارون سے کہیں پہلے ان نظریوں کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ (نظریۂ ارتقاء اور قرآنِ کریم ایک جداگانہ مبحث ہے جسے میں نے اپنی کتاب "ابلیس و آدم" میں وضاحت سے بیان کیا ہے)۔ لیکن یورپ کے حکماء اس نظریہ کے

ماتحت انسان کی سابقہ کڑیوں کی تحقیقات کے بعد مطمئن ہوجاتے ہیں اور انسان کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھتے ہیں کہ اس کی موت کے ساتھ یہ سلسلۂ ارتقاء بھی ختم ہوجاتا ہے لیکن قرآنِ کریم اس حصۂ زندگی کو محض ابتدا

انسان اور سلسلہ ارتقاء

قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ منزل تو ابھی شروع ہوئی ہے۔ انسان کی موت اس سلسلۂ ارتقاء کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک اگلی کڑی کی ابتداء ہے۔ آپ دیکھئے کہ سلسلۂ ارتقاء میں جمادات سے نباتات اور نباتات سے حیوانات تک آتے آتے ایک نمایاں تبدیلی آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگلی منزل میں بمقابلہ پچھلی منزل کے ایک ایسی کیفیت پائی جاتی ہے جو مجرّد مادہ میں موجود نہ تھی۔ مادہ غیر شعوری شے ہے اس میں تعقل و ادراک نہیں لیکن مٹی سے درخت اور درخت سے حیوان کی تدریجی ترقی میں یہ کیفیت نظر آئے گی کہ جو چیز پہلی کڑی میں مفقود تھی، اگلی کڑیوں میں پیدا ہوتی چلی جارہی ہے۔ حیوانات میں ایک خفیف سی حد تک عقل و شعور آجاتا ہے اور اس سے اگلی منزل یعنی انسان میں یہ خصوصیت ابھر کر سطح پر آجاتی ہے۔ یعنی اس میں شعور و ادراک، جذبات و احساسات پیدا ہوجاتے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو مادہ میں موجود نہ تھی۔ گویا سلسلۂ ارتقاء کی ہر کڑی میں "مادیت" سے کسی "غیر مادیت" کی طرف قدم اُٹھتا ہے۔ وہ "خاکی" سے کچھ "نوری" سا ہوجاتا ہے۔ ہرچند یہ غیر مادی عنصر (اسے ایسا ہی کہنا چاہیئے کیونکہ اور کوئی لفظ اس مفہوم کو ادا نہیں کرسکتا) انسان میں آکر نمایاں ہوگیا ہے لیکن بایں ہمہ یہ عنصر ابھی اپنے عہدِ طفولیت میں ہے۔ لہٰذا یہ نہیں ہوسکتا کہ یہ سلسلہ یہیں ختم ہوجائے۔ اس کا آگے بڑھنا ضروری ہے اور یہی آگے بڑھنے کی منزلیں ہیں جہاں جاکر یورپ کے حکماء اور مسلم حکیم میں فرق شروع ہوجاتا ہے۔ حکیمِ مومن کے نزدیک حیات ایک مسلسل شے ہے اور موت اس کا خاتمہ نہیں کردیتی بلکہ شبِ تیرہ و تار کے بعد ایک نیا دن طلوع کرتی ہے۔ مادی عنصر میں تو تاریکی ہی تاریکی ہے۔ یہ عقل و خرد، یہ شعور و ادراک کی چمک تو مادہ سے آگے بڑھنے میں ہی پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ سلسلۂ ارتقاء جتنا آگے بڑھتا جائے گا تیرگی درخشندگی میں تبدیل ہوتی جائے گی۔ وہ لوگ جن کے اس منزل میں اعمالِ صالح ہوں گے۔ یعنی ایسے کام جو اس میں یہ صلاحیت پیدا کردیں کہ وہ اس سے اگلی زندگی، اس سے نفیس و لطیف، اس سے اعلیٰ و ارفع زندگی بسر کرسکے وہ اپنے اوپر کی منزل میں چلے جائیں گے جسے جنت کہتے ہیں جن کے

اعمال انہیں اصلح نہیں بنائیں گے وہ سلسلۂ ارتقاء کی اگلی منزل میں نہیں پہنچ سکیں گے۔ وہیں روک دیئے جائیں گے۔ یہ جہنم کی زندگی ہوگی۔ لہٰذا" موجودہ زندگی تو انسانی خمیر کے آب و گل کی زندگی ہے۔ ذرا اسے سنور لینے دیجئے۔ پھر دیکھئے یہ کیا بنتا ہے۔" انسان کا مستقبل" یہ ہے وہ موضوع جو حضرت علامہ کے تمام کلام کا گویا نقطۂ ماسکہ ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے   یکے در معنیٔ آدم نگر از من چہ می پرسی
کہ یزداں را دل از تاثیر او پرخوں شود روزے   چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے

اس نظام کائنات میں انسان کا درجہ کس قدر بلند ہے اس کے لئے اس داستانِ حقیقت کشا کو دیکھئے جو تخلیقِ آدم کے باب میں پہلے ہی پارہ میں تمثیلاً بیان کی گئی ہے۔ اس تمثیلی داستان میں آدم سے مراد کوئی خاص فرد نہیں۔ اس سے خود" آدمی" مراد ہے۔ یعنی وہ داستان خود آدمی کی داستان ہے جسے اس قصہ کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ آدم گویا نوعِ انسان کا نمائندہ ہے۔ فرشتوں سے کہا جاتا ہے کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔ میں دنیا میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ یعنی ایک ایسی صاحبِ اقتدار مخلوق جو زمین پر سابقہ مخلوق کی جانشین ہوگی۔ فرشتوں کی معصوم نگاہیں جب اس ہیولیٔ آب و گل کو دیکھتی ہیں تو اس میں خون کے چھینٹے اور آگ کی چنگاریاں نظر آتی ہیں۔ عرض کرتے ہیں۔ بارِ الٰہ! یہ فتنہ سامانیوں کا مجموعہ اور خلیفہ فی الارض! اس اعزاز کے مستحق تو کچھ ہم ہی نظر آتے ہیں کہ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ۔ ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہیں اور اپنے اختیار و ارادہ

قصۂ آدم

سے کام لئے بغیر وہی کچھ کرتے ہیں جس کا حکم دیا جاتا ہے۔ خلاقِ فطرت کے چہرے پر ایک حسین تبسم نے گلفشانی کی اور فرمایا کہ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ میں جانتا ہوں یہ مضمون مکمل ہو کر کیا بننے والا ہے اور تم کیا ہو۔ لیکن اتنا کہہ کر فرشتوں کو خاموش نہیں کر دیا گیا بلکہ اس کے ثبوت میں عظمتِ آدم کی ایک جھلک بھی دکھا دی اسے علم الاشیاء یعنی علم الفطرت عطا کیا گیا ہے اور فرشتوں سے پوچھا کہ تم بھی اس کی نسبت کچھ جانتے ہو۔ انہوں نے گردنیں جھکا دیں اور عرض کیا۔ نہ حضور! لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا۔ ہمیں تو اتنا ہی پتا ہے جتنا ہمیں سکھایا گیا ہے۔ فرمایا کہ اب بتاؤ کہ یہ ہمارے رازوں کا امین! یہ عظمتوں کا پتلا، اس قابل ہے یا نہیں کہ تم اس کے سامنے جھک جاؤ۔ اب سوائے اعترافِ حقیقت کے چارہ کیا تھا۔ وہ

جھکے اور بار بار جھکے۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ

کجا نورے کہ غیر از قاصدی چیزے نمی داند کجا خاکے کہ در آغوشش دارد آسمانے را

بالِ جبریل میں ہے۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

ذرا غور کیجئے اس فلسفہ پر فطرت کی ہر شے اس غرض سے پیدا کی گئی ہے کہ انسان اس سے کچھ کام لے یا وہ انسان کی کچھ خدمت بجالائے۔ ان اشیاء کا وجود انسان کی زندگی اور زندگی کی ضروریات کے لئے ہے۔ ہوا نہ رہے تو انسان بھی نہ رہے۔ پانی نہ رہے تو انسان نہ رہے۔ لیکن اگر روئے زمین پر کوئی انسان باقی نہ رہے تو بھی سلسلۂ کائنات اسی طرح جاری رہے گا۔ اس میں کوئی نقص واقع نہیں ہوگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کا وجود اس نظامِ کائنات کے لئے نہیں۔ اس کی تخلیق سے یہ غرض نہیں کہ یہ اسی دنیا کا ہو کر رہ جائے۔ دنیا اس کی خاطر ہے۔ یہ دنیا کی خاطر نہیں۔ یہ اس سے کسی بلند و بالا مقصد کے لئے پیدا کیا گیا اور یہی چیز اسے نظامِ کائنات سے ممتاز کر دیتی ہے۔ لیکن یہ شرفِ اجتباء، یہ امتیاز و خصوصیت محض ایک انسان کے گھر میں پیدا ہو جانے سے ہی نہیں حاصل ہو جاتی۔ اس کے لئے ایک "یقینِ کامل" اور "عمل پیہم" کی ضرورت ہے۔ جب کسی قوم میں یہ باتیں پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ "خیرِ امت" بن جاتی ہے۔ اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس خیرِ امت کا مقام کس قدر بلند ہوگا۔ اس جماعت کے بھولے ہوئے فرد سے خطاب کر کے فرماتے ہیں۔

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

یہی وہ ہیں جن کے متعلق ارشاد ہے کہ

وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (۳/۱۳۹)

مت گھبراؤ، مت خوف کھاؤ، تم دنیا میں سب سے بلند ہو بشرطیکہ تم مومن بن جاؤ۔

دوسری جگہ کہتے ہیں۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

مکاں فانی مکیں آنی، ازل تیرا ابد تیرا — خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی — جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (۲/۱۴۳)

اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بہترین قوم بنایا کہ تم تمام نوعِ انسانی کے (اعمال کے) نگران رہو اور تمہارے (اعمال کے) نگران رسول ہوں۔

مسلم کی تو شان یہ ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کے اعمال کا جائزہ لیتا رہے کہ کون ٹھیک کام کر رہا ہے اور کون راستے سے بھٹک گیا ہے۔ اسے تمام اقوامِ عالم کا نگرانِ کار (SUPERVISOR) بنا کر بھیجا گیا ہے اور مرکزِ ملت اس کے اعمال کا نگران۔ جب مومن کے علو مرتبت کی یہ شان ہو تو پھر دنیاوی حکومت و ثروت اس کے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہے۔ یہ تو بنی ہی اس کے لئے ہے۔ یہ تو اس کی وراثت ہے کسی اور کے پاس جا ہی نہیں سکتی۔

مقامِ مومن

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث — مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

اس فقط کو دیکھئے۔ کسی اور کا اس میں حصہ نہیں۔ یہ بطورِ حق کے اس پر قابض ہوگا کوئی اور اسے اس سے چھین نہیں سکتا۔ یہ خدا کا فیصلہ ہے اور کس قدر سچا فیصلہ!

وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِى الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِىَ الصّٰلِحُوْنَ ۝ (۲۱/۱۰۵)۔

اور یقیناً ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا تھا کہ بے شک زمین ہمارے صالح بندوں کی میراث ہے۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث — مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

اور یہ اس لئے کہ مومن کی برابری دنیا میں کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ تو اعلون ہے سب سے بلند و بالاتر۔

مومنے بالاترے ہر بالاترے — غیرتِ اُو بر نتابد ہمسرے

یہ تو تھا اس دنیا کے متعلق۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ قرآنِ کریم کے نزدیک یہ زندگی تو

حیاتِ انسانی کا اوّلین گہوارہ ہے۔ عہدِ طفولیت ہے۔ اس نے ابھی جوان ہونا ہے۔ اس لئے قرآن کریم کے نزدیک یہ زندگی بایں ہمہ رعنائی و زیبائی اصل معنوں میں زندگی کہلانے کی مستحق ہی نہیں۔ "زندگی" تو اس کے بعد آنے والی ہے۔

تسلسلِ حیات

وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ ۭ وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ (۲۹/۶۴)

یہ زندگی تو محض کھیلنے کودنے کی زندگی ہے۔ بچپن کا زمانہ ہے۔ زندگی تو درحقیقت اس کے بعد کی منزل ہے۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ بتایا جائے کہ زندگی ایک مسلسل شے کا نام ہے۔ جہاں کوئی شے رُک جائے وہ اس کی موت ہوتی ہے۔

زندگانی از خرامِ پیہم است ‫ ‫ برگ و سازِ ہستی موج از رم است

موجودہ دورِ حیات کے لہو و لعب ہونے کے متعلق ارشاد ہے۔

زمیں خاک در میخانۂ ما ‫ ‫ فلک یک گردشِ پیمانۂ ما

حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است ‫ ‫ جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

ذرا اس "خاکِ در میخانہ" اور "گردشِ یک پیمانہ" کے ٹکڑوں کو دیکھئے اور پھر سامنے لایئے آیتِ مذکورہ کے اس حصہ کو کہ "وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ" اور اس "دیباچۂ افسانۂ ما" کے ساتھ وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ کو۔ یہ موجودہ زندگی تو محض دیباچہ ہے۔ اصل کتاب ابھی شروع ہونے والی ہے۔

ہر چند بات لمبی ہو رہی ہے لیکن جی نہیں چاہتا ہے کہ ایک چیز سامنے آجائے اور اسے یوں ہی چھوڑ کر آگے گزر جائیں۔ "حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است" کے لئے مجھے نظریۂ ارتقاء بیان کرنا چاہیئے۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، یہ ایک الگ موضوع ہے جس کا ضمناً بیان کرنا دشوار ہے۔ یہاں صرف حضرت علامہ کے اس مصرعہ کے متعلق کچھ اشارات ضروری ہیں۔ قرآنِ کریم میں ارتقاء کے ضمن میں یہ بیان ہوا

---

[1] دنیا اور آخرت کی قرآنی اصطلاحات کے مفہوم کے لئے "اسبابِ زوالِ امّت" دیکھئے۔

ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک تدبیر (PLAN) کرتا ہے۔ پھر اس تدبیر کو پختگی کی حد تک پہنچانے کے لئے اسے مختلف مراحل طے کراتا ہے۔ قطرہ کو گہر ہونے تک گوناگوں مقامات میں سے گزرنا ہوتا ہے۔ ایک ایک مقام اور ایک ایک منزل کا نام یوم ہے۔ لیکن یہ ایام ہمارے گردشِ لیل و نہار کے ایام نہیں بلکہ ان کا طول ہمارے حساب سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔

سلسلہ ارتقاء

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ٥ (۳۲/۵)

وہ آسمان سے زمین کی طرف تدبیر امور کرتا ہے پھر وہ امر (پختگی اختیار کرکے) اس کی طرف بلند ہوتا ہے ایک دن میں جس کی مقدار انسانوں کے اعداد و شمار کے لحاظ سے ہزار سال ہوسکتی ہے۔

دوسری جگہ ہے کہ بعض ایام پچاس پچاس ہزار سال کے بھی ہوتے ہیں۔ اسی کرۂ ارض کو دیکھئے۔ یہ اپنے اوّلین ہیولیٰ سے الگ ہونے کے بعد (جس کا ذکر قرآنِ کریم میں موجود ہے) کتنے عرصہ دراز میں اس قابل ہوئی ہوگی کہ اس پر کوئی ذی روح آباد ہوسکے۔ اسی طرح انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کتنی منازل طے کرنی ہوں گی اور اس میں کتنا وقت صرف ہوگا۔ اب پھر دیکھئے کہ

حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است

کس قدر سچی حقیقت ہے اور کس قدر لطیف پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ اس کو دوسری جگہ ذرا زیادہ شوخی سے لکھتے ہیں کہ

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

ہاں تو کہنا یہ تھا کہ موت زندگی کو ختم کرنے والی شے نہیں بلکہ یہ تو ایک نئی زندگی کا دروازہ ہے۔

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است
زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است

اسی عنوان پر دو ایک شعر اور بھی دیکھتے جائیے۔ کبھی شعروں کو دیکھئے اور کبھی اپنے قلب و دماغ کو کہ ایک ہی ثانیہ میں ان اشعار نے انہیں علم و ادراک کی کن بلندیوں اور کیف و نشاط کی کن جنتوں میں پہنچا دیا۔ ایسے شعر کہہ دینا درحقیقت فیضان ہے اس کتابِ مبین کی ضیا پاشیوں کا جس کا دعوٰے ہے کہ آؤ تمام نوعِ انسانی مل کر اس کی ایک سورت کی مثل پیش کرکے دکھاؤ۔ ایسے شجرِ طیب کے برگ و بار بھی ایسے ہی ہونے چاہئیں۔ فرماتے

ہیں۔

خاکِ ناچیز و کہ سازد آسمانے دیگرے   ذرّۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر

پیامِ مشرق کے دو شعر ہیں۔

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود   ایں مئے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود

شعلہ بودیم و شکستیم و شرر گردیدیم   صاحبِ ذوق و تمنّا و نظر گردیدیم

اس آخری شعر کو ملاحظہ فرمائیے۔ شعلہ کی شکست اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ خاکستر بن کر رہ جائے بلکہ اس لئے کہ اس میں پہلے سے بھی زیادہ تڑپ، چمک، حرارت پیدا ہو جاتے۔ انسانی ہیولیٰ میں ہر چند "نورانیت" کا عنصر موجود ہے لیکن ابھی "مادّیت" کا عنصر زیادہ غالب ہے اس لئے حقائقِ اشیاء پر ظلمتوں کے پردے پڑے رہتے ہیں۔ اس ہیولیٰ کی شکست اس لئے ہوگی کہ اس کے بعد شعلہ کی حرارتیں سمٹ کر شرر بن جائیں اور وہ اس آتشدانِ خاکی سے اُڑ کر فضائے نور کی ان وسعتوں میں جا پہنچے جن کے لئے لاشرقیہ ولاغربیہ آیا ہے۔ جو زمان و مکان (TIME AND SPACE) کے موجودہ تصوّرات کے دائرہ سے باہر ہیں۔ یعنی ادھر سکراتِ موت کی ہچکی آنکھ بند کرے اور اُدھر نورانی ملائکہ استقبال کے لئے آجائیں کہ دیدہ و دل فرشِ راہ! یہ نورانی وادیاں، یہ دل و نگاہ کو سکون و اطمینان کی ٹھنڈک پہنچانے والی حسین جنّتیں آپ کے انتظار میں ہیں۔

اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیْنَ ۙ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۶/۳۲)

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ملائکہ نہایت آسودگی کی حالت میں وفات دیتے ہیں، یہ کہتے ہوئے کہ تم پر سلامتی و رحمت ہو۔ آیئے جنّت میں داخل ہو جایئے بوجہ ان اعمال کے جو تم نے کئے ہیں۔

اس آیت کو سامنے رکھئے اور پھر اس شعر کو پڑھئے کہ

شعلہ بودیم و شکستیم و شرر گردیدیم   صاحبِ ذوق و تمنّا و نظر گردیدیم

پھر جنّت کے متعلق جو اس آیت میں اور دیگر متعدد آیات میں آیا ہے کہ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ یعنی جنّت اعمال کی جزا ہے۔ اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ　　تا جزائے عملِ تُست جناں چیزے ہست

زندگی کے تسلسل کے متعلق غزل کا ایک شعر سنیئے اور دیکھئے کہ غزل کی رنگینی باقی رکھتے ہوئے بھی حقائق کیسے بیان کئے جاسکتے ہیں. فرماتے ہیں.

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے　　جو اب مشکل ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

اس غزل کا دوسرا شعر ہے.

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں　　کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

اس شعر میں انسان (آدم) کے ہبوط وصعود کی حقیقت کس قدر دلآویز پیرایہ میں بیان کی گئی ہے. تخلیقِ آدم کا قصہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں. اس کے بعد ہبوطِ آدم کا ذکر ہے. ہبوط کے معنی نیچے گرنے کے ہیں. آدم کے جنت سے نکلنے کے لئے قرآنِ کریم نے خروج (نکلنا) کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ ہبود (نیچے گرنے) کا لفظ استعمال کیا ہے. اس ہبوط کی رعایت سے آدم کو ٹوٹا ہوا تارا کہنا کس قدر موزوں ہے. آدم نے اپنے ہبوط کا جو اثر بیان کیا ہے وہ یہ تھا کہ اے بارِ الٰہا! اگر ہماری توبہ قبول نہ ہوئی، اگر ہمیں اپنی حالت میں نہ پہنچایا گیا تو لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے. اس ہبوط کے بعد ان تمام ارتقائی منازل طے کرکے پھر ایسا عروج حاصل کرنا کہ تارا مہِ کامل بن جائے. اس کی عظمتیں اور رفعتیں پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جائیں. یہ ہے وہ راز جو ملائکہ کی نگاہوں سے اوجھل تھا. قرآنِ کریم میں ہے.

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ (۹۵/۴-۶)

بے شک ہم نے انسان کو بہترین ہیئت میں پیدا کیا. پھر اسے (اس کے اعمال کی بدولت) نچلے درجہ میں لوٹا دیا مگر سوائے ان کے جنہوں نے ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ کئے. پس ان کے لئے غیر منقطع اجر ہے.

انسان میں ایمان وعملِ صالح پیدا ہوتے دیکھئے، پھر دیکھئے کہ یہ شہباز کن بلندیوں پر اڑتا ہے ایسی فضاؤں میں جو حدود دنا آشنا ہیں (غیر ممنون) اسی پرواز کی پہلی منزل ہے جس کے متعلق فرماتے ہیں.

برخیز کہ آدم را ہنگامِ نمود آمد　　ایں مشتِ خاکے را انجم بسجود آمد

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، یہی فرق ہے یورپ کے نظریۂ ارتقاء اور ایک مسلم کے نظریۂ عروج میں۔ یورپ کا مادہ پرست، انسان کی پرواز اس دنیا یا زیادہ سے زیادہ کسی قریبی ستارے مثلاً مریخ وغیرہ تک سمجھتا ہے اور وہ بھی محض جسمانی پرواز۔ لیکن قرآنِ کریم انسان کو بہت اونچا لے جاتا ہے کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ۔ ایسے مبارک درخت کی طرح جس کی جڑیں مضبوط ہوں اور جس کی شاخیں آسمان میں جھولے جھول رہی ہوں۔ اسی لئے حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن — قدم اٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

اس چیز کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں — یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

ارتقائی منازل کو "عشق کے امتحاں" کہنا خشک فلسفہ کو کس قدر شیریں بنا دیتا ہے۔ دوسرے شعر میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ یہ بلندیوں کی فضائیں جنہیں قرآنی اصطلاح میں سمٰوٰت کہا جاتا ہے آبادی سے خالی نہیں۔ قرآنِ کریم میں ہے۔

ستاروں کی دُنیا

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ (۴۲/۲۹)

اللہ کی نشانیوں میں سے یہ (بھی) ہے کہ اس نے زمین و آسمان، پستیوں اور بلندیوں کو پیدا کیا اور ان دونوں میں جو جاندار پھیلا دیئے، وہ بھی۔

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں ان آباد فضاؤں کو کارواں کہا گیا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ اور ہم نے تمہارے اوپر متعدد رہگذر بنائے۔ یہ رہگذر کاروانوں ہی کے لئے تو ہیں۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کارواں در کارواں، ہجوم کون کونسی ارتقائی منازل طے کرتے

پھر رہے ہیں اور عشق کی کون کون سی وادیوں میں سرگرداں ہیں۔ پھر چونکہ یہ تمام آبادیاں ایک جوئے رواں کی طرح ہر وقت مصروفِ خرام ہیں۔ قطعِ منازل کر رہی ہیں، اس لئے ان کو کارواں کہنا کیسا حسین انداز ہے۔

شعر کو جذبات کے اظہار کا بہترین ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ انہی جذبات سے اس میں دلکشی اور سوز و گداز پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جب شعر میں حقائق بیان کئے جائیں یا اس کا انداز مصلحانہ اور پیامی ہو جائے تو پھر اس میں بالعموم شعریت باقی نہیں رہتی۔ پھر یا تو وہ شعر اس انداز کا ہو جاتا ہے کہ ؎

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

یا اس انداز کا کہ ؎

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا لے ذوق ہے بُرا وہ ہی کہ جو تجھ کو بُرا جانتا ہے
اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے کیوں بُرا کہنے سے تو اسکے بُرا مانتا ہے

اور ایک ذوق ہی پر کیا موقوف ہے۔ بڑے بڑے اچھے شعر کہنے والے جب تبیانِ حقائق یا مصلحانہ انداز میں کچھ کہتے ہیں تو شعر بے جان ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ خصوصیت حضرت علامہ ہی کے حصہ میں آئی ہے کہ حقائق اور حقائق بھی اس درجہ دقیق بیان کئے جاتے ہیں اور شعر کے حُسن میں بھی کوئی کمی نہیں آتی۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ۔ ستاروں کی دنیا کے متعلق زبورِ عجم میں فرماتے ہیں۔

گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمنِ ماست
کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بوداست

زندگی، مسلسل خرام کا نام ہے۔ چلتے جانا، بڑھتے جانا، بڑھتے ہی چلے جانا کہ

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا حیات، ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

جسے مقام سمجھا جاتا ہے وہ مقام نہیں۔ جسے منزل کہا جاتا ہے وہ منزل نہیں۔ یوں ہی ذرا استانے، دم لینے کے لئے گھنے درختوں کا سایہ ہے۔ کارواں کے دوپہر کاٹنے کے لئے نخلستان ہے۔ وہ جنت کہ جسے بالعموم منزلِ مقصود سمجھا جاتا ہے، راستہ کی خوشگوار وادی ہے کہ جنت میں پہنچ کر بھی اہلِ جنت کی یہ کیفیت ہو گی کہ

يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ (۵۷/۱۲)

ان کا نور ان کے آگے اور ان کی دائیں طرف چلتا ہو گا۔

یہ نور، پیشانی کی روشنی، یہ سرچ لائٹ اگلی منزل کا راستہ دکھانے کے لئے ہوگی وہ راستہ جس کے متعلق ارشاد ہے کہ جنّت میں پہنچ کر بھی وَ هُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ. ان کی ایک پسندیدہ راستہ کی طرف رہنمائی کی جائے گی (۲۲/۲۴). اس لئے جنّت بھی مقام نہیں، راہ گذر ہے. وہاں سے بھی انسان کو آگے بڑھ جانا ہے۔

اگر عنانِ تو جبریل و حور می گیرند　　کرشمہ بر دلِ شاں ریز و دلبرانہ گذر

لیکن بایں ہمہ انسان "لامکاں" نہیں. ہر ایک مقام سے آگے ہی سہی لیکن مقام اس کا ضرور ہے. وہ مقام کیا ہے؟ وہ منزلِ مقصود کونسی ہے؟ یہ راز ہے جسے کھول کر بیان نہیں کیا گیا. نہ ہی اس کی آج ضرورت تھی. آج تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی کے بعد اگلی منزل کون سی ہے. سو اس کی تفصیل شرح و بسط سے قرآنِ کریم میں موجود ہے. اس منتہٰی کے متعلق تو سر دست اتنا ہی کہا گیا ہے کہ وَ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا. اس کا منتہٰی تیرے رب کی طرف ہے۔

شعلہ در گیر زد برخس و خاشاکِ من　　مرشدِ رومی کہ گفت منزلِ ما کبریاست

لیکن یہاں پہنچ کر حضرت علّامہ "واصل بالحق" ہونے کے عقیدہ کا اتباع نہیں کرتے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے انسان کے خدائے واحد کی ذات میں جذب ہو جانے کے عقیدہ کی سند نہیں ملتی. لیکن حضرت علّامہ اس عقیدہ کے اختلاف میں بھی ایک شانِ انفرادیت پیدا کر لیتے ہیں اور اسے انسان کی خودی کے محکم بالذّات ہونے کے منافی سمجھتے ہیں کہ وہ کسی کی ذات میں گم ہو جائے. ان کے نزدیک عشرتِ قطرہ دریا میں فنا ہو جانا نہیں بلکہ تہہِ دریا گہر بن کر بیٹھ جانا ہے. آپ فرماتے ہیں:-

چناں با ذاتِ حق خلوت گزینی　　ترا او بیند و او را تو بینی
بخودِ محکم گزار اندر حضورش　　مشو ناپید اندر بحرِ نورش

"ترا او بیند" تو ہر وقت کا معاملہ ہے، وہ کون سا لمحہ ہے جب خدا انسان کو نہیں دیکھتا. لیکن "اُو را تو بینی" کا مقام اس منزل سے آگے آتا ہے. موجودہ مقام میں تو ایک اولو العزم پیغمبر نے جب یہ آرزو کی کہ "رَبِّ اَرِنِيْٓ" تو جواب ملا کہ "لَنْ تَرٰىنِيْ" (تو مجھے نہیں دیکھ سکتا) لیکن اس سے اگلی منزل میں مومنین کی یہ کیفیت ہوگی کہ

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۚ ۲۳-۲۲/۷۵

بہت سے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔
اب خدا بندے کو دیکھ رہا ہے اس وقت بندہ بھی خدا کو دیکھے گا کہ

عبد و مولا در کمینِ یک دگر ہر دو بے تاب اند از ذوقِ نظر
زندگی ہر جا کہ باشد جستجو است حل نشد ایں نکتہ من صیدم کہ اوست

اگر ایک طرف انسان کی تڑپ اور تجسس کا یہ عالم ہے کہ اِلٰی رَبِّھِمْ یَنْسِلُوْنَ اپنے رب کی طرف رواں دواں جائیں گے تو دوسری طرف یہ کیفیت بھی ہمارے سامنے آئی ہے کہ وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّھَا۔ زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ وَ جَاءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا اور تیرا رب اور فرشتے قطار اندر قطار آئیں گے کہ

ہر دو بے تاب اند از ذوقِ نظر

لیکن یہ تمام مراحل طے کس طرح ہوں گے۔ یہ "محکم خودی" حاصل کیسے ہوگی۔ یہ اس دنیا میں اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ ہونا یعنی ایسا سخت ہو جانا کہ کوئی اسے ہضم نہ کر سکے۔ کوئی اپنے اندر جذب نہ کر سکے۔ یہ کیسے ہوگا! اس خاک کے تودے میں فولادی جوہر کیونکر پیدا ہوں گے۔ یہ نازک سا شیشہ اپنے اندر ایسی سختی کیسے پیدا کرے گا کہ اس کا "زجاج حریف سنگ" ہو جائے۔ اس کے لئے "رموز و اسرار" میں پورا لائحہ عمل مرتب کر کے دے دیا گیا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ لیکن ان سب کا ماحصل ایک نکتہ ہے اور یہی نکتہ دراصل کلامِ اقبالؒ کا محور ہے۔ مرکز ہے۔ محیط ہے، سب کچھ ہے، یہ نکتہ یہ ہے کہ

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو

بس یہ ہے راز ایک مومن کی پختگی کا۔ اس کی خودی کے استحکام کا کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو۔ تُو ان مقدس ہاتھوں کا پروردہ ہے جس کی شان میں آیا ہے کہ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ۔ تُو تو اس ذاتِ گرامی کا شاہین ہے جو دانائے سبل "ختمِ رسل" ہے۔ جو معراجِ انسانیت کا مظہرِ کامل ہے۔ جب تو ایسی رفیع الشان بارگاہ کا شاہین ہے تو تیرے عرش آشیاں ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ بنا بریں

اطاعت مرکزِ قرآن

تمام فضائیں اور فضاؤں کی پہنائیاں، یہ سب پستیاں اور تمام بلندیاں، یہ ارض و سماوات، یہ تمام کائنات اور اس کی قیود نا آشنا

وسعتیں اس شاہینِ لولاکؐ کے بازوؤں کے نیچے کیوں نہ ہوں. اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی اطاعت عشق کے مرتبہ تک نہ پہنچ چکی ہو کہ رسول کی اطاعت درحقیقت خدا کی اطاعت ہے اور یہ اطاعت قرآن کی اطاعت سے یسّر آتی ہے کہ حضورؐ قرآن ہی کی اطاعت سکھانے کے لئے تشریف لائے تھے۔

قسم ہے تیرے پروردگار کی ان میں سے کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے ان تمام معاملات میں جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں' اے رسول! تمہیں اپنا حکم تسلیم نہ کرلیں' پھر تمہارے فیصلوں پر دل میں کوئی تنگی اور گرانی محسوس نہ کریں. بلکہ ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں۔
(۴/۶۵)

اس نکتہ کے اندر امت کی مرکزیت' امیر کی اطاعت' وحدتِ افکار و عمل اور ان کے جیتے جاگتے نتائج یعنی تمکّن فی الارض' شان و شوکت' حکومت و سطوت' زمین پر "آسمانی بادشاہت" کا قیام' سرفرازیاں اور بلندیاں' کامیابیاں اور کامرانیاں اور اس کے بعد حیاتِ اُخروی میں' بعد کی منزل میں' آگے بڑھنے کی قوتیں' مدارجِ عالیہ' یہ سب کچھ اس کے اندر پوشیدہ ہے. مجھے ضمناً اس بحث کو یہاں چھوڑ دینا پڑا ورنہ یہ تو وہ عنوان ہے جس پر کلامِ اقبالؒ سے ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے. اقبالؒ کی تمام شاعری اور شاعری کا تمام سوز و گداز رہینِ منّت ہے محبّتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلّم) کا' جذبۂ اطاعت کا. اسی ذاتِ گرامیؐ کی شعلہ ریز محبّت ہے جس نے اقبالؒ کو اقبال بنا دیا ورنہ یہ بھی کہیں میرِ مشاعرہ ہوا کرتے. جذبۂ اطاعتِ[1] رسولؐ نے (جسے وہ عشق کہتے ہیں) اقبالؒ کو اس انداز سے گداز کر رکھا ہے کہ اس کے بربطِ ہستی کے کسی تار کو چھیڑیئے اس میں سے نغمہ وہی پیدا ہوتا ہے. اسی چیز نے ان کے سامنے قرآنی حقائق کو بے نقاب کیا اور قرآنی حقائق نے ان کے کلام میں دمِ مسیحا اور ضربِ کلیم کے اعجاز پیدا کر دیئے. فطرت کی کرم گستری نے وہ دماغ عطا کیا تھا جو

---

[1] نظامِ اسلامی کی رُو سے کس طرح امامِ متفق علیہ (مرکزِ ملّت) کی اطاعت' اطاعتِ خدا اور رسولؐ کے مرادف ہو جاتی ہے' قرآنِ کریم میں بہ صراحت اس کی تشریح موجود ہے. اسی جذبۂ اطاعت کے اندر قوموں کی زندگی کا راز ہے اور اس کو بھلا دینے سے مسلمانوں کی آج یہ حالت ہو رہی ہے. اطاعت جب خوف و ترہیب سے بلند اور مزد و معاوضہ سے بے نیاز ہو جائے تو عشق بن جاتی ہے. ان امور کی تفصیل کے لئے دیکھئے — اسلامی نظام.

یکسر علم و حکمت تھا۔ محبتِ رسولؐ کی موہبتِ عظمیٰ سے وہ قلب منور مل گیا جسے صہبائے ایمان کا مقدس آبگینہ کہنا چاہیئے۔ ان دونوں کے امتزاج سے وہ نگاہ پیدا ہوئی جو اشیاء کی حقیقت کو بے نقاب دیکھ لے، جو گل و خار کے نظر فریب امتیاز سے ہٹ کر شاخِ گل کے اندر جا کر مشاہدہ کرے کہ "درونِ اُو نہ گل باشد نہ خار است"۔ اسی نگہ حقیقت شناس کا نام ہے اقبالؒ یعنی قلب و دماغ کا مجموعہ، ایمان و حکمت کا نشرہ، زیرکی و عشق کا عصارہ، اویسؒ و بوعلیؒ کا مرکب، مجسمہ، رومیؒ و رازیؒ کا مشترکہ شاہکار، مشرق و مغرب کا مقامِ اتصال۔

غربیاں را زیرکی سازِ حیات — شرقیاں را عشق رازِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس — کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ — عشق را با زیرکی آمیزدہ

اور یہی وہ امتزاجی کیفیت ہے جو قرآنِ کریم ایک مومن کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مظاہرِ فطرت کی گوناگوں نیرنگیوں کے بعد فرمایا۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۚ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ ...... ۝ (۱۹۰-۱۹۱/۳)

بیشک (ان مظاہرِ فطرت) کے اندر صاحبانِ عقل و خرد کے لئے آیات ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو کھڑے بیٹھے اور لیٹے اللہ کو یاد کرتے ہیں۔

یہ عقل و بصیرت کے ساتھ خدا کو یاد کرنے والے وہ مومنین ہیں جنہیں نوعِ انسان کے لئے نمونہ بنایا گیا ہے۔

اور پھر سحابِ فطرت کا کرم بالائے کرم کہ اس نگہ حقیقت بین کو اظہارِ جذبات کے لئے ذریعہ بھی ایسا حسین و دلکش عطا کر دیا کہ جو دیکھے کھنچا چلا آئے۔ بشرطیکہ وہ کہیں سے بوجہلؔ و بولہبؔ کی ہی آنکھیں نہ مانگ لایا ہو۔ اور پھر تماشہ یہ کہ یہ ملکوتی کام لیا اس شاعری سے جس کے علمبردار ابھی تک اس "تحقیق انیق" سے ہی فارغ نہیں ہو سکے کہ بُلبل مذکر ہے یا مونث۔ سچ ہے جب خدا چاہے تو ایک خشک لکڑی سے وہ کام لے لے کہ وہ کذب و باطل کے بڑے بڑے اژدہوں کو نگل جائے۔

یہ اور بات ہے کہ قومِ اقبالؒ کو بھی ایسی ہی ملی ہو جو قومِ موسیٰؑ کی طرح کہہ دے فَاذْھَبْ اَنْتَ وَ رَبُّکَ فَقَاتِلَآ اِنَّا ھٰھُنَا قٰعِدُوْنَ۔ جا تو اور تیرا رب لڑو جا کر۔ ہم تو یہاں بیٹھے ہیں جب فتح

ہو جائے تو آواز دے دینا۔ بایں ہمہ، یقین مانیئے کہ جس طرح قرآنِ کریم نے عرب کی شاعری کے دورِ جاہلیت کو ختم کر کے اسی قوم سے ایک ایسا خمیر تیار کر دیا تھا کہ وہ جس آٹے میں جا کر ملے اس میں بھی خمیر کی کیفیت پیدا کر دے۔ اقبالؒ نے بھی مشکوٰۃِ قرآن کی روشنی میں "عجمی شاعری" کے "دورِ جاہلیت" کو ختم کر کے ان کے افیونی اعصاب میں ایسا خونِ زندگی دوڑا دیا ہے کہ وہ دن دُور نہیں جب یہ زمین بدل جائے گی یہ آسمان بدل جائے گا اور مسلمان پھر یہ کہنے کے قابل ہو جائے گا کہ

زمیں از کوکبِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے
فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے

تلمیحاتِ اقبالؒ

(قرآنِ کریم سے)

ریڈیائی تقریر ـــــــ جنوری ۱۹۴۹ء

کسی مفکّر کے پیغام کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے فکر کے سرچشمہ کے متعلق صحیح معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ اس لئے کہ جب تک اس کی اصل حقیقت معلوم نہ ہو جائے جس سے اس کے فکر کی شاخیں پھوٹی ہیں۔ اس کے برگ و بار کی ماہیت اور اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اکثر مفکّرین اپنی اساسِ فکر کو اس طرح غیر معیّن اور مبہم چھوڑ جاتے ہیں کہ ان کے پیغام پر غور و فکر کرنے والوں کو اس اصل و اساس کے تعیّن میں بڑی دشواری پیش آتی ہے اور ان کے ناقدین و شارحین کی قیاسی سراغ رسانیوں سے یہ معمّہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتّٰی کہ کچھ عرصہ کے بعد ان کے پیغام پر ان قیاس آرائیوں کے اتنے دبیز پردے پڑ جاتے ہیں کہ حقیقت نگاہوں سے یکسر گُم ہو جاتی ہے اور لوگ جسے ان مفکّرین کا پیغام سمجھتے ہیں وہ ان کے ناقدین و شارحین کی خیال آفرینیوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اس باب میں علامہ اقبالؒ کی ہستی ممتاز نظر آتی ہے کہ انہوں نے اپنے فکر کے سرچشمہ اور اپنے پیغام کی اساس کو اس طرح واضح اور غیر مبہم طور پر بیان کر دیا ہے کہ اس میں کسی ظن و تخمین اور قیاس و گمان کی گنجائش ہی نہیں رہنے دی۔ بایں ہمہ اسے ہماری لذّت نکات آفرینی کہیئے یا ذوقِ اعجوبہ پسندی کہ پیامِ اقبالؒ سے دلچسپی رکھنے والے گزشتہ دس برس سے اپنی تحقیق و جستجو میں سرگرداں و حیراں پھر رہے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کے فکر کے ماخذ کیا تھے اور انہوں نے کن افکار و خیالات سے متاثر ہو کر

اپنا پیغام متعین کیا تھا۔ انہی قیاس آرائیوں کا نتیجہ ہے کہ کوئی ان کے فکر کو کانٹ کے فلسفہ کا رہین منت بتاتا ہے اور کوئی نیٹشے کے خیالات کا پرتو۔ کہیں انہیں برگساں کا آئینہ دار کہا جاتا ہے اور کہیں ہیگل کا خوشہ چیں۔ اور بہت کم ہیں جو یہ سوچتے ہیں کہ جب انہوں نے خود واضح طور پر بتا دیا ہے کہ ان کی فکر کا مأخذ کیا ہے اور وہ کن حقائق سے متأثر ہوئے ہیں تو پھر اس کاوشِ بے جا اور کاہشِ لاحاصل سے مقصود کیا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ علامہ مرحوم نے مشرقی و مغربی علومِ قدیمہ و جدیدہ کا بدقّتِ نظر مطالعہ کیا تھا اور چونکہ فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا اس لئے انہوں نے مغربی مفکّرین کے افکار و تصوّرات پر گہری نظر ڈالی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے فکر کی اساس ان مفکّرین کے تصوّرات و نظریات پر تھی۔ ان کی فکر کی اساس ایک محکم اور مستقل حقیقت پر تھی جو نہ مشرق سے متأثر ہوئی ہے نہ مغرب سے۔ وہ اس کی تائید و تشریح میں مشرق و مغرب کے خیالات و تصوّرات کو استشہاداً پیش کرتے تھے۔ لیکن اسے ان کے قیاسات و مزعومات سے ملوّث نہیں ہونے دیتے تھے۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے تھے کہ جس مقام سے وہ بات کر رہے ہیں وہ حکمت و فلسفہ کی حد سے ماوراء ہے۔

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے　　　ورائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

عصرِ حاضر کے علوم و فنون کے متعلق انہوں نے واضح طور پر کہہ دیا کہ ان میں جو باتیں انہوں نے اس حقیقتِ ثابتہ کے مطابق پائی ہیں جس پر ان کے فکر کی اساس تھی انہیں تائیداً لے لیا گیا ہے اور جو چیزیں خلافِ حقیقت ہیں ان کے فریب کو بے نقاب کر دیا گیا ہے۔

طلسمِ علمِ حاضر را شکستم　　　ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانندِ براہیم　　　بہ نارِ او چہ بے پروا نشستم

غور کیجئے جو شخص دورِ حاضر کی علم و حکمت کو آتشِ نمرود قرار دے رہا ہو اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے اپنی فکر کی اساس اس علم و حکمت پر رکھی تھی اس پر کتنا بڑا اتہام ہے۔ علومِ جدیدہ ہی نہیں، علومِ قدیمہ کے نظریات کے متعلق بھی ان کا یہی مسلک تھا۔ وہ ان غلط نظریاتِ زندگی اور تصوّراتِ حیات کو "ملّا و صوفی" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ

بیا ساقی بگرداں ساتگیں را　　　بیفشاں بر دو گیتی آستیں را
حقیقت را بہ رندے فاش کردند　　　کہ ملّا کم شناسد رمزِ دیں را

جدید و قدیم دونوں کے متعلق

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب علامہ اقبالؒ نے اپنی فکر کو کہیں سے مانگے ہوئے افکار و تخیلات سے متاثر نہیں ہونے دیا تو وہ کون سی حقیقتِ ثابتہ تھی جس پر اس فکر کی اساس تھی۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے انہوں نے اسے ایسے واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ اس کے متعلق کسی ظنّ و قیاس یا تاویل و تعبیر کی گنجائش ہی نہیں رہنے دی۔ ان کا پیغام سب سے پہلے منضبط صورت میں اسرار و رموز میں ہمارے سامنے آتا ہے جو ان کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اس مثنوی کے آخر میں انہوں نے اس ذاتِ اقدس و اعظم (علیہ التحیۃ والسلام) کی بارگاہ میں ایک التجا پیش کی ہے جو ان کے عشق کی منتہیٰ، ان کی آرزوؤں کی محور اور ان کی تمناؤں کی مرکز تھی۔ اس دعا میں وہ کہتے ہیں کہ

گر دلم آئینۂ بے جوہر است در بحرفم غیر قرآں مضمر است

یعنی اگر میرے پیغام میں قرآن کے سوا کچھ بھی اور ہے تو اے ختمِ رسلؐ، دانائے سبل!

پردہ ناموسِ فکرم چاک کن ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

یہیں تک نہیں بلکہ

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

جن کی نگاہیں قلبِ اقبالؒ پر ہیں وہ اس شدتِ احساس کا اندازہ لگا سکتے ہیں جس کے ماتحت انہوں نے اپنے حق میں اتنی بڑی تعزیر روا رکھی ہے۔ اس سے آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ

گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام با مسلماناں اگر حق گفتہ ام

اگر میرا پیغام قرآن ہی کا ترجمان ہے تو

عرض کن پیشِ خدائے عزّ و جل عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل

میں نہیں سمجھتا کہ ایسے کھلے کھلے الفاظ کے بعد اس کی گنجائش بھی باقی رہ جاتی ہے کہ تحقیق کی جائے کہ اقبالؒ کے فکر کا سرچشمہ کیا تھا اور ان کی نگاہیں کس آفتابِ حقیقت سے مستنیر تھیں۔ میرے نزدیک اقبالؒ کی عظمت و عقیدت اسی بنا پر ہے کہ انہوں نے جو کچھ سمجھا قرآن سے سمجھا اور جو کچھ سمجھایا قرآن سے سمجھایا۔ ان کی مئے سخن براہِ راست خمکدۂ حجاز سے سربمہر آبگینوں میں آیا کرتی تھی اور

اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوتی تھی۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ

از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

اقبالؒ کے پیغام کو سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ اس میں جہاں جہاں قرآن کا ذکر آتا ہے وہ کس جذب و شوق اور کیف و مستی سے جھومتے نظر آتے ہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک قرآن کیا ہے، وہ کہتے ہیں۔

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست	زیرِ گردوں سرِ تمکینِ تو چیست
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم	حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات	بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ او را ریب نے تبدیل نے	آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
نوعِ انساں را پیامِ آخریں	حاملِ او رحمۃ للعالمیں

اور سنئے۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است	ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست	عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا است	ہر جہاں اندر برِ او چوں قبا است
چوں کہن گردد جہانے در برش	می دہد قرآں جہانے دیگرش

یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو اقبالؒ کے فہمِ قرآں کے کسی مقام سے اختلاف ہو۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے فکر کی اساس کچھ اور تھی۔ اب آپ یہ سوچئے کہ جس مفکر کے فکر کا سرچشمہ قرآن ہو۔ نہیں! بلکہ جس کا دعویٰ یہ ہو کہ میرے پیغام میں غیر قرآن ایک حرف بھی نہیں، اس کے پیغام سے قرآن کی تلمیحات پیش کرنا اس کے پورے کے پورے پیغام کو پیش کرنا ہوگا۔ تلمیحِ قرآنی کے معنی یہ ہیں کہ اگر علامہ اقبالؒ اپنے کسی شعر میں قرآن کی کسی آیت کا کوئی لفظ یا ٹکڑا لاتے ہیں تو یہ بتا دیا جائے کہ اس سے کس آیتِ قرآنی کی طرف اشارہ ہے مثلاً انہوں نے اپنی نظم خضرِ راہ کے ایک مصرعہ میں لکھا ہے۔

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ الملوک

تو انّ الملوک کی تلمیح سے اشارہ ہے سورۂ نمل کی اس آیۂ مقدسہ کی طرف کہ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْا اَعِزَّةَ اَهْلِهَا اَذِلَّةً كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ. ملکہ سبا

نے کہا کہ بادشاہ جب کسی بستی (کو فتح کرکے) اس میں داخل ہوتے ہیں تو اس کا تختہ اُلٹ دیتے ہیں اور وہاں کے صاحبِ عزت و حشمت لوگوں کو ذلیل و خوار کردیتے ہیں اور یہ کوئی ہنگامی چیز نہیں بلکہ ملوکیت کا خاصہ ہی یہ ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے چونکہ اقبالؒ کے پیغام کا ماخذ ہی قرآن ہے، اس لئے ان کی جس کتاب کو اٹھایئے آپ دیکھیں گے کہ قرآنی آیات کی طرف اشارہ پر اشارہ چلا آرہا ہے۔ کہیں خود قرآن کے الفاظ میں اور کہیں قرآنی مفہوم اپنے الفاظ میں۔ مثلاً اسرار و رموز کے چند الفاظ لیجئے۔

آنکہ بر اعدا درِ رحمت کشاد مکہ را پیغامِ لَا تَثْرِیب داد

نبی اکرمؐ نے جب مکہ فتح کیا ہے تو سردارانِ قریش جنہوں نے حضورؐ کی ایذا رسانی اور تکلیف دہی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی پا بجولاں سامنے کھڑے تھے۔ دنیا کے ہر قانون کی رُو سے ان کی سزا قتل تھی لیکن حضورؐ نے اپنے انتہائی عفوِ کریمانہ سے کام لیا اور فرمایا کہ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔ جاؤ! تم سے کچھ مواخذہ نہ ہوگا۔ قرآنِ کریم میں یہ الفاظ حضرت یوسفؑ کی زبان سے آئے ہیں جب انہوں نے اپنے بھائیوں کی ہر خطا کو معاف کردیا تھا۔ ایک اور شعر ہے۔

ایکہ در زندانِ غم باشی اسیر از نبی تعلیمِ لَا تحزن بگیر

شبِ ہجرت کی صبح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیقؓ کی معیت میں ایک غار میں چھپے بیٹھے تھے کہ دشمنوں کے پاؤں کی آہٹ کان میں آئی۔ حضورؐ کی حفاظت کے خیال سے حضرت صدیق اکبرؓ کی پیشانی پر تردّد کے آثار نمایاں ہوگئے۔ حضورؐ نے اسے بھانپا اور دل کے کامل سکون اور اطمینان سے فرمایا کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ مت گھبراؤ! ہم اکیلے نہیں۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ یہی ہے وہ واقعہ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ

از نبی تعلیمِ لَا تَحْزَنْ بگیر

یا مثلاً جب صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰؑ کا ساحرینِ دربارِ فرعون سے آمنا سامنا ہوا اور جادوگروں کی رسّیاں دیکھنے والوں کی نگاہوں میں سانپ بن کر دوڑنے لگیں تو حضرت موسیٰؑ کو خیال پیدا ہوا کہ

---

[1] یہ قرآن کی متعلقہ آیات کے لغوی معانی ہیں۔ ان کا مجازی مفہوم کچھ اور ہے جسے میں نے "برقِ طور" میں بیان کیا ہے۔

کہیں لوگ ان کی نگاہ فریبی سے متاثر ہو کر باطل کی طرف نہ جھک جائیں۔ اس پر اللہ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی۔ اے موسیٰ! مت گھبراؤ۔ یقیناً تم ہی غالب رہو گے۔ اقبال مردِ مومن کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

چوں کلیمے سوئے فرعونے رود قلبِ او از لاتخف محکم شود

ان اشعار میں تو آیاتِ قرآنی کے ایک ایک دو دو الفاظ ہی آتے ہیں۔ بعض اوقات پورے کا پورا مصرعہ آیتِ قرآنی پر مشتمل ہوتا ہے۔ مثلاً وطنیت کے پرستاروں کے متعلق کہتے ہیں۔

بغتے جستند در بئس القرار تا احلوا قومھم دار البوار

سورہ ابراہیم میں ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۙ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَ بِئْسَ الْقَرَارُ۔ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے خدا کی نعمتوں کی ناسپاس گزاری کی اور اس طرح اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں لے گئے یعنی جہنم میں داخل ہو گئے اور وہ کیسی بُری جگہ ہے ٹھہرنے کی۔

ان اشعار میں قرآنی الفاظ سے آیاتِ قرآنی کی طرف اشارے کئے گئے ہیں۔ لیکن ایسے اشعار بھی ہیں جن میں اپنے الفاظ میں قرآنی آیات کی طرف تلمیحات ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ کے متعلق فرماتے ہیں۔

بہر ما ویرانہ آباد کرد طائفاں را خانہ بنیاد کرد

پہلے مصرعہ میں ویرانہ سے اشارہ ہے سورہ ابراہیم کی اس آیتِ جلیلہ کی طرف جس میں حضرت ابراہیمؑ نے بحضورِ ربّ العزت عرض کیا تھا۔ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ۔ ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو اس وادی میں آباد کر دیا ہے جس میں شگفتگی و شادابی کا نام و نشان تک نہیں۔ اور دوسرے مصرعہ (طائفاں را خانہ بنیاد کرد) میں اشارہ ہے سورہ بقرہ کی اس آیت کی طرف جس میں ارشاد ہے کہ وَ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ اور ہم نے ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کو حکم دیا کہ وہ طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے ہمارے گھر کو پاک کر دیں۔

میں نے ان اشعار کو محض تمثیلاً پیش کیا ہے ورنہ مفہوم کے اعتبار سے اقبالؒ کے پورے

پیغام سے بتایا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن کے کس مقام کا ترجمان ہے۔ وہ اپنے الفاظ کے پردے میں سب کچھ کہہ گئے ہیں۔ پیامِ مشرق میں ہے۔

پردہ برگیرم و در پردہ سخن می گویم
تیغ خوں ریزم و خود را بہ نیامے دارم

لہٰذا اگر یہ صحیح ہے کہ کسی مفکر کے پیغام کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک اس کے پیغام کے ماخذ اور اس کے فکر کی اساس کو نہ سمجھا جائے تو اس میں کوئی کلام نہیں کہ اقبالؒ کے پیغام کو نہیں سمجھا جا سکتا جب تک پڑھنے والے کے سامنے قرآن نہ ہو۔ جو اقبالؒ کو اس طرح نہیں سمجھتا وہ اس کے الفاظ میں کھو کر رہ جاتا ہے حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ انہی کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ

آشنائے من ز من بیگانہ رفت ‌ ‌ ‌ از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہِ خسروی او را دہم ‌ ‌ ‌ تختِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم
او حدیثِ دلبری خواہد ز من ‌ ‌ ‌ رنگ و آبِ شاعری خواہد ز من

کم نظر بیتابیٔ جانم نہ دید
آشکارم دید و پنہانم نہ دید
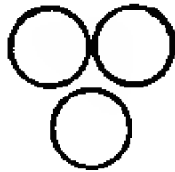
اقبالؒ اور ملّت

(۱۹۴۰ء کے یومِ اقبالؒ کی تقریر)

۱۹۳۸ء میں جب پہلا یومِ اقبالؒ منایا گیا تو میں نے مسلم برادرہُڈ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ حضرت علامہ (علیہ الرحمتہ) کی یاد میں سر جھکائے آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے یومِ اقبالؒ تو سینکڑوں منائے جائیں گے لیکن گلے میں پھولوں کے ہار ڈال کر زمزمۂ تہنیت و غلغلۂ تبریک سے سرمست یومِ اقبالؒ منانے کا سہرا برادرہُڈ کے سرہی رہے گا۔ نہ جانے وہ کونسی قوت تھی جس نے میری زبان سے اس وقت یہ الفاظ کہلوا دیئے کہ دوسرے ہی سال ہمیں سر جھکائے آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے "یومِ اقبالؒ" منانا پڑا۔ بہرحال، میں اس وقت اپنے بربطِ ہستی کے ان تاروں کو نہیں چھیڑنا چاہتا جس میں یہ المیہ نغمات خوابیدہ ہیں کہ ہمیں ایسے مواقع پر سکھایا یہ گیا ہے کہ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ۝ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۝ ۲/۱۵۵-۱۵۶

آپ کو معلوم ہے کہ میرا مستقل موضوع ہوتا ہے "پیامِ اقبالؒ اور قرآن کریم"۔ اس لئے کہ میرے نزدیک حضرت علامہ کی صحیح عظمت و عقیدت اسی بنا پر ہے کہ انہوں نے جو کچھ سمجھا قرآن سے سمجھا اور جو کچھ کہا قرآن سے کہا۔ ان کے پیام کا سرچشمہ نہ افلاطون و فارابی کے تصورات کی دنیا ہے اور نہ کانٹ اور ہیگل کے تخیلات کا عالم۔ انہوں نے جس قدر اکتسابِ ضیا کیا اللہ کی اسی شمع نورانی سے کیا۔ ان کی مئے سخن براہِ راست خمستانِ حجاز سے سربہرآبگینوں میں آتی تھی تاکہ اس میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ

از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

سالِ گذشتہ میں نے اس وسیع موضوع کے ایک ضمنی گوشے یعنی اسلامی فلسفۂ اجتماعیت کے متعلق کچھ عرض کیا تھا۔ اس وقت "اقبالؒ اور ملت" کے عنوان سے کچھ گزارش کروں گا۔ اسے دراصل سالِ گذشتہ کے سلسلہ ہی کی ایک کڑی سمجھئے۔ دما توفیقی اِلّا باللہ العلی العظیم۔

اگر آپ اسلام اور دیگر ادیانِ[1] عالم پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں تو آپ کو ان دونوں میں ایک بیّن فرق نظر آئے گا۔ دنیا کے دیگر مذاہب کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ انسان کو اس کی اپنی نجات کا طریقہ سکھائیں۔ اُسے بتائیں کہ اُس کی مُکتی کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ (SALVATION) کس طرح حاصل کر سکتا ہے اور اس نجات، مکتی یا (SALVATION) کے حصول کے لئے سکھایا یہ جاتا ہے کہ انسان دنیا کے دھندوں سے الگ ہو کر ایشور کی بھگتی میں مگن ہو جائے۔ ان مذاہب میں خدا کا مقرب وہی سمجھا جاتا ہے جو اس کے بندوں سے دُور ہوتا چلا جائے۔ گرہست آشرم اور سنیاس آشرم ایک انسان کی دو مختلف زندگیوں کے نام ہیں جو کبھی یک جا نہیں ہو سکتے۔ کلیسا کا راہب بیوی بچوں کی زندگی سے دُور بھاگتا ہے۔ کیونکہ اسے ان میں شیطان کی روح نظر آتی ہے۔ سلطنت اور مذہب (CHURCH AND STATE) نظامِ عالم کے دو جدا گانہ شعبے ہیں جن میں کبھی تطابق و توافق پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے برعکس

اسلام کا مقصود

اسلام دنیا کو ایک اور ہی سبق دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دین انسان کی عملی زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ اس کے حدود و قیود وہ پختہ ساحل ہیں جو حیاتِ انسانی کی جوئے رواں کا رُخ متعین کرتے ہیں۔ اسلام کے نزدیک دین کا منشا محض ایک انسان کی انفرادی نجات نہیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ خدا کی اس وسیع و عریض زمین پر جسے انسانی جیرہ دستیوں اور ہوس پرستیوں نے جہنم بنا رکھا ہے، خدا کی بادشاہت قائم کی جائے۔ اس نظامِ زندگی، اس ضابطۂ حیات کا نام ہے اسلام۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قرآنی نظام

---

[1] دنیا میں دینِ خداوندی صرف ایک ہی ہے جسے اسلام کہتے ہیں اور جو قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ باقی سب مذاہب ہیں۔ خدا کے رسول دین پیش کرتے۔ ان کے متبعین ان کے بعد اس دین میں اپنی طرف سے آمیزش کر دیتے تھے۔ دین کی اس تحریف شدہ شکل کو مذہب کہتے ہیں۔

کے قیام و بقا کے لئے اللہ کے سپاہیوں کی ایک جماعت کی ضرورت ہوگی' اس جماعت کا نام ہے ملتِ اسلامیہ' جو دنیا میں اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے خدا کے لئے جیتی اور اسی کے لئے مرتی ہے. قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

لیکن برادران! اسلام کی اس امتیازی تعلیم پر غیر اسلامی تصورات اس درجہ غالب آ گئے کہ حیاتِ اجتماعیہ کا یہ نظریہ مسلمانوں کی نگاہوں سے یکسر او جھل ہو گیا اور دیگر مذاہب کی طرح اسلام کے متعلق بھی یہی سمجھ لیا گیا کہ اس کا مقصد انسان کی انفرادی نجات ہے. اگرچہ یہ عجمی نظریہ مسلمانوں کے ذہن پر ایک عرصہ سے مسلط تھا لیکن دورِ حاضرہ میں ان لوگوں کی طرف سے جو سمجھتے تھے کہ اسلام کا یہ امتیازی نشان ان کے بعض مخصوص مقاصد کی راہ میں ایک سنگِ گراں بن کر حائل ہے' اس نظریہ کو بڑا نمایاں کر کے دکھایا گیا اور ہر جگہ اس کا ڈھنڈورا پیٹا گیا کہ مذہب انسان کے پرائیویٹ عقیدہ کا نام ہے. عملی زندگی میں اس کا کوئی دخل دائرہ نہ ہونا چاہیئے. ایسے پُر آشوب زمانے میں جب کہ مذہب کے متعلق اپنوں اور بیگانوں کی طرف سے اس قسم کے غیر اسلامی تصورات کو عام کیا جا رہا تھا. ملتِ اسلامیہ کی خوش بختی سے ان کے اندر ایک مردِ مومن پیدا ہوا جس نے اپنی بصیرتِ قرآنی اور جراٰتِ ایمانی سے مسلمانوں کے سامنے ان کے اس گم گشتہ نظریہ کو پھر سے نمایاں کیا اور پوری قوت سے اعلان کیا کہ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَۃِ.

فرد را ربطِ جماعت رحمت است — جوہرِ اُو را کمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش — رونقِ ہنگامۂ احرار باش
فرد می گیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

فرد اور ملت کی مثال ایک گھڑی کے پرزوں کی سی ہے. پرزے الگ الگ بکھرے پڑے ہوں تو ایک ایک پرزہ کتنا ہی قیمتی اور کیسا ہی مضبوط کیوں نہ ہو کسی کام کا نہیں. لیکن اگر یہی پرزے ایک خاص نظام کے ماتحت گھڑی کے اندر فٹ (FIT). ہو جائیں تو ہر پرزہ کی حرکت تمام مشینری پر

اثر انداز ہوگی اور یوں ان پُرزوں کی حرکات کے بیتے جاگتے درخشندہ و تابندہ نتائج آنکھوں کے سامنے آجائیں گے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا قف وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ٥ (۳/۲۰۰)

اگر آپ حضرت علامہ کے کلام پر اس نگاہ سے غور کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی۔

ملت اور مرکز

کہ آپ کے پیام کا نقطۂ ماسکہ ہے ملت اور مرکز۔ اور اسلام فی الحقیقت انہی کے التزام کا نام ہے۔ یہ گئے تو اسلام بھی گیا۔

اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی ۔۔۔ چھوڑ کر گُل کو پریشاں کاروانِ بُو ہوا
پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ ۔۔۔ زندگی کیسی جو دِل بے گانۂ پہلو ہوا
آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی ۔۔۔ جب یہ جمعیت گئی دُنیا میں رسوا تو ہوا
فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں ۔۔۔ موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

یہ تصور کہ ملت کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے، اس کی اجتماعیت فنا ہو چکی ہے، ان کی وحدت پارہ پارہ ہو چکی ہے، ان کی مرکزیت انفرادیت میں گُم ہو چکی ہے، حضرت علامہ کو خون کے آنسو رلاتا تھا۔ بحضور رسالت مآبؐ عرض کرتے ہیں۔

ہنوز ایں چرخِ نیلی کج خرام است ۔۔۔ ہنوز ایں کارواں دور از مقام است
زکارِ بے نظامِ اُو چہ گویم ۔۔۔ تو می دانی کہ ملت بے امام است

ان کے نزدیک ایک مسلمان کی تعریف (DEFINITION) ہی یہ ہے کہ وہ اپنی خودی کو مستحکم کر کے ملت کا جزوِ لاینفک بن جائے اور یوں بقائے دوام اور حیاتِ جاوید کے بلند ترین مقام پر سرفراز ہو جائے۔ وہ دنیائے عشق میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں۔ وہ تصوّف کے عجمی تصور کو پھر سے اسلامی بنیادوں پر استوار کرتے ہیں۔ وہ انا الحق کی جگہ انا الملت کا نعرہ لگانا سکھاتے ہیں۔

مسلمانی غمِ دل در خریدن ۔۔۔ چوں سیماب از تپِ یاراں تپیدن
حضورِ ملت از خود در گذشتن ۔۔۔ دگر بانگِ انا الملت کشیدن

"چوں سیماب از تپِ یاراں تپیدن" — نبیٔ اکرمؐ نے فرمایا کہ تمام روئے زمین کے مسلمانوں کی مثال ایک جسدِ واحد کی سی ہے۔ اگر پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا چبھ جائے تو آنکھ کے آبگینے میں آنسو چھلک آئیں۔ اگر افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں کسی حبشی کے تلوے میں آبلہ پڑ جائے تو گل کدۂ ایران میں حریر و اطلس کے گدوں پر لیٹے ہوئے شاہنشاہ کی آنکھوں میں نیند حرام ہو جائے۔ علاوہ بریں اپنے آپ کو ملت کا جزو بنا دینے اور اس طرح خود ملت بن جانے کے نکتہ پر بھی غور فرمایا آپ نے؟ اسلام ملتِ ابراہیمی کا نام ہے اور حضرت ابراہیمؑ کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے۔

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا

یقیناً ابراہیم ایک فردِ واحد نہیں تھا بلکہ ایک (پوری پوری) ملت قانتاً کو اپنی ذات میں سموئے ہوئے تھا اور تمام دنیا سے کٹ کر سیدھا اسی کے راستے پر قائم تھا۔

بچشمِ کم مبیں تنہائیم را کہ من صد کارواں اندر کنارم

چونکہ اس زمین پر حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی ذمہ دار ملتِ اسلامیہ ہے۔ اس کی سلطنت کا تخت اسی کے ہاتھوں بچھایا جائے گا۔ اس لئے اگر یہ ملت (افراد نہیں ملت) انا الحق کا دعویٰ بھی کرے تو بجا نہیں۔

انا الحق جز مقامِ کبریا نیست سزائے او چلیپاست یا نیست
اگر فردے بگوید سرزنش بہ اگر قومے بگوید ناروا نیست

لیکن یہ انا الحق کا دعویٰ زیب کس قوم کو دیتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

بآں ملت انا الحق سازگار است کہ از خونش نم ہر شاخسار است
نہاں اندر جلالِ او جمالے کہ او را نہ سپہر آئینہ دار است

وہ اُمت جو

میانِ اُمتاں والا مقام است

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۱۰)

کہ آں اُمت دو گیتی را امام است

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۝ (۲/۱۴۳)

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی　　ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

ہاں! وہ امت کہ

میانِ امتاں والا مقام است　　کہ آں امت دو گیتی را امام است
نیاساید ز کارِ آفرینش　　کہ خواب و خستگی بر وے حرام است

وہ امت کہ جس کا اندازِ زندگی یہ ہو کہ

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ

جن بلندیوں پر یہ اڑے کسی اور کے شہپرِ تخیل کی بھی وہاں تک رسائی نہ ہو۔

مومنے بالائے ہر بالا ترے　　غیرتِ اُو بر نتابد ہمسرے

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ ۱۳۹/۳

بخود نگر | وہ مسلمان سے کہتے ہیں کہ تو نے اپنے مقام کو پہچانا ہی نہیں۔ تہذیبِ یورپ کے جھوٹے نگوں کی مینا کاری تیری نگاہوں کو یوں ہی خیرہ کر گئی حالانکہ اگر تو کبھی اپنے آپ سے باخبر ہو جاتا تو خود محسوس کر لیتا کہ

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن　　قدم اٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

یورپ کا مادہ پرست اسی جہانِ آب و گل کی چار دیواری میں محبوس ہو کے رہ گیا۔ اس کی نگہ تجسس نے بہت بڑی جست کی تو کسی کرے سے ٹکرا کر نیچے گر پڑی۔ اس کے برعکس مومن کو قرآن یہ سکھاتا ہے کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں　　ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا　　کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

اقبالؒ نے اس ملت کے متعلق کہا ہے کہ

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ۔ وہ آسمان کی بلندیوں پر بلا شریک و سہیم اڑتی ہے۔ لیکن اتنی بلندیوں پر اڑنے کے باوجود، نگاہِ اُو بشاخِ آشیانہ ــــ اس کے قلب کا رشتہ مرکز سے وابستہ رہتا ہے۔

ہیچو پرکاریم پائے در شریعت مستقیم　　پائے دیگر سیرِ ہفتاد و دو ملت کردہ ایم[1]

---

[1] یہ شعر اقبالؒ کا نہیں۔

کہ اگر پاؤں مرکز سے اُکھڑ گیا تو دائرہ کائنات بگڑ گیا۔ اگر آشیانے سے نگاہ اُچٹ گئی تو فضا کی پہنائیوں میں

مرکز

کھو گیا۔ کیا آپ نے شہد کی مکھیوں کی طرف نہیں دیکھا (وَ اَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ) سیکڑوں اور ہزاروں میل کی مسافت طے کرتی ہیں۔ ایک سے ایک الگ ہو جاتی ہے۔ قسم قسم کے باغات اور رنگا رنگ کی وادیوں میں جا نکلتی ہیں لیکن وہ کبھی اس فضائے رنگ و بو میں کھو نہیں جاتیں۔ وہ کلی کلی کا رس چوستی ہیں۔ اس تمام خارجی فضا کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہیں۔ لیکن اس عالم رنگ و تعطر میں، اس جہانِ کیف و کم میں، قلب کا رشتہ اپنے مرکز سے قائم رکھتی ہیں اور ہر ایک اپنی اپنی محنتوں کا سرمایہ، اپنی اپنی تگ و دو کا ماحصل امیرِ ملت کے قدموں میں ڈھیر کر دیتی ہے۔ یہی کیفیت ملّتِ اسلامیہ کی ہے۔

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ — نگاہِ اُو بشاخِ آشیانہ
مہ و انجم گرفتارِ کمندش — بدستِ اُوست تقدیرِ زمانہ

اس ملت کی صفات کیا ہوں گی؟

بباغاں عندلیبے خوش صفیرے — براغاں جرّہ بازے زود گیرے

یعنی

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر — شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ
عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

ہاں!

بباغاں عندلیبے خوش صفیرے — براغاں جرّہ بازے زود گیرے
امیرِ او بہ سلطانی فقیرے — فقیرِ او بہ درویشی امیرے

ایک زندہ و پائندہ قوم، جیتی جاگتی قوم، وہ قوم جس کے اعمالِ صالح کے درخشندہ نتائج دیکھ کر دنیا پکار اُٹھے کہ

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا — کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمالِ صدق و مروّت ہے زندگی ان کی — معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں سکندرانہ جلال — یہ اُمتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے۔

شکوۂ عید کا منکر نہیں ہوں میں لیکن — قبولِ حق ہیں فقط مردِ حق کی تکبیریں

مختلف تکبیروں میں کس قدر فرق ہے. فرماتے ہیں.

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن — مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

وحدتِ ملت مسلمان سے پوچھتے ہیں کہ

چیست ملت ایکہ گوئی لَا اِلٰہ — با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ
ذرّہا از یک نگاہی آفتاب — یک نگہ شو تا شود حق بے نقاب
مردہ‌ئی از یک نگاہی زندہ شو — بگذر از بے مرکزی پایندہ شو
وحدتِ افکار و کردار آفریں — تا شوی اندر جہاں صاحب نگیں

توحید نام ہی وحدت و یک نگہی کا ہے. تفرقہ قرآن کے نزدیک شرک ہے.

وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ○ ۳۰/۳۱-۳۲

مسلمانو! دیکھنا کہیں تم مشرکین میں سے نہ ہو جانا. یعنی ان لوگوں میں سے جو دین میں تفرقہ پیدا کر دیتے ہیں اور خود ایک فرقہ بن بیٹھتے ہیں. (پھر یہ حالت ہو جاتی ہے کہ) کہ ہر فرقہ اپنے اپنے مسلک میں مگن ہو جاتا ہے.

حضرت علیؓ کا قول ہے۔

اِيَّاكُمْ وَالتَّفْرُقَةَ. فَاِنَّ الشَّاذَّ مِنَ النَّاسِ لِلشَّيْطَانِ كَمَا اِنَّ الشَّاذَّ مِنَ الْغَنَمِ لِلذِّئْبِ. اِلَا! مَنْ دَعَا اِلٰى هٰذَا الشِّعَارِ فَاقْتُلُوْهُ. وَلَوْ كَانَ تَحْتَ عِمَامَتِيْ هٰذَا.

ہمیشہ تفرقہ سے بچو یاد رکھو جو شخص ملت سے کٹ کر تنہا رہ جاتا ہے وہ اسی طرح شیطان کا شکار ہو جاتا ہے جس طرح ایک بھیڑ گلے سے جدا ہو کر بھیڑیئے کا شکار ہو جاتی ہے! دیکھو! جو شخص تمہیں اس شعار کی طرف دعوت دے اسے قتل کر ڈالو خواہ وہ سر پر سے ہی عمامہ کے نیچے کیوں نہ ہو۔

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

نبی اکرمؐ نے فرمایا۔

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ فَإِنَّهُ مَنْ شَذَّ شَذَّ فِي النَّارِ

ہمیشہ جماعت کے ساتھ رہو۔ جو جماعت سے الگ ہوا سیدھا جہنم میں گیا۔

ہر کہ از بندِ خودی وارست مُرد ہر کہ با بیگانگاں پیوست مُرد

ایسے مسلمان جو ملتِ اسلامیہ سے اس لئے برگشتہ ہو جاتے ہیں کہ یہ نکبت و ادبار کے نرغے میں آچکی ہے۔ یہ دورِ انحطاط سے گزر رہی ہے۔ اس میں کوئی جاذبیت نہیں رہی۔ انہیں مخاطب کر کے فرماتے ہیں ــــ اور سنیئے کہ کس دلگداز پیرایہ میں فرماتے ہیں کہ:۔

کس شاخے کہ زیر سایۂ او پر برآوردی چوں برگش ریخت از وے آشیاں برداشتن ننگ است

ملتِ اسلامیہ کا وہ شجرِ مقدس جس کے سایہ میں تم پروان چڑھے جس نے تمہارے جیسے بے بال و پر ناتواں کو وہ بازوئے شاہیں عطا کئے جس سے تمہاری بلندیٔ پرواز کی داستانیں زبان زدِ خلائق ہو گئیں۔ اگر آج اس درخت پر خود تمہاری ہی بدولت خزاں کا دور آ گیا ہے تو اسے چھوڑ کر کسی اور سرسبز ٹہنی پر جا بسیرا کرنا دنیائے خودداری میں بڑی ہی گری ہوئی بات ہے۔ مسند امام احمد حنبلؒ کی ایک روایت ہے۔

قَالَ صلعم أَنَا آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ اللّٰهُ أَمَرَنِي بِهِنَّ اَلْجَمَاعَةُ وَالسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ وَالْهِجْرَةُ وَالْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَإِنَّهُ مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ شِبْرًا فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ

مِنْ عُنُقِہٖ۔ قَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ۔ وَ اِنْ صَامَ وَ صَلّٰی. قَالَ وَ اِنْ صَلّٰی وَ صَامَ وَ زَعَمَ اِنَّہٗ مُسْلِمٌ۔

حضورؐ نے فرمایا میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے جماعت (کے ساتھ رہو) (حکمِ امیر) سنو اور (اس کی) اطاعت کرو (ضرورت پڑے تو اپنی عزیز ترین چیزوں کو بھی) چھوڑ دو اور اللہ کے راستے میں جہاد کے لئے نکل کھڑے ہو۔ یاد رکھو جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر بھی الگ ہوگیا اسلام کا پٹہ اس کے گلے سے اتر گیا عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! خواہ وہ روزے رکھتا ہو اور نمازیں پڑھتا ہو (پھر بھی اسلام سے خارج ہو جائے گا)۔ فرمایا ہاں! خواہ وہ نمازیں پڑھتا ہو اور روزے رکھتا ہو اور بزعمِ خویش اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو (دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا)۔

اس لئے کہ

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو ناآشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ
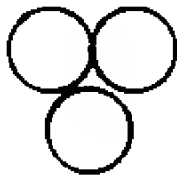
اقبالؒ کا پیغام نوجوانانِ ملت کے نام

عرصہ کی بات ہے. میں کسی کام کے لئے عجلت میں تھا اس لئے بازار میں تیزی سے جارہا تھا کہ ایک بوڑھے آدمی سے میرا کھوا چھل گیا. میں فوراً رُکا اور اس مردِ بزرگ سے معذرت چاہی. اس نے شفقت اور طنز کے ملے جلے لہجہ میں کہا "کوئی بات نہیں بیٹا! یہ عمر کا تقاضا ہے. جب ہم تمہاری عمر کے تھے تو آدمی تو ایک طرف دیواروں تک کو مونڈھے مار کر چلا کرتے تھے" اس واقعہ کو ایک عمر گزر گئی لیکن اس پیر دانا کی بات آج تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے. جوانی کے زمانے میں چونکہ فطرت کو قوائے جسمانیہ کی نشوونما مقصود ہوتی ہے اس لئے وہ خون میں بجلیاں بھر کر رکھ دیتی ہے جس سے نوجوان چلتا نہیں، دوڑتا ہے. اُٹھتا نہیں پھاندتا ہے. بیٹھتا بھی ہے تو کبھی نچلا نہیں رہتا۔ حرکت ۔ حرکتِ پیہم ۔ مسلسل حرکت. یہ ہے جوانی کی نشانی، عمر کے ایک درجہ تک یہ سلسلۂ نشوو بالیدگی جاری رہتا ہے. اس کے بعد یہ ترقی رُک جاتی ہے. لیکن اس کا ماحصل علیٰ حالہٖ قائم رہتا ہے. پھر انحطاط کا زمانہ آجاتا ہے جو جوانی کی گردن فرازی کو کنوئیں جھکوا دیتا ہے اور انسان د من نعمرہ ننکسہ فی الخلق — (بڑھاپے میں انسان کی حالت منکوس و منکوب ہوجاتی ہے) کی چلتی پھرتی تصویر بن جاتا ہے.

جوانی کی شعلہ فشانیاں

یہ تحوّل و تبدّل انسانی جسم تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اس کا اثر اس کے دل و دماغ پر بھی ہوتا ہے. جوانی میں جس طرح اس کا جسم ساکت نہیں رہ سکتا اسی طرح اس کے خیالات بھی جامد نہیں رہتے. ان میں بھی ہر آن ایک تبدیلی

پیدا ہوتی رہتی ہے۔ وہ "نچلے نہیں بیٹھتے" کبھی یہ اسکیم سوچتے ہیں کبھی اس پروگرام کے پیچھے چلتے ہیں یہ ہونا چاہیئے وہ نہیں ہونا چاہیئے۔ خیالات کیا کوندے کی لپک اور شعلے کی جھپٹ ہوتی ہے۔ ابھی یہاں ابھی وہاں۔ جس نوجوان کو دیکھو یہ کیفیت ہے کہ

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد   دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چوں نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روئے   تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے   سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

ان خیالات کی یہی برق رفتاری اور شعلہ پائی ان میں "تحیر انگیز" انقلابات کی صلاحیتیں پیدا کر دیتی ہے۔ اگر ان صلاحیتوں سے صحیح کام لیا جائے تو قوم کی اپنی تقدیر ہی نہیں بدلتی بلکہ زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں آجاتی ہیں۔ لیکن اگر انہیں سرکش دیباک چھوڑ دیا جائے تو ان کا ماحصل ایک بگولے کے رقص سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ جب تک وہ جوش و حرکت میں رہتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے شاید ایک نیا آسمان پیدا کر دے گا اور جب آنسوؤں کی طرح بیٹھ جاتا ہے تو زمین پر اپنا نقش تک بھی نہیں چھوڑتا۔ اور اس کے بعد یہی نوجوان، جو ابھی ابھی ایک شعلہ جوالہ تھا، انحطاطِ عمر کے زمانہ میں راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے جس میں نہ حرارت ہوتی ہے نہ حرکت۔ تبدیلیٔ احوال کے تصور سے اس کا دم گھٹتا ہے۔ انقلاب کے نام سے اس کی جان جاتی ہے۔ بے بسی کی قناعت اس کے نزدیک "شرافت کی زندگی" اور بیکسی کا سکون اس کے خیال میں بزرگی کا شیوہ بن جاتا ہے۔ وہ اپنے اس جمود و سکوت کی قبرستانی زندگی پر قانع نہیں ہوتا بلکہ خوش ہوتا ہے کہ

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

حرکت و جنبش اس کے نزدیک بچپن کی شام کاریاں اور تیز خرامی و سُبک سیری اس کے خیال میں جوانی کی تلون انگاریاں بن جاتی ہیں۔ پھر چونکہ عقل حیلہ جو انسان کو جھوٹے فریب سے مطمئن رکھنے کی کوشش کرتی ہے اس لئے

بڑھاپے کی سہل انگاری

وہ اس سکوت و جمود کی زندگی کو سنجیدگی اور ثقاہت کے بزرگانہ پیرہن میں پیش کر کے اس کی عدم حرکت کو تقدس کا جامہ پہنا دیتی ہے اور اس کے خیالات کے خدر و جمود کو تجربہ کی پختگی اور فکر

کی تکمیل قرار دے کر اسے "قطب" بنا دیتی ہے کہ ساری دنیا اپنی جگہ سے ہل جائے۔ لیکن یہ اپنے مقام سے نہ ٹلے۔ فکر و نظر کا یہی تعطل جب مذہب کی دنیا میں آتا ہے تو انسان اسے اسلاف پرستی اور تقلیدِ آباء کا مقدس نقاب اڑھا کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے۔ (اس میں شبہ نہیں کہ جس طرح بعض آدمیوں کے قوائے جسمانی اخیر عمر تک صحیح و سالم رہتے ہیں، اسی طرح ایسی صورتیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں جہاں انحطاطِ عمر کی برودت انسانی خیالات کی حرارتِ انقلاب کو ٹھنڈا نہیں ہونے دیتی۔ لیکن یہ صورتیں شاذ اور یہ شکلیں مستثنیات میں سے ہیں۔ کلیہ یہی ہے کہ من نعمرہ ننکسہ فی الخلق۔ عمر کی زیادتی سے حالت منکوس ہو جاتی ہے)۔ یہی وہ بڑے بوڑھے تھے جو صاحبِ ضربِ کلیم جناب موسیٰؑ جیسے کوہ تمثال و فرعون شکن داعئ انقلاب کی دعوتِ جہاد کے اولین مخاطب تھے۔ ان کی حالت یہ تھی کہ خدا کا یہ اولوالعزم پیغمبر انہیں بشارت دیتا ہے کہ یہ سرزمین تمہارے نام لکھی جا چکی ہے۔ اٹھو اور اس پر قابض ہو جاؤ۔ لیکن ان پر عافیت کوشی اور سہل انگاری کی افسردگی اس درجہ طاری ہو چکی ہے اور فریقِ مخالف کا خوف انہیں اس طرح چھلاوہ بن کر ڈراتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ

"صاحب! جب تک اس سرزمین میں بسنے والے وہاں موجود ہیں ہم وہاں قطعاً پاؤں نہیں رکھیں گے۔ تم اور تمہارا خدا جاؤ اور ان سے لڑو۔ ہم یہاں بیٹھے ہیں۔" (۵/۲۴)

نتیجہ اس کا یہ کہ اس قانونِ مشیت نے جس میں کسی کے لئے رعایت نہیں ہوتی فیصلہ کر دیا کہ۔ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ (۵/۲۶) یعنی جب ان کی یہ حالت ہے تو وہی سرزمین جو اُن کے لئے مقدر کر دی گئی تھی، اُن پر چالیس برس تک حرام کر دی گئی اور ان سے کہہ دیا گیا کہ جاؤ اس بیاباں میں سرگرداں پھرتے رہو۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ ان چلتی پھرتی لاشوں کو لئے لئے چالیس برس تک جنگلوں اور صحراؤں میں پھرتے رہے تا آنکہ اس قوم کے بڑے بوڑھے ایک

بنی اسرائیل

ایک کر کے اٹھ گئے اور وہ نوجوان جن کی تربیت شہروں کی غلام ساز فضا سے دور کوہ و بیاباں کی آزاد ہوا میں ہوئی تھی، نئے دماغ، نئی زندگی، نئی آرزوؤں کو اپنے دلوں میں لئے حضرت موسیٰؑ کے گرد پروانہ وار جمع ہو گئے (فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ (۱۰/۸۳) یہی وہ آہن گداز نوجوان تھے جو انقلابی تصورات کو دماغوں میں لئے بپھرے ہوئے شیروں کی طرح اُٹھے اور ہر مخالف قوت کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ نتیجہ یہ کہ وہی مغلوب و محکوم قوم جو کل تک نہایت

ذلیل و حقیر شمار کی جاتی تھی، قومِ غالب کے خزائن و دفائن اور تخت و تاج کی وارث بن گئی۔

ہندی مسلمان

تاریخ کے اوراق کو ساڑھے تین ہزار سال آگے الٹیے اور قومِ بنی اسرائیل سے ہندی مسلمانوں تک آپہنچیے۔ آپ دیکھیں گے کہ انیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کے اوائل میں یہاں کے مسلمانوں کی حالت بعینہٖ وہی ہو چکی تھی جس کا نقشہ قرآنِ کریم نے داستانِ بنی اسرائیل کی شکل میں کھینچا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شجرِ ملّت کی ہر شاخ پر افسردگی اور پژمردگی چھا چکی تھی۔ مدت ہائے دراز کی غلامی اور محکومی سے ان کے حوصلے پست، ہمتیں کمزور، افکار جامد، اعمال خامد، ارادے سقیم اور تمنائیں عقیم ہو چکی تھیں۔ ہر شعبۂ زندگی بساطِ بے نظام اور ہر فردِ کارواں ناقۂ بے زمام تھا۔ دماغ فکر سے عاری، دل سوز سے خالی، نگاہیں بے نور، قلوب بے حضور، قوم کیا، ایک راکھ کا ڈھیر تھی جسے مخالف ہوائیں جدھر چاہے اڑائے اڑائے پھر رہی تھیں۔

اقبالؒ

یہ تھا وہ زمانہ جس میں مبدارِ فیض کی کرم گستری نے اس قوم کو اقبالؒ جیسا مردِ خود آگاہ و خدا مست عطا کر دیا جس نے اپنی نفس گدازیوں سے اس مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک کر ان میں حیاتِ نو کے آثار پیدا کر دیئے اور اپنی شعلہ نوائیوں سے راکھ کے اس ڈھیر میں پھر سے زندگی کی چنگاریاں نمودار کر دیں۔ اس نے اپنے گردو پیش نظر دوڑائی تو اسے بالعموم وہی بڑے بوڑھے دکھائی دیئے جن میں تبدیلیٔ احوال کی صلاحیتیں ختم ہو چکی تھیں۔ اس لئے اسے سوچنا پڑا کہ وہ اپنے اس پیغام کو جس کا ایک ایک لفظ حشر بداماں اور ایک ایک حرف برق ساماں تھا، کس کے سامنے پیش کرے۔ لیکن اسے اس فیصلہ میں کچھ دقت نہ ہوئی، اس لئے کہ تاریخ کے اوراق، فلسفہ کے غوامض، انسانی ذہنیت کے مشاہدات اور قرآنِ کریم کے حقائق و معارف نے اس پر یہ حقیقت بے نقاب کر دی تھی کہ قوم کی تقدیر ہمیشہ ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوا کرتی ہے۔ ان نوجوانوں کے قلب و دماغ کی صلاحیتیں، ان کے گرم خون کی حرارتیں، ان کا زورِ بازو، ان کا جوشِ کردار، ایک کفِ بداماں سیلاب کی طرح اٹھتا ہے اور ہر ٹکرانے والی قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ قوموں کی تخلیقِ نو ان کے نوجوانوں کے کوہ شکن ارادوں کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ:-

جواں مردے کہ خود را فاش بیند — جہانِ کہنہ را بار آفریند
ہزاراں انجمن اندر طوافش — کہ او با خویشتن خلوت گزیند

اس لئے یہی وہ طبقہ تھا جسے اس نے اپنے تصوّرات کی آماجگاہ، اپنی امیدوں کا مرکز، اپنی تمناؤں کا محور اور قوم کے مستقبل کا مظہر قرار دیا اور اسی کو اپنے پیغاماتِ انقلاب آفریں کا درخورِ تخاطب سمجھا۔ انہی کے لئے وہ دعائیں مانگتے تھے کہ

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اور انہی کو اپنے سوز و گداز، تپش و خلش، تڑپ اور اضطراب کا وارث سمجھتے تھے۔ بالِ جبریل کے ساقی نامہ میں دیکھئے۔ جذب و کیف کی کس والہانہ بیتابی سے بحضورِ ربّ العزت ملتجی ہوتے ہیں کہ

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر — زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے — مرا عشق، میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں — مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں
اُمنگیں مری، آرزوئیں مری — امیدیں مری جستجوئیں مری
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے — لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

ان کی آرزو ہی یہ تھی کہ جس پیغامِ انقلاب انگیز کو وہ قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ نونہالانِ ملّت کے قلب کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو جائے تاکہ وہ وہاں سے زندہ آرزوؤں کا چشمہ بن کر اُبلے اور خیابانِ ملّت کو اس طرح سیراب کر دے کہ اس کی ایک ایک شاخ پھر سے شگفتہ و شاداب نظر آنے لگ جائے۔ اسی لئے وہ دعائیں مانگتے تھے کہ

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن — دارم از روزے کہ می آید سخن
بر جواناں سہل کن حرفِ مرا — بہرِ شاں پایاب کن ژرفِ مرا

تاریخی آثار و شواہد جو ان کے نورِ بصیرت سے ان کے سامنے بے نقاب ہوتے چلے جاتے تھے، اس حقیقتِ کبریٰ کو واضح کئے دیتے تھے کہ:

گرچہ اس دیرِ کہن کا ہے یہ دستورِ قدیم کہ نہیں میکدہ و ساقی و مینا کو ثبات
قسمتِ بادۂ مگر حق ہے اسی ملت کا انگبیں جس کے جوانوں کو ہے تلخابِ حیات

لیکن ان کے ہاں محض شاعرانہ جذبات نگاری نہ تھی بلکہ ان کی نگۂ حکمت و بصیرت زندگی کے حقائق کو پرکھتی اور ہر شے کو اس کے حقیقی مقام پر دیکھتی تھی۔ وہ دیکھتے تھے کہ صدیوں کی غلامی سے قوم ہلاکت و تباہی کے جس جذام میں گرفتار ہے، قوم کے نوجوان بھی اس کے مہلک جراثیم سے محفوظ نہیں رہے۔ جوانی کے پیمانے دن اور سال نہیں بلکہ کشمکشِ حیات میں عزم و استقامت سے سینہ سپر ہونے کی ہمت ہے۔ وہ دیکھتے تھے کہ اس معیار کے مطابق قوم کے تنومند جوان بھی پیرانِ کہن سال سے کچھ بہتر نہیں۔ اس لئے وہ ان کی عافیت کوشی اور سہل انگاری پر خون کے آنسو روتے تھے۔ وہ ان نرم و نازک پیکرانِ آب و گل کی طرف نہایت حسرت آمیز نگاہ سے دیکھتے اور سرد آہ بھر کر کہتے کہ

جوانانِ کہن سال

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالین ہیں ایرانی لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

یہی کج کلاہانِ ملت، قوم کے مستقبل کے آئینہ دار تھے۔ لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ ان کے قلوب، دولتِ یقین سے تہی مایہ، ان کی نگاہ نورِ بصیرت سے محروم، ان کے بازو قوتِ عمل سے بیگانہ اور ان کے دماغ تخلیقِ مقاصد کی متاعِ گراں مایہ سے عاری تھے۔ دیکھئے کہ وہ کس حسرت سے ان کے متعلق کہتے ہیں کہ

نوجواناں تشنہ لب، خالی ایاغ شستہ رو، تاریک جاں، روشن دماغ
کم نگاہ و بے یقین و ناامید چشمِ شاں اندر جہاں چیزے ندید
ناکساں، منکر ز خود مومن بغیر خشت بند از خاکِ شاں معمارِ دیر

ان کی زندگی بے مقصد، ان کے افکار پریشان، نہ کوئی متعین نصب العین، نہ منتہائے نگاہ۔ کبھی جذبات کی ان وادیوں میں مصروفِ جادہ پیمائی، کبھی امیال و عواطف کے ان صحراؤں میں مشغولِ انجمن آرائی۔ زندگی کے حقائق سے چشم پوشی اور مصافِ حیات سے گریز پائی۔

ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ ظلمت آبادِ ضمیرش بے چراغ
در جوانی نرم و نازک چوں حریر آرزو در سینۂ او زود میر

ایں غلام، ابنِ غلام، ابنِ غلام حریّت اندیشۂ اوراحرام
ایں زخود بیگانہ ایں مست افرنگ ناں جومی خواہد از دستِ فرنگ

لیکن ان کی یہ تادیب ایک طبیبِ مشفق کی تحقیق تھی، فیصلۂ عدالت کی تہدید نہیں تھی. ان کا ناوکِ تنقید ایک غمخوار جرّاح کی نوکِ نشتر تھی، دشمن کی سنانِ زہرآلود نہ تھی. ان کی تنبیہ ملّا کی نفرت انگیز لاحول نہ تھی. مادرِ مہرباں کی سیلی تھی کہ جس کی چوٹ بچے سے پہلے خود اپنے کلیجہ پر پڑے. یہ قہرآلود نگاہیں غصہ سے لال پیلی نہیں ہو رہی تھیں بلکہ دل کا خون تھا جو شدتِ غم سے آنکھوں میں کھنچ آیا تھا. وہ ان سہل انگار نوجوانوں کو دیکھتے تھے تو راتوں کی تنہائی میں اُٹھ اُٹھ کر روتے اور سسکیاں لے لے کر کہتے کہ

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

لیکن انہوں نے اسی لٹی ہوئی متاع کی فقط مرثیہ خوانی نہیں کی بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ یہ لٹی کیسے. جب تک یہ نہ بتا دیا جاتا، اس کے تحفظ و بقا کا انتظام کیسے کیا جا سکتا تھا؟

تاریخِ انسانیت پر نگاہ ڈالئے ایک مسلسل داستانِ صید و صیاد نظر آئے گی. ہر وہ شخص یا اشخاص کی جماعت جو کسی طرح قوت فراہم کر لیتی ہے کمزور انسانوں کو اپنی ہوس کام جوئی کا ذریعہ بناتی ہے. مختلف زمانوں میں اس قوت کے استعمال کے طریق بدلتے رہتے ہیں، روح ہمیشہ اور ہر جگہ وہی کارفرما رہی ہے. چونکہ عہدِ جاہلیت میں انسان کی عقلِ حیلہ جُو نے ابھی ایسی پُرکاری ہی نہیں سیکھی تھی اس لئے اس زمانہ کے اوزاروں اور ہتھیاروں کی طرح محکوموں کو پنجۂ استبداد میں جکڑے رکھنے کے حربے بھی کھردرے اور کند ہوتے تھے جنہیں ہر آنکھ مشہود دیکھ سکتی تھی اور ہر قلب محسوس کر سکتا تھا. لیکن جوں جوں انسانی

تعلیم کی اہمیت

عقلِ مکر و حیل میں ترقی کرتی گئی، آلات و ادواتِ حرب و ضرب کی طرح مغلوب قوموں کو ضعیفی و زبردستی کی نیند میں سلائے رکھنے کے اسباب و ذرائع بھی لطیف و غیر محسوس ہوتے چلے گئے. ان تمام ذرائع میں تعلیم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے. آپ جس قسم کی قوم بنانا چاہیں اس کے بچوں کو اسی قسم کی تعلیم دیتے جایئے. بلا مزید سعی و کاوش وہ قوم خود بخود آپ کے ذہنی سانچوں میں ڈھلتی جائے گی اور یہ تبدیلی کچھ اس طرح غیر مرئی طور پر ظہور پذیر ہو گی کہ اس قوم کو پتا تک

بھی نہ چلے گا کہ ہم میں کوئی تبدیلی پیدا کی جا رہی ہے جب انگریز ہندوستان میں آیا تو اس نے محسوس کر لیا کہ مسلمان ہی وہ قوم ہے جو اس تغلب و استبداد کے راستے میں روڑا بن سکتی ہے چنانچہ اس نے اس قوم کو اپنے مطلب کے مطابق بنانے کے لئے وہی غیر محسوس لیکن تیر بہدف نسخہ استعمال کیا جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اس نے اس قوم کا نظامِ تعلیم بدل دیا اور اس ایک تبدیلی سے تھوڑے سے عرصہ میں پوری کی پوری قوم بدل گئی۔

یہ تھی قومِ غالب کی وہ سحر آفرینی جو قومِ مسلم کی تبدیلیٔ احوال (یعنی تبدیلیٔ ذہنیت) کا موجب بنی تھی اور اس کی پردہ کشائی اس مردِ مومن کے پیشِ نظر تھی۔ اس باب میں وہ کہتے ہیں:۔

اک مردِ فرنگی نے کہا اپنے پسر سے | منظر وہ طلب کر کہ تری آنکھ نہ ہو سیر
بیچارے کے حق میں ہے یہی سب سے بڑا ظلم | برّے پہ اگر فاش کریں قاعدۂ شیر
سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر | کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو | ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب | سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

تعلیم بدل جانے سے نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے اور زاویۂ نگاہ بدلنے سے اشیاء کی اقدار بدل جاتی ہیں۔ جب اقدار بدل جائیں تو دنیا کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔

نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود | ایں زمین و آسماں دیگر شود

تعلیم بدل جانے سے قوموں کی ریل گاڑی کا کانٹا مڑ جاتا ہے۔ کانٹا مڑنے سے جب ریل گاڑی پٹڑی بدلتی ہے

تعلیم بدل دینے سے

تو دونوں پٹڑیوں میں غیر محسوس سا فرق ہوتا ہے لیکن اگر کانٹا موڑ دیا گیا ہو تو اس کے بعد پہئے کا ہر چکر گاڑی کو اس کی منزلِ مقصود سے دور لئے جاتا ہے۔ گاڑی کی حرکت بھی وہی ہوتی ہے اور رفتار بھی وہی لیکن جب آخر الامر دیکھا جائے تو گاڑی اور اس کی اصلی منزلِ مقصود میں بُعد المشرقین ہوتا ہے۔ یہی وہ غلط تعلیم تھی جس نے اتنی سی مدتِ قلیل میں پوری کی پوری قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان کائنات کی ہر شے کی صحیح قیمت جانے اور پھر اپنا مقام پہچانے۔ انسان، کائنات اور خالقِ کائنات کا باہمی تعلق کیا ہے۔ اسی کا نام علمِ صحیح اور دینِ قیم ہے۔ اگر یہ تعلق غلط خطوط پر متعین ہو جائے تو نظامِ انسانیت میں فساد ہی فساد برپا ہو جاتا ہے۔ مغرب نے خدا، انسان اور کائنات کے اقنومِ ثلاثہ میں سے سب سے بڑا رکن (خدا) پہلے ہی الگ کر دیا۔ علمِ انسانی کا

منتہی، تسخیرِ فطرت اور اس سے حاصل شدہ قوتوں کا اپنے تغلب و تسلط کے لئے استعمال قرار پایا۔ جب وہ اس تعلیم کو محکوم قوموں تک لائے تو تسخیرِ فطرت کے رموز و اسرار بھی ان کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھ لئے۔ جو کچھ باقی رہ گیا وہ بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ مغرب کے تفوق و برتری کو ذہنوں پر مسلّط کر دیا جائے اور اس جذبۂ مرعوبیت کے ماتحت ان کی کیفیت یہ ہو جائے کہ اپنی ہر قدر سے نفرت ہوتی جائے اور حاکم قوم کی ہر ادا میں شانِ محبوبیت جھلکتی نظر آئے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ قوم کی حالت یہ ہو گئی کہ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ کان اپنے ہیں لیکن سنتے ان کی قوتِ سماعت سے ہیں۔ آنکھیں اپنی ہیں لیکن دیکھتے ان کی بصارت سے ہیں، دل اپنے ہیں لیکن سمجھتے ان کی عقل کی روشنی سے ہیں۔ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ (۷/۱۷۹) یہ انسان نہیں بلکہ انسان نما حیوان ہیں۔ بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ نتیجہ یہ کہ ذہنوں میں افکارِ مستعار دلوں کے مقاصد دوسرے دل کے پیدا کردہ، نگاہوں کے زاویے اوروں کے متعین کردہ۔ زبان اِن کی ہے بات اُن کی۔ چراغ ان کا ہے رات ان کی۔ یہ تھی وہ تعلیم جس کے نتائج سے مردِ حق آگاہ کے کلیجے میں ہوک اٹھتی تھی، اور وہ اس آتشِ خاموش سے پھک کر جس نے اس کے مغزِ استخواں تک کو جلا دیا تھا، بے اختیار کہتا تھا کہ،

مکتب از مقصودِ خویش آگاہ نیست   تا بجذبِ اندرونش راہ نیست

نقش ما از جذبۂ دیں در ربود   از وجودش ایں قدر دانم کہ بود

شیخِ مکتب کم سواد و کم نظر   از مقامِ او نہ داد او را خبر

وہ نوجوانانِ ملت کی چلتی پھرتی لاشوں کو دیکھتا اور نم آلود آنکھوں سے کہتا کہ

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے   مُردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

وہ جب ان مدعیانِ علم و ہنر کو دیکھتا کہ ان جھوٹے نگوں کی میناکاری نے ان کی نگاہوں میں کس قدر خیرگی پیدا کر رکھی ہے تو وہ ایک خفیف سی ہنسی کے ساتھ جو درحقیقت اس کا خندۂ زخمِ نہاں ہوتا تھا۔ ان سے کہتا کہ فریبِ باطل پر یہ فخر و ناز کس لئے جب حقیقت یہ ہے کہ:۔

ترا وجود سراپا تجلّیٔ افرنگ   کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے خالی ہے

فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

احساسِ خودی اور خودنگری ہی شرفِ انسانیت کی اساس و بنیاد ہے اور اس تعلیم سے اسی کو فنا کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ حقیقت شناس نگاہ اس زہرِ ہلاہل کو کس طرح تریاق سمجھ سکتی ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ:۔

به آں مومن خدا کارے نہ دارد — کہ در تن جانِ بیدارے ندارد
ازاں از مکتبِ یاراں گریزم — جوانے خود نگہدارے ندارد

باسلوبِ دیگر :۔

اقبالؔ یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا — موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے — پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

وہ مکتب کے اس کارگہِ شیشہ گراں کو بہ ہزار عبرت و تأسف دیکھتے اور جب انہیں نظر آتا کہ ان نوجوانان نیک طینت و پاک سیرت کو جن کے فولادی جوہروں کو شمشیرِ بے نیام بننا تھا کس طرح "جاپانی کھلونے" بنایا جا رہا ہے تو وہ اک صدائے دردناک و الم انگیز سے کہتے ہیں کہ:۔

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

معاش کی دست نگری

پھر اتنا ہی نہیں کہ تعلیم کے اس نظام سے محکوم قوموں کے افراد کی خودی ہی کو فنا کیا جاتا ہے بلکہ قیامت بالائے قیامت کہ قوتِ حاکمہ رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں رکھ کر محکوم قوم کے صالح عنصر کو اس درجہ اپاہج اور مفلوج بنا دیتی ہے کہ وہ معاش تک کے لئے ان کی دستِ نگر ہو جاتی ہے اور پھر اس کے بعد جو کچھ جی میں آئے اُن سے بآسانی کرا لیا جا سکتا ہے۔ یہ انسانی ذلت و پستی کی وہ انتہا ہے جس کا احساس ہر قلبِ حساس کو طلسمِ پیچ و تاب بنائے رکھتا ہے۔ اسی انسانیت کش منظر کو دیکھ کر اس حکیمِ امت کا خون کھولنے لگتا ہے اور وہ درد و کرب کی انتہائی بیتابیوں کے ساتھ آہِ سرد بھر کر کہتا ہے کہ

جوانے خوش گلے رنگیں کلاہے — نگاہ او چو شیراں بے پناہے
بہ مکتب علمِ میشی را بیاموخت — میسر نایدش برگِ گیاہے

کس قدر قیامت ہے کہ ابنِ آدم کو خودی جیسی متاعِ بے بہا کے بدلے روٹی کا ٹکڑا تک بھی

میسر نہ ہو۔ اس کا سرمایہ کو نین چھین لیا جاتے اور اس کے معاوضے میں اسے دو کفِ جو تک نہ مل سکے۔

نوا از سینۂ مرغِ چمن برد　　　ز خونِ لالہ آں سوزِ کہن برد
بایں مکتب بایں دانش چہ نازی　　　کہ ناں درکف ندادو جاں ز تن برد

اسی لئے وہ اس نظامِ تعلیم و تربیت کو ملک الموت قرار دیتے ہیں۔ ضربِ کلیم میں مدرسہ کے عنوان سے لکھتے ہیں:

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے　　　قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا　　　زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش
اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا　　　جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش
فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا　　　جس نے رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش
مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو　　　خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

اور اس کی ذمہ دار صرف وہ تعلیم نہیں جو مدرسوں اور کالجوں میں کتابوں کے ذریعے دی جاتی ہے بلکہ وہ

تہذیبِ عصرِ حاضر

تہذیب ہے جو عصرِ حاضر کا طرۂ امتیاز ہے اور جس نے ساری دنیا کو یوں جہنم زار بنا رکھا ہے۔ اسی کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ

جواناں را بد آموز است ایں عصر　　　شبِ ابلیس را روز است ایں عصر
بداماننش مثالِ شعلہ پیچم　　　کہ بے نور است و بے سوز است ایں عصر

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؒ تہذیبِ مغرب کے اس قدر مخالف کیوں تھے۔ کیا یہ مخالفت ملاّ کی وہ قدامت پرستی تھی جس کی رُو سے ہر نئی چیز دوزخ میں پھینک دینے کے قابل ہوتی ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ حضرت علامہ کے نزدیک ایک جوئے رواں ہے جس کا کسی مقام پر بھی تھم جانا اس کی موت ہے اس لئے جمود و تعطل ان کے نزدیک فطرت کے ضابطۂ قوانین میں جرمِ عظیم ہے جس کی سزا مرگِ مفاجات ہے۔ بنا بریں وہ علمی عروج اور ذہنی ارتقاء کے کس طرح مخالف ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا تہذیبِ مغرب سے ان کی مخالفت اور نفرت کی وجہ قدامت پرستانہ تعصب نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تہذیبِ مغرب باطل کی بنیادوں پر استوار ہے۔ اس لئے ہر نگہ حق شناس اس میں فسادِ آدمیت کا جہنم مضمر دیکھے گی اور اس کی مخالفت کرے گی۔ تہذیبِ مغرب کیا ہے اور یہ کس طرح

باطل کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے. حق کی بنیادیں کیا ہیں اور ان بنیادوں پر کس قسم کا قصرِ تہذیب تعمیر ہو سکتا ہے. ان سوالات کا جواب تفصیل طلب ہے اس لئے اس مقام پر اس سے بحث نہیں کی جا سکتی. اس مقام پر صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ کسی قوم کی تہذیب درحقیقت اس کے فلسفۂ زندگی اور تصورِ حیات کی محسوس مظہر ہوتی ہے. اس لئے جب ہم کسی قوم کی تہذیب سے بحث کرتے ہیں تو دراصل یہ بحث اس قوم کے فلسفۂ حیات سے متعلق ہوتی ہے.

مغربی فلسفۂ حیات

تہذیبِ مغرب کی بنیاد زندگی کے میکانکی تصور (MECHANISTIC CONCEPT OF LIFE) پر ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ زندگی مادّہ کے طبیعی ارتقاء (PHYSICAL EVOLUTION). سے کسی نہ کسی طرح ظہور میں آگئی ہے اور جسمِ انسان ایک مشینی حرکت سے اسے قائم رکھ رہا ہے. مرورِ زمانہ سے جب یہ حرکت بند ہو جائے گی تو زندگی ختم اور انسان نسیاً منسیاً ہو جائے گی. وَ قَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَ نَحْیَا وَ مَا یُهْلِکُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ (۴۵/۲۴) اور یہ کہتے ہیں کہ یہی طبیعی زندگی ہے. ہم اب زندہ ہیں. عناصر کا شیرازہ بکھر جانے سے مر جائیں گے اور اس طرح مرورِ زمانہ ہمیں ختم کر دے گا. لہٰذا نہ انسانی تخلیق کا کوئی مقصد ہے نہ اس کے سفرِ حیات کا کوئی منتہیٰ.

در نگاہش آدمی آب و گل است کاروانِ زندگی بے منزل است

اس تصورِ زندگی کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی عزائم و اعمال کا معیار انفرادی اغراض یا زیادہ سے زیادہ افراد کے مجموعہ یعنی قوم کے مفاد کا حصول قرار پاگیا. مستحسن اعمال وہ جن سے افراد کو دولت و حشمت اور اقوام کو غلبہ و تسلّط حاصل ہو جائے خواہ اس کے لئے کیسے ہی حربے کیوں نہ استعمال کرنے پڑیں. جائز و ناجائز کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں انسان اپنے اعمال کے لئے کسی اقتدارِ اعلیٰ (HIGH OTHORITY). کے سامنے جواب دہ ہو. یہاں افراد زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے سامنے ذمّہ دار ہوتے ہیں. اس لئے ان کے نزدیک جائز وہ جس سے قومی مفاد کا تحفظ ہو. قوم اپنے سے اوپر کسی اقتدارِ اعلیٰ کے سامنے ذمّہ دار نہیں ہوتی اس لئے وہاں جائز و ناجائز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا. اس نظامِ تمدّن و معاشرت کا فطری نتیجہ جنگل کا قانون ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس". اس نظام نے دنیا کو کیا دیا. اس کے لئے اب کسی تحقیقاتی کمیشن

کی رپورٹ کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کے نتائج ساری دنیا کے سامنے ہیں اور، اور تو اور، خود اس تہذیب و تمدن کے علمبردار اس کے ہاتھوں اس قدر تنگ آچکے ہیں کہ وہ اس جہنم سے نکلنے کی راہیں تلاش کر رہے ہیں۔ لیکن انہیں نجات کی صورت نظر نہیں آتی۔ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ مشہور مفکر پروفیسر میسن (MASON) اپنی کتاب (CREATIVE FREEDOM) میں لکھتا ہے کہ

> ہم نے اپنے زمانہ کی ابتدا ر سائنس کی کاریگری سے کی اس وثوق کے ساتھ کہ مادی کامرانیاں زندگی کے عقدوں کو حل کر دیں گی۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم غلطی پر تھے۔ زندگی کے مسائل کچھ ایسے سہل نہیں۔

اور فرانسیسی مفکر (RENE GUENON) لکھتا ہے کہ

> عہدِ حاضر کی تہذیب رفتہ رفتہ تنزل کی طرف گرتی گئی ہے حتیٰ کہ یہ انسان کے پست ترین عناصر کی سطح پر جا کر رک گئی ہے۔ اس کا نصب العین اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانی فطرت کے محض مادی گوشے کے تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کیا جائے۔ یہ نصب العین خود ایک فریب ہے..... جو لوگ مادہ کی وحشی قوتوں کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں وہ خود انہی قوتوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتے ہیں..... مغرب کے غرق ہو جانے کا خطرہ سر پر ہے۔ وہ خود تو ڈوبے گا ہی لیکن اپنے ساتھ تمام نوعِ انسانی کو بھی اپنے منتشر افکار و اعمال کے گرداب میں غرق کر دے گا۔

(THE CIVILIZATION OF THE MODERN WORLD)

غور کیجئے کہ اس تہذیبِ نو کے علمبردار خود اس کے ہاتھوں کس درجہ نالاں ہیں اور پھر سوچئے کہ جس دانائے راز کی فراستِ ایمانی اور بصیرتِ قرآنی نے اس کے سامنے ان حقائق کو بے نقاب کر دیا تھا اس نے کس قدر صحیح کہا تھا کہ:۔

بیا کہ سازِ فرنگ از نوا بر افتاد است درونِ پردۂ او نغمہ نیست فریاد است

یہ نتائج جن کو دیکھ کر یورپ کے مفکر اور اربابِ سیاست و تمدن یوں چیخ اٹھے ہیں، کوئی ہنگامی حادثہ اور اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ فطری نتیجہ ہیں اس تہذیب کا جس کی بنیادیں باطل پر استوار ہیں۔ چنانچہ تاریخ تہذیب کا مشہور عالم (BRIFFAULT) اپنی کتاب (THE MAKING OF HUMANITY)

میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی قانون جس کی بنیاد باطل کے اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس باطل نظام کو کیسے ہی تدبر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری خارجی نظم و ضبط اور ادھر اُدھر کی مرمّت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لئے تباہی مقدّر ہے۔

اس نہج زندگی اور آئینِ حیات نے خود یورپ کے نوجوان طبقہ پر کیا اثر کیا، اس کے متعلق کسی مشرق کے دقیانوسی فرسودہ خیال کی زبان سے نہیں بلکہ مغرب کے مبصر ڈاکٹر جوڈ کے الفاظ میں سنئے وہ لکھتا ہے۔

ہمارا نوجوان طبقہ شاہراہِ زندگی پر بلا تعیّنِ مقصد چلا جا رہا ہے۔ انہیں کچھ علم نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ بلکہ یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم چل ہی کیوں رہے ہیں۔ نہ ان کے سامنے کوئی ضابطۂ زندگی ہے نہ آئینِ حیات، نہ اقدار ہیں نہ معیار۔

اس بلا مقصد و معیار زندگی کا نتیجہ کیا ہے۔ اس کے متعلق مشہور فلسفی پسکال (PASCAL) نے لکھا ہے کہ

انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے اور اس طرح انسان کا ارادہ بھی کسی نہ کسی سے محبّت کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جب اسے ایمان اور محبّت کے لئے کام کی باتیں نہیں ملتیں تو وہ بے کار اور خراب مقصد پر ریجھ جاتا ہے۔ خلا قدرت کے کارخانے میں محال ہے۔ انسان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگ جاتا ہے اور اچھے نصب العینوں سے دستکش ہو جائے تو بُرے راستے اسے خوش آتے ہیں۔

مشفقانہ پُکار جو کچھ یورپ کے نوجوانوں کے ساتھ ہوا اس سے کہیں بدتر ہمارے نوجوان طبقہ پر گزری۔ یہ تھا وہ جہنّم جس سے بچانے کے لئے حضرت علاّمہ نے نونہالانِ ملّت کو پکارا اور اپنے دل کی انتہائی گہرائیوں میں ڈوب کر پکارا کہ وہ غمگسارِ ملّت جانتا تھا کہ ان کی تباہی سے قوم تباہ ہو جائے گی اور ان کے سنبھلنے سے ملّت کا مستقبل سنبھل جائے گا۔ اس لئے اس نے نہایت محبّت اور شفقت سے انہیں اپنے قریب بلایا اور کہا کہ

اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شُما   چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما

غوطہ ہا زد در ضمیرِ زندگی اندیشہ ام تا بدست آوردہ ام افکارِ پنہانِ شُما
مہر و مہ دیدم نگاہم برتر از پرویں گزشت ریختم طرحِ حرم، در کافرستانِ شُما
حلقہ گردِ من زنید اے پیکرانِ آب و گل آتشے در سینہ دارم از نیاگانِ شُما

انہوں نے کہا کہ میں اپنی قوم کی تہی مائیگی سے واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ان کے پاس نہ ساز و یراق ہے نہ ذرائع و اسباب۔ لیکن یاد رکھو! قوم کی حالت نگاہ کی تبدیلی سے بدلا کرتی ہے۔ خارجی انقلاب ہمیشہ دل کے انقلاب کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ اس لئے اسباب و ذرائع کی کمی اور متاع و منال کے فقدان سے مت گھبراؤ۔

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشتِ پرے داری
بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

پہلے اپنی نگاہوں میں تبدیلی پیدا کرو۔ دل میں قوتِ ایماں، نگاہوں میں نورِ بصیرت، بازوؤں میں جوششِ کردار، سامنے حق و صداقت پر مبنی نصب العین اور دماغ میں اس کے حصول کا ولولہ۔ اس ساز و سامان کو لے کر نکلو۔ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى (۳۴/۴۶) اپنے اللہ کے لئے ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ اور حالات و کوائف نے تمہیں جس منزل میں رکھا ہے وہیں سے حصولِ مقصد کی ابتدا کر دو۔

آفریدند اگر شبنم بے مایہ ترا خیز و بر داغِ دلِ لالہ چکیدن آموز
اگر خارِ گُلِ تازہ رسے ساختہ اند پاسِ ناموسِ چمن دار و خلیدن آموز
باغباں گز خیابانِ تو برکند ترا صفتِ سبزہ دگر بار دمیدن آموز
تا کجا در تہِ بالِ دگراں می باشی در ہوائے چمن آزادہ پریدن آموز

اس مردِ حقیقت شناس نے ان کے سامنے آئینِ فطرت کا یہ عظیم الشان راز فاش کر کے رکھ دیا کہ قوموں کی کامیابی اور کامرانی کا انحصار نوجوانانِ ملت کی سیرت (کیریکٹر) پر ہے۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

اس لئے کہ انہیں محکم یقین تھا کہ

اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

وہ انہیں مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کرنے کی تلقین کرتا تھا اور اس لئے انہیں متنبہ کرتا تھا کہ

نہیں ہنگامۂ پیکار کے لائق وہ جواں — جو ہوا نالۂ مرغانِ سحر سے مدہوش
مجھ کو ڈر ہے کہ ہے طفلانہ طبیعت تیری — اور عیار ہیں یورپ کے شکر پارہ فروش

وہ انہیں برملا کہتا تھا کہ قوموں کی تقدیریں سہل انگاری اور عافیت کوشی سے نہیں بدل جایا کرتیں سلطنتیں ریزولیوشنز پاس کرنے سے نہیں بلکہ ریزولیوشن (عزمِ راسخ) پیدا کرنے سے ملا کرتی ہیں تاج و شکوہِ خسروی کے معاملے چمن زاروں میں طے نہیں ہوا کرتے۔

تختِ جم و دارا سر راہے نفروشند — این کوہ گراں است بکاہے نفروشند
با خونِ دلِ خویش خریدن دگر آموز

وہ جانتے تھے کہ غلط تعلیم و باطل تہذیب کے اثرات نے ان جوانوں کے جوہر مردانگی کو سلب ان کے افکار کو آوارہ، ان کی نگاہوں کو پریشاں اور ان کے قوائے عملیہ کو مضمحل کر رکھا ہے۔ اس لئے وہ قوم کے اربابِ مسانید و فتاویٰ اور صاحبانِ دعوت و ارشاد کی توجہ اس نقطۂ ماسکہ کی طرف مبذول کراتے اور ان سے بار بار تاکید کرتے کہ

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ — مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت — دے ان کو سبق خود شکنی و خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے — مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی — دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

اس لئے ان کی پریشاں نظری دور ہو جانے سے ان کے سامنے وہ درخشندہ نصب العین حیات بے نقاب ہو جائے گا۔ جس کا حصول ملتِ اسلامیہ کا منتہیٰ اور تکمیلِ شرفِ انسانیت کی معراج ہے۔ نصب العین کی صداقت اور اس پر محکم یقین انسانوں کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر دیتا ہے۔ اس سے اس کے جگر بن خون خون میں حرارت اور حرارت میں وہ شعلۂ صفتی پیدا ہو جاتی ہے جو باطل کے ہر خس و خاشاک پر برقِ خاطف بن کر گرتی اور اُسے راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیتی ہے۔ یہی وہ "عقابی روح" ہے جس کی بیداری میں امتوں کی حیاتِ تازہ کا راز پوشیدہ ہے۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں — نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

نہ ہو نومید نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے	امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں!
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر	تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

شاہین زادگان

حضرت علامہ نے اپنے کلام میں جہاں جہاں شاہیں کو مخاطب کیا ہے، اس سے مقصود قوم کا جسور و غیور نوجوان ہے۔ اس طبقہ کی صلاحیتوں سے وہ کبھی نا امید نہیں ہوئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے ممکنات کی وسعتیں کس قدر حدود فراموش اور قیود نا آشنا ہیں۔ دیکھئے۔ یہ امیدوں کا شاہزادہ کس قدر شگفتہ و شاداب انداز میں اس کا ذکر کرتا ہے جب کہتا ہے کہ:۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے	ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

یہ نم کیا تھا۔ بس اسی میں اقبالؒ کے پیغام کا سارا راز مضمر ہے۔ مغرب اپنے موجودہ نظامِ تمدن و معاشرت کے ہاتھوں جگر فگار ہے۔ لیکن چونکہ اس کے سامنے حقائقِ ابدی کا کوئی ضابطہ نہیں اس لئے اسے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس غارت گرِ امن و عافیت و رہزنِ متاعِ شرفِ انسانیت۔ تہذیب کی تخریب کے بعد نظامِ انسانیت کو کن جدید بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ لیکن حضرت علامہ کے سامنے تو حقائقِ ابدی کا وہ ضابطۂ آئین و دستور کھلا رکھا تھا جس میں شرفِ انسانیت کے تقاضوں کی

علاج

تسکین کا سامان موجود ہے۔ اس لئے انہیں امتوں کے مرضِ کہن کا علاج تجویز کرنے میں کچھ دقت نہ تھی۔ انہوں نے مریض کی نبض پر انگلیاں رکھیں اور اپنے یقین کی پختگی کے ساتھ اعلان کر دیا کہ:۔

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی	علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

ملت کی کشتِ ویراں کا نم اسی آبِ نشاط انگیز سے حاصل ہونا تھا جسے قرآن کہتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے ملت کے نوجوانوں سے پوری قوت اور شدت سے کہا کہ یورپ آوارہ نظر اور پریشاں نگاہ ہے۔ اس لئے تمہیں اس کی تقلید سے کیا حاصل ہوگا۔ تمہارے صحنِ چمن میں تہذیب و تمدن کا وہ شجرِ طیب سایہ فگن ہے جس کی جڑیں حقائقِ ابدی کی گہرائیوں میں اور جس کی شاخیں کہکشاں گیر ہیں۔ شَجَرَةٌ طَيِّبَةٌ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ۔ جو زمان و مکان کی حدود سے ماوراء اور مشرق و مغرب کی ثغور سے بے نیاز ہے۔ لَا شَرْقِيَّةٍ وَّ لَا غَرْبِيَّةٍ۔ جس کے برگ و بار

کی تازگی و شگفتگی پر ہزاروں جنتیں نچھاور اور لاکھوں بہاریں تصدق ہیں اور جسے دیکھ کر باغبانِ فطرت فرطِ مسرت سے والہانہ انداز میں جھوم اٹھتا ہے اور حاسدوں کے دل پر سانپ لوٹنے لگ جاتے ہیں یُعۡجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الۡكُفَّارَ (۴۸/۲۹) تم اس سدا بہار شجرِ مقدس کی شاخ سے گر پڑے ہو۔ تمہیں تو صرف اتنا کرنا ہے کہ پھر سے اسی شاخ سے پیوست ہو جاؤ۔ زندگی کی تمام تازگیاں تمہارے رگ و پے میں سرایت کر جائیں گی اور کامیابیوں کے پھول اور کامرانیوں کے خوشے اس کا ماحصل ہوں گے۔

دگر بشاخِ گل آویز و آب و نم بر کش — پریدہ رنگ ز بادِ صبا چہ می جوئی

بس اس کے لئے کرنا یہ ہے کہ مغرب کی باطل افروز تہذیب اور انسانیت سوز نظریۂ زندگی کا جو رنگ تمہارے قلب و نظر کو آلودہ کر چکا ہے، اسے الگ کر دو۔ یہ حصہ لَآ اِلٰہَ ہے۔ اس کے بعد اس یقین کو دل کی گہرائیوں میں جگہ دے دو کہ قرآن تکمیلِ شرفِ انسانیت کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ حصہ اِلاَّ اللہ ہے۔ لا اور اِلاَّ کے اس مجموعہ سے تمہاری داستانِ حیات نئے سرے سے مرتب ہو جائے گی۔

اے اسیرِ رنگ، پاک از رنگ شو — مومنِ خود کافرِ افرنگ شو

اس ایمان سے تمہاری نگاہ کا زاویہ بدل جائے گا اور جب نگاہ کا زاویہ بدل جائے گا تو ساری دنیا بدل جائے گی۔ یہ ہے اقبالؒ کا پیغام نوجوانانِ ملت کے نام۔ وہ پیغام جسے انہوں نے "پیامِ مشرق" میں پندِ باز با بچۂ خویش کے استعارے میں ان الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ شاہین اپنے بچے کو نصیحت کرتا ہے کہ

تو دانی کہ بازاں ز یک جوہر اند — دلِ شیر دارند و مشتِ پر اند
نکوشیوہ و پختہ تدبیر باش — جسور و غیور و کلاں گیر باش
میامیز با کبک و تورنگ و سار — مگر ایں کہ داری ہوائے شکار
شد آں باشہ نخچیرِ نخچیرِ خویش — کہ گیرد ز صیدِ خود آئینِ کیش
نگہ دار خود را و خورسند زی — دلیر و درشت و تنومند زی
چہ خوش گفت فرزندِ خود را عقاب — کہ یک قطرۂ خوں بہتر از لعلِ ناب
ز دستِ کسے طعمہ خود مگیر — نکو باش و پندِ نکویاں پذیر

قوم کے جس نوجوان میں یہ سیرتِ فولاد پیدا ہو جائے وہی قوم کی امیدوں کا سہارا اور اس کے

آسمانِ مستقبل کا درخشندہ ستارہ ہے۔

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا — شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر — اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری
عجب نہیں ہے اگر اس کا سوز ہے ہمہ سوز — کہ نیستاں کے لئے بس ہے ایک چنگاری
خدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی — کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کرّاری
نگاہِ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو — یہ بے کلاہ ہے سرمایۂ کلہ داری

لیکن اقبالؒ نے یہ سب کچھ اس زمانہ میں کہا جب قوم کو حصولِ مقصد کے لئے تیار کیا جانا مقصود تھا۔ یہ مقصد بھی وہی تھا جسے اس مردِ مومن نے ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر قوم کے سامنے پیش کیا تھا اور جو بعد میں پاکستان کے درخشندہ و محبوب تصوّر کی صورت میں وجہ شگفتگیٔ قلب و نگاہ ہوا۔ اس وقت قوم کے نوجوانوں کے ذمّہ صرف یہ فریضہ تھا کہ وہ اس سرزمین کو جوان کے لئے مقدّر ہو چکی تھی، انگریز اور ہندو کے قبضہ سے نکال کر اپنے حیطۂ اقتدار میں لے آئیں۔ وہ مقصد حاصل ہو گیا۔ لیکن اب نوجوانانِ ملّت کے سامنے اس سے کہیں بلند و بالا اور اشد و اہم فریضہ آ گیا اور وہ فریضہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ خدا کی جو زمین انہیں اس طرح حاصل ہو گئی ہے۔ اس میں خدا کے

پاکستان کا نوجوان

اس ابدی قانون کو رائج کریں جس کے اتّباع میں شرفِ انسانیّت کے ارتقاء کا راز پوشیدہ ہے۔ یہ کام قوم کے نوجوانوں کے ہاتھ سے سرانجام پائے گا۔ وہ پیرانِ کہن جنہوں نے اپنی زندگیاں ایک خاص نہج و اسلوب پر بسر کی ہیں اور ان کی عادات و امیال انہی روشوں پر پختگی حاصل کر چکی ہیں۔ ان کے لئے مشکل ہی نہیں (بعض اوقات) ناممکن ہوتا ہے کہ وہ ان قالبوں کو توڑ سکیں جس میں ان کے پیکر ڈھل چکے ہیں۔ دنیا کے نظامِ کہن کی جگہ جہانِ نو کی تعمیرِ قوم کے نوجوانوں کی قوّتِ بازو ہی سے ممکن ہے۔ اس لئے اقبالؒ کی روح آج پاکستان کے ہر نوجوان سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے

اور جو سعادت مند اس کی اس دعوتِ حیات بخش پر لبیک کہے اس کے لئے پیغام یہ ہے کہ:-

ہو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی تڑپ | پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار | اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار | تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب | تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار وہ
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار وہ

(اپریل ۱۹۵۰ء)
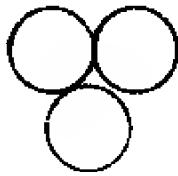
ضربُ الکلیم

[ڈاکٹر عبدالوہاب عزام مصر کے نہایت جلیل القدر اہلِ علم تھے۔ اقبالؒ سے انہیں والہانہ عشق تھا۔ جب وہ بطور سفیرِ مصر، پاکستان میں قیام پذیر تھے تو انہوں نے پرویز صاحب سے اقبال کا کلام لفظاً لفظاً سمجھا، جتنا کچھ وہ سمجھتے تھے اسے عربی (نظم) میں منتقل کرتے چلے جاتے تھے۔ اسی نہج سے انہوں نے ضربِ کلیم کا منظوم ترجمہ مکمل کر لیا تو اس کا پیش لفظ بھی پرویز صاحب ہی سے لکھوایا۔ اس پیش لفظ کا اُردو ترجمہ حسبِ ذیل ہے]

جس کتاب کا ترجمہ آپ کے پیشِ نظر ہے علامہ اقبالؒ نے اس کا نام ضربِ کلیم رکھا اور خود ہی اس کی تشریح ان الفاظ سے کردی۔

اعلانِ جنگ عصرِ حاضر کے خلاف

میرے نزدیک یہ الفاظ علامہ اقبال کی صرف ایک کتاب ضربِ کلیم ہی کے شارح نہیں بلکہ ان کے پورے کے پورے پیغام کے ایک عظیم حصے کے مفسر ہیں۔ اگر حضرت علامہ کے پورے پیغام کا تجزیہ کیا جائے تو وہ دو اہم حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک حصہ نفیرِ انقلاب ہے۔ اس "غیر منزّل من اللہ" اسلام کے خلاف جسے عجمی سازش نے نہایت سادگی اور پُرکاری سے وضع کیا اور دامِ ہمرنگِ زمین کی صورت میں عینِ اسلام بنا کر اس امت پر مسلط کر دیا جو ان غیر قرآنی تصورات کو مٹانے کے لئے مبعوث ہوئی تھی۔ عجم کی یہ سازش درحقیقت انتقام تھی یہود و نصاریٰ و مجوس کی ان شکستوں کا جو انہیں میدانِ جنگ میں مسلمانوں کی تیغِ حق کے مقابلے میں اٹھانی پڑیں۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ اس ملتِ مجاہدین کی

قوت وسطوت کا راز قرآن کی حیات بخش تعلیم میں ہے۔ لہٰذا انہوں نے ایسی چال چلی کہ مسلمانوں کو قرآن سے یکسر بیگانہ بنا کر غیر قرآنی اسلام کے فریب میں الجھا دیا اور یہ کچھ اس کامیاب طریق سے کیا کہ سادہ لوح مسلم اس سرابِ رنگ و بو کو سچ مچ کا گلستان سمجھنے لگ گیا۔ یونان کا خواب آور فلسفہ، حشیشیں، مجوس کی غلامانہ نسل پرستی، یہود کی قشری شریعتِ رسومات، رہبانِ نصاریٰ کی مرگ آفریں خانقاہیت ایک ایک کر کے اسلام کے لاینفک اجزا بن گئے اور اس طرح یہ ملت جو کبھی ذوقِ عمل سے شعلۂ جوّالہ تھی، کوتاہیٔ عمل سے راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ اقبالؒ کے پیغام کا ایک حصہ اسی "غیر منزّل من اللہ" اسلام کے لئے پیامِ مرگ اور قرآنی اسلام کے احیاء کے لئے نشیدِ حیات تھا۔

علامہ کے پیغام کا دوسرا حصہ اس فتنے کے خلاف احتجاجِ مسلسل تھا جو تہذیبِ مغرب کے رنگ میں طوفان در طوفان اُمڈے چلا آرہا تھا اور جس کی تموّج انگیز طغیانیاں ملتِ اسلامیہ کی نژادِ نو کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لئے جا رہی ہے۔ ضربِ کلیم اس تہذیبِ عصرِ حاضر کے جنود و عساکر کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔

سوال یہ ہے کہ تہذیبِ حاضر کہتے کسے ہیں اور اقبال نے اس کی اس قدر مخالفت کیوں کی؟ اس سوال کا جواب سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک پہلے یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ اسلامی تہذیب کیا ہے۔

جس شخص کے سامنے قرآن کے اوراق کھلے ہیں اس پر یہ حقیقت روشن ہے کہ اسلام ایک ضابطۂ حیات اور نظامِ زندگی ہے جسے الدّین کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن نے انسانی زندگی کے لئے ایک نصب العین مقرر کر دیا ہے اور اس کے ساتھ وہ حدود متعین کر دی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے انسان اپنے اختیارات کا استعمال کر سکتا ہے۔ یہ نصب العین اور حدود دونوں غیر متبدّل ہیں۔ انہی کو ابدی صداقتیں یا مستقل اقدارِ زندگی کہا جاتا ہے۔

اسلامی تہذیب

قرآن کی رُو سے، اگرچہ حیات کی نمود مختلف پیکروں میں ہوتی ہے لیکن حیات کا سرچشمہ ایک ہے اور یہی سرچشمہ ان ابدی صداقتوں کی اصل ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ سرچشمۂ حیات اور ابدی صداقتوں کے سرچشمہ کی وحدت کے عقیدے سے فطری طور پر یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ:۔

(د) ہر انسان من حیث الانسان زندگی کی ممکنات اپنی ذات میں مضمر رکھتا ہے جن کی نشوونما اور نمودِ زندگی کا مقصود ہے۔ ان جواہرِ مضمر کی پختگی اور تابندگی سے انسان میں شانِ انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا تحفظ، ابقا اور تسلسل (بعد از ممات) انسانی جدوجہد کا ماحصل ہے۔

(ب) تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں جو جغرافیائی، لسانی، نسلی اور وطنی حدود سے متأثر نہیں ہوتی۔

(ج) تمام نوعِ انسانی کی فلاح کا راز ایک ہی ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے میں ہے جو وحی کے ذریعہ مل سکتا ہے اور جو آج اس آسمان کے نیچے قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔

ان محکم اصولوں کی بنیاد پر اسلام ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں نوعِ انسانی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی شرفِ انسانیت کے سدرۃ المنتہیٰ تک جا پہنچے۔ اس معاشرے کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں:۔

۱۔ اس میں افرادِ معاشرہ اپنے اندر ان صفاتِ خداوندی کو منعکس کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں جنہیں قرآن اسماء الحسنیٰ سے تعبیر کرتا ہے اور جو کائنات میں مستقل اقدار کا سرچشمہ ہیں۔

۲۔ ان افراد میں ایسا ضبط پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ ان صفات میں ٹھیک ٹھیک توازن قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اسماء کے لئے حسنیٰ کی شرط ضروری ہے اور حسن نام ہے تناسب کے اعتدال کا۔

۳۔ ان افراد کی نگاہوں میں ایسی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ صحیح صحیح فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فلاں قسم کے خارجی حادثہ کی صورت میں فلاں قسم کی صفتِ خداوندی کا ظہور ہونا چاہیئے۔

۴۔ ان افراد پر مشتمل جماعت میں اشیاءِ فطرت کی تسخیر کی قوت اور ان کے ماحصل کو فلاحِ انسانیت کے لئے صرف کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

۵۔ وحدتِ خالق، وحدتِ انسانیت اور وحدت و ائتلافِ ملت کے محکم تصور سے انسان اور کائنات، انسان اور انسان اور خود انسان کے اپنی ذات کے تضادات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے جس سے انسانی معاشرہ کی ناہمواریاں مٹتی چلی جاتی ہیں۔

۶۔ اس جماعت کا ہر فرد اپنے آپ کو خدا کی صفتِ ربّ العالمینی کا مظہر سمجھتے ہوئے بلا مزد و معاوضہ انسانیت کی ربوبیت کا کفیل بن جاتا ہے۔ اس طرح تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بھی از خود پوری ہوتی جاتی ہیں اور ان کی فطری صلاحیتوں کے کامل نشوونما کے اسباب و وسائل بھی یکساں طور پر میسّر آتے جاتے ہیں۔ اور اس طرح زندگی کی جوئے رواں ہنستی کھیلتی رقص کرتی شاداں و فرحاں اقطار السمٰوٰت والارض سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

یہ ہے مختصر سے الفاظ میں قرآنی تہذیب کا ماحصل۔ اس کے برعکس تہذیبِ عصرِ حاضر اس

تہذیبِ مغرب

تہذیب کی یکسر نقیض ہے۔ اس تہذیب کی عمارت اس فلسفہ کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے کہ مادّی عناصر کے محض اتفاقیہ طور پر یکجا ہو جانے سے حیات وجود میں آگئی اور ان عناصر کے منتشر ہو جانے سے اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ دنیا یہی مادّی عناصر کی دنیا ہے جس میں ہر شے تغیّر پذیر ہے۔ لہٰذا دنیا میں نہ کوئی مستقل اقدار ہیں نہ قانونِ مکافاتِ عمل۔ خیر وہ ہے جس سے کسی فرد یا افراد کے گروہ یا قوم کو ذاتی مفاد حاصل ہو جائے (خواہ اس سے دوسرے افراد یا دوسری اقوام کی رگِ حیات ہی کیوں نہ کٹ جائے) اور شر وہ ہے جس سے کسی فرد یا قوم کا ذاتی نقصان ہو۔ ہر فرد یا قوم کا نصب العینِ حیات منفعتِ خویش کا حصول ہے اور علم و عقل کا کام یہ ہے کہ وہ اس منفعت کے حصول کے لئے اسباب و تدابیر اور حیل و مکائد فراہم کرے۔ اس فلسفہ حیات (یا تہذیبِ عصرِ حاضر) کا نتیجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر خود اہلِ مغرب کی تحقیق کے مطابق وہاں کی آبادی کا ہر چھٹا فرد ایسا ہے جسے عمر کا کچھ نہ کچھ حصّہ پاگل خانے میں گزارنا ہوگا اور اجتماعی طور پر یہ عالم ہے کہ دنیا کی مختلف قومیں یا تو باہمی کشت و خون میں مصروفِ پیکار رہتی ہے یا اس کشت و خون کی تیاری میں مشغول۔

اقبالؒ نے اقوامِ مغرب کے فلسفہ حیات اور نظریہ سیاست و عمرانیت کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا جس سے اس پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ یہ فلسفہ حیات اور منہاجِ زندگی دنیا میں جہنّم پیدا کر دینے کا موجب ہے۔ دوسری طرف قرآنی بصیرت نے اس پر حقائقِ زندگی کو اس طرح واشگاف کر دیا کہ وہ بادلوں میں چھپی ہوئی بجلیوں اور ہواؤں میں مستور طوفانوں کو بے حجاب اپنے

سامنے دیکھ لیتا تھا۔ یہی تھی وہ قرآنی بصیرت جس کی بنا پر اس نے ۱۹۰۷ء میں اقوامِ مغرب کو للکار کر کہہ دیا تھا کہ :۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اس وقت سے لے کر اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اقبالؒ اقوامِ مغرب کو بالعموم اور ملّتِ اسلامیہ کو بالخصوص اس ابرمنی تہذیب کے نتائج و عواقب سے آگاہ کرتا رہا۔ اس مجموعۂ انذار و تنذیر کا نام ہے ضربِ کلیم جس سے اقبالؒ بتکدۂ عصرِ حاضر کے تمام بتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے۔ لیکن وہ اپنے عصائے کلیمی سے صرف فرعونیت، ہامانیت اور قارونیت ہی کے نگاہ فریب سحر کو نہیں توڑتا بلکہ وہ اس کے بعد اپنی قوم کو قندیلِ قرآنی کی روشنی میں فاران و سینا کی ان محفوظ و بابرکت وادیوں میں لے جاتا ہے جہاں زمین سے فوز و فلاح کے چشمے اُبلتے اور آسمان سے رشد و سعادت کے من و سلویٰ اُترتے ہیں۔

ضربِ کلیم

پیامِ اقبالؒ کی خوش بختی ہے کہ وہ رفیقِ محترم، صاحب السعادۃ عبدالوہاب عزام سبلے کی "خاراشگافی" اور "جوئے شیر" کے تصدق تنگنائے اُردو سے نکل کر بحیرۂ عرب میں با وباں کشا ہوتا ہے اور اس طرح اپنی اس افادیت کو جو اس وقت تک شرمندۂ ساحل تھی بیکراں بنا رہا ہے۔ اور خوش بختی ہے خود عربی بولنے والی ملّتِ اسلامیہ کی جو اس پیامِ حیات بخش سے، جو معنوی لحاظ سے ان سے اس قدر قریب ہونے کے باوجود لفظی اعتبار سے اتنا دور تھا، شرفِ تعارف حاصل کر رہی ہے۔

خدا کرے یہ پیامِ انقلاب سرزمینِ عرب کے لئے پھر وہی تخمِ صالح بن جائے جس سے ایک مرتبہ پہلے وہ شجرِ بلند و بالا پیدا ہو چکا ہے جس کی رفعتوں کے متعلق اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ کہا گیا تھا اور جس کی ہمہ گیر پہنائیوں کو لَا شَرْقِيَّةٍ وَّ لَا غَرْبِيَّةٍ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس شجرِ طیب و مبارک کی روئیدگی و بارآوری صرف قرآنی ماحول میں ممکن ہے اور یہی پیامِ اقبالؒ کا مقصود و منطوق ہے۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن　　نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

یہاں تک تو ضربِ کلیم کے متعلق ہوا۔ اقبال کے عمومی مطالعہ کے ضمن میں ایک چیز ایسی ہے

اقبالؒ کی اصطلاحات

جسے مدنظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اقبالؒ کی شاعری میں عربی اور فارسی لغت کے اکثر الفاظ ایسے ہیں جنہیں وہ ان کے لغوی معنوں میں استعمال نہیں کرتا بلکہ وہ کلامِ اقبالؒ کی خاص اصطلاحات ہیں۔ جب تک ان الفاظ کے اصطلاحی معانی سمجھ میں نہ آئیں اقبالؒ کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آسکتا۔ مثلاً علم و عشق، عقل و دل، ذکر و فکر، خبر و نظر، سوز و ساز یا درویش، قلندر، مردِ حُر وغیرہ الفاظ اسی قبیل کے ہیں۔ یہ تمام اصطلاحات اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن وہ اصطلاح جو فکرِ اقبالؒ میں محور کا حکم رکھتی ہے اور جس کے گرد اس کا سارا کلام گردش کرتا ہے' خودی ہے۔ اقبالؒ سے پہلے یہ لفظ ہمارے ہاں غرور اور تکبّر کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا لیکن اقبالؒ نے اسے بالکل جداگانہ معنی پہنا دیئے۔ اور یہ مفہوم اب اس درجہ رائج ہو چکا ہے کہ اس لفظ کے قدیمی معانی بالکل نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔

خودی ـــــ سے اقبالؒ کا مفہوم کیا ہے اس سوال کا جواب مختصر الفاظ میں دینا آسان نہیں۔

خودی

اس لئے کہ اقبالؒ کا فلسفہ درحقیقت فلسفۂ خودی ہے اور جب تک اقبال کا پورا فلسفہ سامنے نہ آجائے اس اصطلاح کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس تفصیل و اطناب کا یہ موقع نہیں ہے لیکن چونکہ ضربِ کلیم میں بھی یہ لفظ بار بار سامنے آتے گا۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قلیل ترین الفاظ میں اس اصطلاح کا طائرانہ سا تعارف کرا دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ کیا انسان کی انفرادیت، شخصیت یا انا کوئی مستقل حقیقت ہے یا محض فریبِ تخیّل؟ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے مفکّرین نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش نہ ہوگی' افلاطون اور اس کے اتباع میں حکمائے ایران اور ہند اس نتیجہ پر پہنچے کہ کائنات میں صرف حیاتِ کلّی کا وجود ہے۔ اس لئے انسانی ذات (انا یا شخصیت) محض فریب ہے۔ یہ فریب' عمل کے زور پر قائم رہتا ہے اور عمل کی بنیاد آرزو پر ہے۔ لہٰذا اس فریب سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ انسان ترکِ آرزو سے ترکِ عمل کرے اور اس طرح انسانی ذات کا حباب ٹوٹ کر حیاتِ کُلّی کے بحر میں گم ہو جائے گا۔ اس (فنائے ذات) کا نام نجات ہے اور یہی زندگی کا مقصود ہے۔ یہی وہ فلسفۂ حیات تھا جو ہمارے

ہاں نظریۂ وحدت الوجود کے نام سے رائج ہوا اور جس نے مسلمانوں جیسی ہمہ تن عمل قوم کو خاک کے آغوش میں سُلا دیا۔

اقبالؒ نے اس فلسفۂ حیات کے خلاف مسلسل احتجاج کیا اور اس کے برعکس فلسفۂ خودی پیش کیا۔ اس فلسفہ کا ملخص یہ ہے کہ حیات عالمگیر یا کلی نہیں بلکہ انفرادی ہے۔ حتیٰ کہ خدا بھی ایک فرد ہے اگرچہ وہ اپنی انفرادیت میں یگانہ اور نادر ہے۔ اس انفرادی زندگی کی اعلیٰ ترین صورت کا نام خودی ہے جس سے انسانیت کی شخصیت یا انفرادیت متشکل ہوتی ہے۔ لہٰذا انسانی زندگی کا مقصود فنائے ذات نہیں بلکہ اثباتِ خودی ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک جوں جوں انسان اس فردِ کامل و نادر کی مانند ہوتا جاتا ہے (جسے انائے مطلق یا خدا کہتے ہیں) وہ خود بھی منفرد اور نادر ہوتا جاتا ہے۔ اس کا نام استحکامِ خودی ہے۔ "خدا کی مانند" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اندر صفاتِ خداوندی کو منعکس اور اس طرح اس انائے مطلق کو اپنے اندر جذب کرتا جائے۔ خودی کے ضعف اور استحکام کے پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ انسان اپنی راہ میں آنے والے موانعات پر کس حد تک غالب آتا ہے۔ زندگی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مادہ شر ہے اور اس لئے قابلِ نفرت۔ مادہ شر نہیں بلکہ یہ زندگی کی خوابیدہ قوتوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہے۔ جب انسانی خودی موانعات پر غلبہ حاصل کرنے سے پختہ ہو جاتی ہے تو پھر موت کا جھٹکا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس طرح انسانی زندگی دوام سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ بنا بریں ہر وہ عمل جس سے خودی میں استحکام پیدا ہو خیر ہے اور ہر وہ کام جس سے خودی کمزور ہو جائے شر ہے۔

مراحلِ ثلاثہ

اقبالؒ کے نزدیک ارتقائے خودی کا پہلا مرحلہ تخلیقِ مقاصد یا تولیدِ آرزو ہے۔ آرزو عینِ حیات اور اصلِ قوت ہے۔ کیونکہ یہی عمل کی محرک ہوتی ہے۔

تخلیقِ مقاصد کے بعد دوسرا مرحلہ حصولِ مقاصد کے لئے جہدِ مسلسل ہے۔ حصولِ مقصد کے لئے اس تپش و خلش کا نام اقبالؒ کی اصطلاح میں عشق ہے۔ اس جدوجہد کی کامیابی کے لئے تین شرائط ناگزیر ہیں۔ اوّل اطاعت۔ اطاعت سے مراد ہے قوانینِ خداوندی (قرآن) کا کامل اتباع جس کے لئے قرآنی معاشرہ کی تشکیل ضروری ہے۔ اس اطاعت سے انسان کے اندر ضبطِ نفس پیدا ہو جاتا ہے اور یہ دوسری شرط ہے۔ ضبطِ نفس سے مراد خواہشات کا دبانا نہیں بلکہ امالہ یا کظامت (زائد قوتوں

کا رُخ دوسری طرف بدل دینے) سے ان میں توازن پیدا کرنا ہے۔ اس توازن کی اکمل ترین شکل ذاتِ خداوندی ہے جس میں متضاد صفات کا باہمی توازن اپنی انتہا تک پہنچا ہوا ہے۔

اس تطہیرِ فکر و عمل اور تہذیبِ نفس سے انسان اس مقام تک جا پہنچتا ہے جسے اقبالؒ نیابتِ الٰہیہ سے تعبیر کرتا ہے اور یہ تیسری شرط ہے۔ نیابتِ خداوندی سے اقبالؒ کا مفہوم وہ قوتِ مجریہ ہے جو دنیا میں قوانینِ خداوندی (ضابطۂ قرآنی) کی تنفیذ و ترویج کا موجب بنتی ہے (نیابتِ الٰہیہ سے مراد یہ نہیں کہ انسان خدا کا قائم مقام یا جانشین بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ جانشینی صرف اس کی ہوتی ہے جو خود موجود نہ ہو)۔ یہ مقامِ مومن ہے اور یہی مقامِ اقبالؒ کے نزدیک استحکامِ خودی کا آخری نقطہ ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر انسان ساری دنیا پر غالب آجاتا ہے۔ دنیا اس پر غالب نہیں ہوتی۔ اس کیفیت کا نام اقبالؒ کی اصطلاح میں فقر، درویشی یا قلندری ہے۔ یعنی سب کچھ مسخر کر لینے کے بعد وہ استغناء جو اللہ کی صفتِ صمدیت اور "غَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْن" کا مظہر ہو۔ اس قسم کے افراد پر مشتمل جماعت کا نام امتِ مسلمہ ہے اور اسی جماعت کی نشاۃِ ثانیہ، پیامِ اقبالؒ کا منتہیٰ و مقصود۔ وہ امت جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

میانِ امتاں والا مقام است — کہ آں امت دو گیتی را امام است
نیاساید ز کارِ آفرینش — کہ خوابِ و خستگی بر وے حرام است

اور

بہ باغاں عندلیبے خوش صفیرے — بہ راغاں جرّہ بازے زود گیرے
امیر او بسلطانی فقیرے — فقیر او بہ درویشی امیرے

لتکونوا شھداء علی النّاس و یکون الرّسُول
علیکم شھیدًا
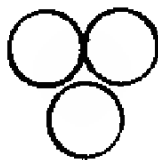
مقامِ اقبالؒ

صندل ہال شملہ کی ایک تقریر

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں نے قرآنِ کریم کے الفاظ کو یاد رکھا اور اس طرح یاد رکھا کہ اس کی نظیر دنیا کی کسی اور قوم میں نہیں مل سکتی. لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے اس کے مفہوم و معانی کو جس طرح سے بھلایا ہے اس کی مثال بھی شاید ہی کہیں اور مل سکے. صدیہ اول کے بعد جو قرآن نگاہوں سے اوجھل ہونا شروع ہوا ہے تو رفتہ رفتہ وہ غیر اسلامی تصورات کے غلافوں میں اس طرح چُھپ گیا جیسے چاند گہن میں آجاتے. صدیاں اسی طرح گذر گئیں اور پھر یہ حالت ہوگئی کہ یہی غیر اسلامی تخیلات عین اسلام بن گئے. اب مسلمانوں سے ان معتقدات کو چھڑانا جو انہیں اسلاف سے وراثت میں ملے ہیں، ان کی نگاہ میں انہیں دین سے بے گانہ بنانا تھا. اِدھر یہ حالت تھی. اُدھر یورپ کے میکانکی تصورِ حیات کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے نوجوان طبقہ کے دل و دماغ سے ماورائے عقل (یعنی وحی) کی ضرورت اور اس کے تاثرات کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جانا شروع کر دیا اور اس طرح ان کی نگاہوں کا زاویہ بدل دیا. مذہب پرست طبقہ اپنی جگہ نوحہ کناں تھا کہ نوجوان طبقہ مذہب سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہوتا جا رہا ہے. اور نوجوان طبقہ شکوہ سنج تھا کہ جس چیز کو ان کے سامنے حقیقت و بصیرت کہہ کر پیش کیا جا رہا ہے اس سے ان کی فطرت ابا کرتی ہے. غرضیکہ — "مسجدیں مرثیہ خواں تھیں کہ نمازی نہ رہے" اور بے نمازوں کو شکایت تھی کہ نمازیوں میں — وہ صاحبِ اوصاف حجازی نہ رہے. مذہب کے

مدعیوں کو ہر مقام پر شکست ملتی تھی۔ اس لئے کہ قرآنِ کریم میں تو یہ جوہر موجود ہے کہ انسان علم و عقل اور تجارب و مشاہدات کی جن بلندیوں تک جی چاہے اڑتا جائے قرآن اس سے بھی آگے نظر آئیگا۔ لیکن جن عجمی تصورات کو اسلام کہہ کر پیش کیا جا رہا تھا وہ تو انسانی دماغ کی کاوش ہی کا نتیجہ تھے۔ ان میں یہ صلاحیت کیسے پیدا ہو سکتی تھی کہ وہ زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکتے۔ غرضیکہ دنیائے اسلام عجیب پیچ و تاب میں تھی اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے کہ ایسے میں

حقیقتِ قرآن

مبدا فیض کی کرم گستری نے ان میں ایک ایسی گراں مایہ ہستی کو پیدا کر دیا جس کی نگاہِ دوررس نے انسانی تخیلات کے تو بر تو پردوں کو قرآنِ کریم سے ہٹا کر عروسِ حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیا اور وہ اسلام جو مدت ہائے دراز سے عجمی انسانوں کی چیستاں بن چکا تھا پھر سے اپنی اصلی حالت میں پہچانا گیا۔ خدائے ذوالمنن کی موہبتِ کبریٰ سے اس شخص کو دماغ ایسا عطا ہوا جو علم و حکمت کے بلند ترین مقام تک پہنچ چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی قرآن کی محبت نے اس کے سینے میں وہ قلبِ روشن رکھ دیا جسے صہبائے ایمان کا شفاف آبگینہ کہنا چاہیئے۔ ان دونوں کے امتزاج سے وہ نگاہ پیدا ہوئی جو ہزار پردوں میں چھپی ہوئی حقیقت کو بھی بے نقاب دیکھ لے۔ اس نگہِ حقیقت شناس کا نام تھا اقبالؒ۔

(۲)

جب سے مسلمانوں میں مرکزیت فنا ہوئی تھی ان کے ہاں بھی دین اور دنیا دو الگ الگ شعبے قائم ہو چکے تھے، جس طرح عیسائیت میں کلیسا اور سلطنت اور ہندوستان میں گرہست آشرم اور سنیاس آشرم تھا۔ مسلمانوں کے نزدیک بھی دنیا ایسی قابلِ نفرت شے بن چکی تھی کہ ہر محراب و منبر سے یہ آواز بلند ہوتی تھی کہ دنیا مردار ہے اور اس کا طالب کتا۔ اقبالؒ نے آکر بتایا کہ یہ نظریہ یکسر غیر اسلامی ہے۔ قرآن اپنے ماننے والوں کے لئے ایک مکمل دستورِ حیات پیش کرتا ہے۔ ایک ایسا نظامِ زندگی مرتب کر کے دیتا ہے جو ان کی ہر قدم پر راہنمائی کرتا ہے۔ سیاست، مدنیت، عمرانیت، سب دین ہی کی شاخیں ہیں۔ یوں سمجھئے کہ دنیا کا ہر وہ کام جس کی بنا تقویٰ پر ہو عین دین ہے۔ پھر اقبالؒ نے اس حقیقت کو محض ایک نظری اور اجمالی حیثیت ہی سے پیش نہیں کیا بلکہ دنیا کے ہر نظامِ زندگی کے تجزیہ کے بعد بتا دیا کہ اس میں کیا خرابیاں ہیں اور اسلامی نظام

کس طرح انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچانے کا واحد اور مکمل ذریعہ ہے۔

دین کے متعلق یہ غلط نظریہ بھی رائج ہوچکا تھا کہ اس سے مقصود محض انفرادی نجات ہے۔ ملّت کے اجتماعی معاملات "دنیاداروں" کے لئے ہیں۔ یہ عملی رہبانیت کا تصوّر تھا جو مسلمانوں کے رگ و پے میں سرایت کرچکا تھا۔ اقبالؒ نے آکر بتایا کہ انفرادیت کی زندگی کبھی اسلامی زندگی نہیں ہوسکتی۔ قرآنِ کریم ایک ایسا نظام پیش کرتا ہے جس میں ہر فرد، ملّت کا ایک زندہ رکن ہے۔ انفرادی اصلاح اس لئے ضروری ہے کہ ان افراد کے مجموعہ سے جو قوم بنے وہ از خود اصلاح یافتہ ہو۔ لیکن اگر افراد کے سامنے اجتماعی تصورِ حیات نہیں تو وہ لاکھ اصلاح یافتہ ہوں، مقصدِ زندگی سے بہت دور ہوں گے۔ اسلام جماعت ہے اور جماعت نام ہے ایک نظام کے تابع زندگی بسر کرنے کا۔ یہ نظام مرکز سے قائم ہوتا ہے اور مرکزِ ملّت وہ ادارہ ہے جو قرآنی احکام کی تنفیذ و ترویج کا ذریعہ بنتا ہے۔ اسی کو "خدا کی بادشاہت" کہتے ہیں یعنی قرآنی نظامِ مملکت۔

اجتماعی زندگی

دین کے متعلق یہ تصور بھی ذہنوں میں جاگزیں ہوچکا تھا کہ عبادات و اعمال کے نتائج محض اُخروی زندگی میں جاکر مرتب ہوں گے۔ ثواب نام رہ گیا تھا ایک ایسے مبہم تصوّر کا جس کی کوئی محسوس توجیہہ اس زندگی میں نہیں ہوسکتی تھی۔ اقبالؒ نے آکر بتایا کہ قرآن کی رُو سے اعمالِ صالحہ سے مفہوم یہ ہے (بلکہ یوں کہیئے کہ اعمال کا فطری اور لازمی نتیجہ ہے) کہ وہ انسان میں یہ صلاحیت پیدا کر دیں کہ وہ موجودہ زندگی میں عزت و وقار، شوکت و حشمت، دولت و ثروت، حکومت و سلطنت کی زندگی بسر کرے اور اس کے بعد کی زندگی میں وہ تمام کامیابیاں اور کامرانیاں نصیب ہوں جو انسانی آرزوؤں کا منتہیٰ ہیں۔ اعمال و عبادات اگر یہ نتائج مرتب نہیں کرتے تو سمجھ لیجیئے کہ اس طریقِ کار میں کہیں نہ کہیں خرابی ضرور ہے۔ اور وہ خرابی یہ ہے کہ آج وہ نظامِ زندگی مفقود ہے جس کے اندر رہتے ہوئے یہ اعمال حقیقی معنوں میں اعمالِ صالحہ بنتے تھے۔

پھر مذہب کے متعلق یہ عقیدہ پیدا ہوچکا تھا کہ مذہب جتنا کچھ سمجھا جانا تھا سمجھا جاچکا۔

اس کے بعد کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ مذہب کے متعلق مزید تحقیق و اجتہاد سے مسائل زندگی کا ایسا حل تلاش کرے جو زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دنیا کہیں سے

اجتہاد

کہیں پہنچ گئی لیکن مسلمان ایک ماضی پرست قوم بن کر زندگی کی دوڑ میں صدیوں پیچھے رہ گئے۔ اقبالؒ نے یہ بتایا کہ دین کے مکمل ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ضروریاتِ زندگی کے متعلق سینکڑوں برس پیشتر ایک خاص ماحول اور خاص معاشرہ کے تقاضوں کے مطابق جو جزئیات مرتب ہوئی تھیں وہ ابدی طور پر غیر متبدل رکھی جائیں گی۔ ختمِ نبوت اور اکملیتِ دین سے مقصود یہ ہے کہ اصولی طور پر انسانی تقاضوں کی تسکین کے لئے جو کچھ درکار تھا وہ وحی کے ذریعہ انسانوں تک آچکا ہے۔ اس میں کسی ردّ و بدل اور حک و اضافہ کی گنجائش نہیں۔ اب ان اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق جزئی مسائل کا حل ساتھ کے ساتھ مستنبط ہوتا رہے گا۔ یورپ اس لئے تباہ ہوا کہ اس کے پاس مسائلِ حیات کے حل کے لئے کوئی ایسا غیر متبدل ضابطۂ آئین نہ تھا جو وحی کی محکم بنیادوں پر قائم ہو اور مسلمان اس لئے تباہ ہوئے کہ انہوں نے بدلتے رہنے والے فرعی مسائل سے متعلق احکام کو بھی غیر متبدل سمجھ لیا۔ ماضی سے تمسک اس لئے مفید ہے کہ جو علمی سرمایہ ہمارے اسلاف ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں اس کی مدد سے ہم اپنے مستقبل کو درخشندہ تر و تابناک بنائیں نہ یہ کہ ماضی تو درخشندہ اور روشن رہے اور مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا چلا جائے۔

(۵)

ایک طرف اقبالؒ نے مذہب پرست طبقہ کے سامنے دین کے وہ حقائق پیش کئے جن کی رو سے وہ اسلام جو ایک عرصہ سے متاعِ گم گشتہ ہو چکا تھا پھر سے آنکھوں کے سامنے آگیا۔ دوسری طرف انہوں نے یورپ کے مادہ پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے روکنے کی فکر کی۔ یورپ بزعمِ خویش ہر نظریہ کو علم و عقل کی روشنی میں پرکھنے کا مدعی تھا اور اس نظر فریب خوش آیند دعویٰ کے ماتحت وہ مسلمانوں کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو مذہب سے برگشتہ کئے جا رہا تھا۔ ہمارے مذہب پرست طبقہ کے پاس اس الحاد و بے دینی کا علاج سوائے فتاوائے کفر کے اور کچھ نہ تھا۔ کیونکہ نبی اکرمؐ کا یہ ارشادِ گرامی ان کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا کہ دشمن کا مقابلہ اس قسم کے ہتھیاروں سے کرو جو اس کے پاس ہوں۔ اقبالؒ حکمت و فلسفہ کی ان بلندیوں تک پہنچ چکا تھا کہ خود اہلِ یورپ

اسے ائمہ فن میں سے تسلیم کرتے تھے۔ ان ہتھیاروں سے مسلّح ہو کر اس نے قرآن کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس طرح اہلِ یورپ کی مادہ پرستی کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر دیں۔ اس نے بتایا کہ وہ دین جو قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے کس طرح عین علم و بصیرت ہے اور وہ ظن و قیاس جسے یورپ علم و بصیرت سمجھ رہا ہے کس طرح جہل و ظلمت۔ یورپ کی مادہ پرستی اسے اس نتیجہ پر پہنچاتی ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔ اس کے بعد فنا ہے۔ لہٰذا اُخروی زندگی کا عقیدہ ایک واہمہ ہے۔ اقبالؒ نے نظریۂ ارتقاء کے مسلّمات سے اس حقیقتِ عظمیٰ کو واضح کر دیا کہ موجودہ زندگی سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی نہیں بلکہ ایک آنے والی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے جو بڑھتی چلی جائے گی۔ اقبالؒ نے اس قرآنی نظریۂ حیات کو علمی اکتشافات کی روشنی میں پیش کر کے صرف یورپ کی مادہ پرستی ہی کا ابطال نہیں کیا بلکہ تمام نوعِ انسانی پر اس کا احسان ہے کہ اس نے انسانیت کو اس کی صحیح قدر و قیمت سے متعارف کرا کر انسان کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا کہ وہی انسان جو حرکتِ قلب بند ہو جانے کے بعد مٹی کا ایک تودہ بن کر رہ جاتا تھا اب ایک ایسی حیاتِ جاوداں کا پیکر بن گیا کہ موت اس کے نزدیک ایک شب تاریک کے بعد نورانی صبح کے طلوع کا نام ہو گیا۔ جب زندگی کے متعلق یہ یقین ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس سے انسان میں اپنی ذمہ داریوں کا صحیح احساس بھی بیدار ہو جاتا ہے اور یہی وہ احساس ہے جس سے دنیا میں عدل و انصاف قائم رہ سکتا ہے۔

مادہ پرستی

یورپ کے نظریۂ مادہ پرستی نے ایک اور بھی ہلاکت آفریں خرابی پیدا کر رکھی ہے۔ مادہ پرستی کے معنی یہ ہیں کہ انسان ہر شے کی قدر و قیمت مادیت کی میزان ہی سے متعین کرتا ہے جب کوئی کمزور و ناتواں کسی صاحبِ قوت سے امداد کا طالب ہوتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ کاروباری نقطۂ نگاہ سے اس کمزور کی مدد کرنا زیادہ منفعت بخش ہے یا اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے ہڑپ کر جانا زیادہ سودمند۔ وہ دنیا کے ہر معاملہ کو اسی "کاروباری میزان" سے تولتا ہے اور جو شکل اسے زیادہ منفعت بخش دکھائی دیتی ہے اسے بلا تامّل اختیار کر لیتا ہے۔ یورپ کا جدید "ضابطۂ اخلاق" (کہ اگر اسے "اخلاق" کہا جا سکے) اسی اساس پر قائم ہے اور دنیا آج جس جہنم سے گزر رہی ہے وہ اسی اصل و اساس کا فطری نتیجہ ہے۔ اقبالؒ نے آ کر بتایا کہ یہ ضابطۂ معاشرت ابلیسانہ مکر و فریب

کا جال ہے۔ وہی معاشرت دنیا کو جنت میں تبدیل کرنے کا موجب بن سکتی ہے جو وحدتِ خالق کے ایمان کی بنا پر وحدتِ خلق کی محکم اساس پر استوار ہو۔

مادہ پرستی کی اس لعنت سے ایک اور مصیبت شروع ہو جاتی ہے۔ چونکہ مادیت سے انسان کی نگاہیں ہمیشہ محسوسات میں گھری رہتی ہیں اس لئے انسانوں کی تقسیم محسوس حدود و قیود کی رُو سے کی جاتی ہے اور زبان، رنگ، نسل یا وطن کی تفریق سے انسانی جماعتوں کی تشکیل ہوتی ہے۔

وحدتِ انسانیت

یہ وہ جہالتِ کبریٰ ہے جو آج انسانیت کی امن سوزی کی سب سے بڑی ذمہ دار ہے۔ اقبالؒ نے آکر دنیا کے سامنے قرآن کی اس بلند حقیقت کو پیش کیا کہ یہ "تقسیمِ انسانیت" کس درجہ تنگ نظری پر مبنی ہے۔ اس نے بتایا کہ قرآن کی رُو سے تمام انسانوں کی تخلیق نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے اور ان کی وجہ تکریم ان کے جوہرِ ذاتی ہیں نہ کہ نسبتی تعارف۔ لہٰذا انسانی جماعت کی تشکیل اسی معیار کے مطابق ہونی چاہیئے۔ اس نے سیاستِ حاضرہ کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ساری دنیا سے پکار کر کہہ دیا کہ جب تک تمہارا نظریہ قومیت نہیں بدلتا دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اسی قرآنی نظریہ تقسیم انسانیت کی رُو سے اس نے ہندی مسلمانوں کی سیاست کا رُخ لندن اور سومنات سے کعبہ کی طرف پھیر دیا اور نہایت بلند آہنگی سے برملا کہہ دیا کہ ـــ بنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے ـــ اسی الگ نظریہ قومیت سے مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کا سوال پیدا ہوا جس نے آج پاکستان کی جیتی جاگتی شکل اختیار کر لی ہے (اللہ اسے اپنوں اور بیگانوں کے ہر شومِ ارادہ سے محفوظ رکھے اور اسے قرآنی نظام کی ترویج و تنفیذ کا گہوارہ بنائے کہ یہی اس مردِ درویش کی آہِ سحری اور نالۂ نیم شبی کا مقصود تھا)۔

(۵)

یہ ہے ایک ہلکی سی جھلک حقیقی اقبالؒ کی۔ وہ اقبالؒ جو اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا تھا بلکہ ہر مسئلہ کا حل قرآن کی روشنی میں تلاش کرتا تھا۔ ہم اقبالؒ کو نہ معصوم سمجھتے ہیں نہ اس کے فکر و اجتہاد کو منزہ عن الخطا۔ وہ قرآن کا ایک طالب العلم تھا اور ساری عمر طالبِ علم رہا۔ اس لئے اس کے فکری نتائج حرفِ آخر نہیں ہو سکتے۔ ہمارے نزدیک اس کی عظمت کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ہر وقت معا

کا حل قرآن کی روشنی میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا تھا اور اس تلاش میں وہ کسی غیر قرآنی فکر کا منت کش نہیں ہوتا تھا کہ اس کا مسلک یہ تھا کہ

از تاکِ بادہ گیرم و در ساغر انگنم

جب تک اقبالؒ کا صحیح مقام متعین نہ کیا جائے' سمجھ میں نہیں آسکتا کہ اقبال کو فطرت نے کس مقصدِ عظیم کے لئے پیدا کیا تھا اور اس مقصد کو اس نے کس حد تک پورا کیا۔ وہ یہ دکھانے کے لئے نہیں آیا تھا کہ زمینِ شعر میں گلکاریاں کس طرح کی جاتی ہیں بلکہ وہ یہ بتانے کے لئے آیا تھا کہ یہ زمین کس طرح بدل سکتی ہے' یہ آسمان کس طرح بدل سکتا ہے اور مسلمانوں کو اس کی عظمتِ گم گشتہ پھر سے کیسے مل سکتی ہے۔ محسوسات کے خوگر انسان کی نگاہیں جب لطیف حقیقتوں کے حسنِ بسیط سے پورے طور پر بہرہ یاب نہیں ہوسکتیں تو وہ پردہ ہائے مجاز کی ان رنگینیوں میں جذب ہوکر رہ جاتی ہیں جو اس حقیقت کو مشہود بنائے ہوتی ہیں۔ شاعری دراصل وہ حسین وجمیل نقاب تھی جس کے اندر حقیقی اقبال چھپا بیٹھا تھا۔ عام لوگ ان پردوں کے نقش ونگار میں محوِ تماشا ہوکر رہ جاتے ہیں اور ان کے اندر بیٹھا ہوا اقبالؒ ان ظاہر بیں نگاہوں کی فریب خوردگی پر ہنس دیتا اور کلیجہ مسوس کر رہ جاتا ہے۔

پوچھا جائے گا کہ اقبالؒ نے کام کیا کیا تھا؟ یہ سوال پھر اس طبقہ کی طرف سے اُٹھے گا جس کی نگاہیں محسوسات میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ وہ طبقہ جو غالب کے الفاظ میں "اوجِ طالعِ لعل وگہر" کے بجائے کسی کے "جوہرِ طرفِ کلاہ" کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ جو کسی کی عظمت کا اندازہ اس سے لگاتا ہے کہ اس نے اینٹوں اور پتھروں کا کتنا بڑا انبار جمع کیا تھا۔ جو کسی کی شان وشوکت کے لئے صرف یہ دیکھتا ہے کہ اس کی گاڑی کے آگے کتنے گھوڑے جتتے تھے اور کتنے ہاتھی اس کے جلوس میں نکلتے تھے یا آگے بڑھے تو کتنا وسیع پنڈال اس کی آمد کی تقریب میں تعمیر ہوتا تھا۔ کتنے لاکھ انسان اس کے گرد "جیئس" "زندہ باد" کے نعرے لگاتے تھے۔ جو لوگ کسی کے اعمالِ حیات کو صرف انہی میزانوں سے تولنے کے خوگر ہیں ان کے لئے اس سوال کا جواب فی الواقع بڑا مایوس کن ہوگا۔ لیکن جس کی نگاہیں محسوسات سے گزر کر حقائق کو پرکھتی ہیں وہ بلا تکلیف وکاوش دیکھ سکتا ہے کہ اقبالؒ نے کیا کیا؟ کسی کی دنیا بدلنے کے لئے یہ مہمل ہوتا ہے کہ اس کے مکان کا نقشہ

بدل دیا جائے. ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ اس کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا جائے۔ اس کا نظریۂ زندگی بدل دیا جائے کہ

اگر نگاہِ تو دیگر شود جہاں دگر است

اقبالؒ نے اپنے طریقِ کار میں اسی روش کو اختیار کیا جس سے ہنگامہ آفرینیوں اور غوغا آرائیوں کے بجائے چپکے چپکے دلوں کی بستیاں بدل جایا کرتی ہیں. اقبالؒ نے کشتی کا رُخ بدلنے کے بجائے پانی کے دھارے کا رُخ بدل دیا. اس نے اشیاء کا رنگ تبدیل کرنے کے بجائے نگاہوں کے چشمہ کا رنگ بدل دیا. اس نے جسموں کو نہیں چھوا بلکہ دلوں کو بدل دیا.
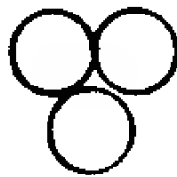
پیامِ اقبالؒ

دوعالم راتواں دیدن بمینائے کہ من دارم
کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم

قرآن آیا اور اس نے ان تمام زنجیروں کو کاٹ کر پھینک دیا جن میں انسانیت جکڑی چلی آرہی تھی۔ استبدادِ ملوکیت کی انسانیت کش زنجیریں جو انسان کو حیوان کی سطح سے بلند ہونے ہی نہیں دیتیں۔ افسونِ ہامانیت (برہمنیت، پیشوائیت، ملائیت اور خانقاہیت) کی مرگ آور زنجیریں جو زندگی کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتی ہیں اور مکائدِ قارونیت (سرمایہ پرستی) کی خوں آشام زنجیریں جو شجرِ انسانیت کے پتے پتے سے نمِ حیات چوس لیتی ہیں۔ اس نے ان تمام زنجیروں کو کاٹ دیا تاکہ انسانیت آزادی کی فضائے بسیط میں برگ و بار پیدا کرے۔ کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ۔ اس شجرِ مقدس کی طرح جس کی جڑیں پاتال تک پہنچ چکی ہوں اور اس کی شاخیں بامِ عرش کو چھو رہی ہوں۔ اس طرح کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہ رہا اس لئے کوئی انسان کسی دوسرے کا غلام نہ رہا۔ اس نے کسی انسان کو یہ حق نہ دیا کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ اطاعت و اتباع صرف ان قوانین کا رہ گیا جو انسانوں کو خدا کی طرف سے دیئے گئے تھے۔ یہ قوانین ان غیر متبدل اصولوں پر مشتمل تھے جن کی روشنی میں انسانی زندگی اپنے منتہیٰ تک پہنچ سکتی ہے۔ لہٰذا ان

تکمیلِ دین

قوانین کے بعد کسی اور ضابطۂ قوانین کی ضرورت باقی نہ رہی اور اس طرح دین مکمّل اور نبوّت ختم ہو گئی۔

تکمیلِ دین اور ختمِ نبوّت کے بعد انسانی معاشرہ کو اس کی ارتقائی منازل طے کرانے کا طریق یہ متعیّن کر دیا گیا کہ جس جماعت نے ان اصولوں کی روشنی میں اپنی زندگی کو صحیح راستہ پر ڈال لیا تھا۔ اسے اس ضابطۂ قوانین کا وارث بنایا گیا تاکہ وہ اس سلسلہ کو آگے بڑھاتی جائے اور ہر دور کا انسان ان اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کا حل خود تلاش کرتا ہوا کاروانِ زندگی کو اس متوازن راستے پر لے جائے جسے صراطِ مستقیم سے تعبیر کیا گیا تھا۔

یہ قافلۂ رُشد و سعادت ابھی تھوڑی دُور چلنے پایا تھا کہ ملوکیت کے رہزنوں نے اپنی کمین گاہوں سے سر نکالا اور اس قافلہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ملوکیت بے ساز و براق کبھی کامیاب نہیں ہوا کرتی۔ وہ اپنی تائید میں پیشوائیت (PRIESTHOOD) اور غاصبانہ مفاد پرستی (CAPITALISM) کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔ دنیا کا کوئی فرعون، ہامان اور قارون کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ان غاصبانہ قوتوں کے راستہ میں قرآن ہی سب سے بڑی روک تھی۔ اس لئے انہیں اپنی کامیابی کے لئے اس سنگِ راہ کو سامنے سے ہٹانا ضروری تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے کیا کچھ کیا گیا تفصیل اس کی طویل ہے اور غور سے دیکھئے تو مسلمانوں کی ساری تاریخ گویا اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ غیر قرآنی تصوّراتِ زندگی کے لئے ایک جامع اصطلاح "عجمی تصوّرات" ہے۔

عجمی تصوّرات

ہماری تاریخ تفصیل ہے اس کوششِ مذموم و سعیٔ مشئوم کی کہ قرآن کی جگہ کس طرح عجمی تصوّرات کو مسلمانوں کے دل و دماغ پر مستولی کر دیا جائے۔ یہ کوشش بڑی کامیاب رہی۔ ایسی کامیاب کہ اس ایک ہزار سال کے عرصہ میں قرآن عجمی تصوّرات سے بدل گیا۔ اور بایں انداز کہ یہ عجمی تصوّرات عین اسلام قرار پا گئے اور قرآنی تعلیم یکسر غیر اسلامی بن گئی۔ چنانچہ آج کیفیت یہ ہے کہ اگر کسی کے سامنے قرآن لایا جائے تو وہ سمجھتا ہے کہ مجھے کفر و بے دینی کی تعلیم دی جا رہی ہے اور وہ اس سے اس طرح بھاگتا ہے۔ کانھم حمر مستنفرۃ فرت من قسورۃ۔

ہزار برس سے مسلمانوں پر یہی حالت چلی آ رہی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس دوران

میں اصلاحِ حال کی کوششیں بھی ہوئیں۔ بہت سی سعید روحوں نے قوم کی زبوں حالی پر خون کے آنسو بہائے اور اس کے دُکھ کی دوا ڈھونڈنے میں بڑی سعی و کاوش سے کام لیا۔ لیکن یہ کوششیں علاماتِ مرض کے ازالہ سے آگے بڑھ کر علّتِ مرض تک نہ پہنچ سکیں اور مرورِ زمانہ سے مرض ایسا مزمن اور مریض ایسا سقیم و ناتواں ہوتا گیا کہ غیر تو غیر خود اپنے بھی اس کی زندگی سے مایوس ہونے لگ گئے۔ اسلام کے مستقبل کے متعلق یہی مایوسی تھی جو ایران میں باب اور بہاء اللہ کی شریعتِ جدیدہ اور پنجاب میں نبوتِ فرنگ آفریدہ کی صورت میں نمودار ہوئی اور جس نے تہذیبِ مغرب سے مرعوب اور شکست خوردہ ذہنیتوں کو عام طور پر اپیل کیا۔ مذہب پرست طبقہ نے ان جدید نبوّتوں کی تو مخالفت کی لیکن اسلام کے مستقبل سے مایوسی کا غیر شعوری اثر انہیں قومیت پرستی (NATIONALISM) کے آغوش میں لے گیا۔ چنانچہ ابوالکلام آزاد، حسین احمد مدنی اور رفقاء ہم اس حقیقت کی زندہ مثالیں ہیں۔

مسلمان عالمگیر مایوسیوں کے اس خوفناک سیلاب میں بہہ ہی چلا تھا کہ مبداءِ فیض کی کرم گستری نے ان میں ایک ایسا دیدہ ور پیدا کر دیا جس کی نگہ دوررس ہزار برس کے عجمی تصورات کے دبیز پردوں کو چیرتی ہوئی اس مقام تک جا پہنچی جہاں قرآن اپنی اصلی شکل میں دنیا کے پاس آیا تھا۔

نگہِ بصیرت

وہاں سے اس نے نورِ بصیرت حاصل کیا اور روشنی کی اس کرن نے مایوسی کی ظلمت انگیز طغیانیوں میں امیدوں کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ اس نے تالبِ گور پہنچے ہوئے مسلمان کو پھر سے تھاما اور ایمان و ایقان کی بے پناہ قوتوں کے ساتھ اس حقیقت کو اس کے سامنے واشگاف کیا کہ جس چیز کے مستقبل سے تجھے مایوسی ہو رہی ہے وہ اسلام نہیں، عجم کے وہ تصوّرات ہیں جنھوں نے اسلام کا نقاب اوڑھ رکھا ہے۔ اسلام قرآن کے اندر ہے اور قرآن اس خدا کا پیغامِ ابدی ہے جو ہمیشہ زندہ ہے اور جس پر موت تو ایک طرف نیند اور اونگھ تک طاری نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا، قرآنی ممکنات سے مایوسی، زندگی کے حقائق سے چشم پوشی ہے، وہ بیس چالیس برس تک مسلسل و متواتر اس پیغام کو دہراتا رہا۔ اس پیغام کے انداز مختلف تھے۔ لیکن لَے ایک ہی تھی اور وہ لَے یہ تھی کہ اس ہزار سالہ عجمی اثرات کو پھینک کر الگ کر دو اور قرآن کو اپنی نگاہ سے دیکھو، بات واضح ہو جائے گی۔ قرآن کو اس طرح سمجھو گویا وہ خود تم پر نازل ہو رہا ہے۔ اگر تم نے قرآن کو اس طرح سمجھ لیا تو یہ تمہارے شعور میں انقلاب پیدا کر دے گا۔ اور انقلابِ شعور سے خارجی دنیا میں خود بخود انقلاب

آجاتا ہے۔

کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اقبالؒ یہ پیغام دے کر چلا گیا لیکن جو کچھ قرآن کے پیامبرِ اوّلین کے ساتھ ہوا تھا وہی کچھ اس کے ساتھ ہوتا نظر آرہا ہے۔ قرآن زندگی کا پیغام تھا اس لئے اس نے بار بار اس کا اعلان ضروری سمجھا کہ یہ شاعری نہیں شاعری ایک پیامبر کے شایانِ شان ہی نہیں ہوتی۔ لیکن مسلمانوں نے ان تنبیہات کے باوجود قرآن سے ایسی شاعری کی کہ اسے چیستان بنا کر رکھ دیا۔ مذہب کو شاعری کی فضا خوب راس آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب کا بیج پھوٹتا ہی شاعری کی زمین سے ہے اور اس کی پرورش بھی شاعری کی فضا میں ہوتی ہے۔ دین کا مدار حقائق پر ہوتا ہے۔ مذہب کا انحصار الفاظ پر۔ دین زندگی کا ضابطہ دیتا ہے، مذہب چند موہوم تصورات پیش کرتا ہے۔ دین کے مسلمات کی پرکھ محسوس نتائج سے ہوتی ہے، مذہب ذہنی اطمینان کا فریب دیتا ہے۔ یہی کچھ شاعری کرتی ہے۔ الفاظ کا الٹ پھیر، فنی قیود و شرائط کا شدت سے التزام، اور ان سب کا نتیجہ کچھ وقت کی واہ واہ۔ اقبالؒ نے قرآن کا پیغام دیا اس لئے قرآن ہی کے اتباع میں وہ عمر بھر اعلان کرتا رہا کہ میرا پیغام شاعری نہیں، نہ شاعری میرے شایانِ شان ہے۔ لیکن قوم ہے کہ اس کی ان تمام تنبیہات کے باوجود اسے شاعر بنانے پر مُصر ہے۔ گانے والے اور گانے والیوں کی زبان پر کبھی داغ اور غالب کی غزلیں ہوا کرتی تھیں۔ اب ان کی جگہ اقبالؒ کے شعروں نے لے لی ہے۔ قوالی کہ جس کے زور پر تصوف زندہ رہتا ہے، اس کے سوا کیا ہے کہ عقل و بصیرت کو ماؤف کر کے انسان کے سطحی جذبات میں ہیجان پیدا کیا جائے۔ اقبالؒ نے اسی لئے اسے افیون سے تعبیر کیا تھا۔ آج وہی قوالی اقبال کی سب سے بڑی نقیب ہے۔ جو ملک خود اقبالؒ کے قرآنی تصور کا عطیہ ہے اس میں اگر کسی چیز سے بُعد، اجنبیت، بلکہ بغض و عناد ہے تو اقبالؒ کے قرآنی پیغام سے۔ مذہب اور مفاد پرستی کا رشتہ پھر سے استوار ہو رہا ہے۔ وطنیت کی لعنت ذاتوں، برادریوں اور خاندانوں سے آگے گزر کر صوبجاتی تفریق کی محکم گیر صورت اختیار کر چکی ہے۔

حالات ہر چند نامساعد و ناموافق ہیں لیکن اس کے باوجود مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ قرآن جسے اقبال کا پیغام ہمارے سامنے دوبارہ لایا، زندہ اور پائندہ ہے۔ دنیائے انسانیت کا مستقبل

صرف قرآن سے وابستہ ہے۔ جن لوگوں کے دل میں یہ حقیقت اقبالؒ کی طرح ایمان بن کر سما گئی ہے ان پر لازم آتا ہے کہ وہ بھی اقبالؒ کی طرح اس پیغام کے عام کرنے میں اپنی پوری عمر بسر کردیں۔ مردہ پرست قوم زندہ انسانوں کی باتوں کو نہیں سُنا کرتی۔ وہ زندہ افراد کا گلا گھونٹ کر انہیں ماردیتی ہے اور پھر ان کی قبروں پر اپنی ہوسِ مردہ پرستی کی تسکین کے بڑے بڑے عظیم القدر مقبرے تعمیر کیا کرتی ہے۔ لیکن جس طرح ان تمام نامساعد حالات کے باوجود اقبالؒ نے اپنے پیغام کے عام کرنے میں کبھی ہمت نہ ہاری، اسی طرح اس پیغام کی نشر و اشاعت میں ان لوگوں کو بھی عزم و ثبات سے کام لینا ہوگا۔ قرآن کو انسانیت کا نصب العین بن کر رہنا ہے۔ اس کے سوا زندگی کے مسائل کا کوئی اور حل نہیں ہے۔ سوال یہی ہے کہ یہ شرف کس قوم کے حصہ میں آتا ہے کہ وہ اس شمعِ ہدایت کی علمبردار بن کر انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلہ کو صحیح راستہ پر لے چلے۔

اُمید کی کرن

۱۹۵۰ء
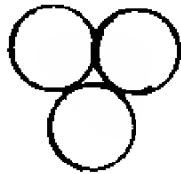
مشرق و مغرب

پچھلے دنوں ایک نجی مجلس میں اقبالؒ کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے کہا کہ اقبالؒ کے ہاں "مشرق" اور "مغرب" کے الفاظ اکثر ملتے ہیں۔ معلوم نہیں ان سے اس کا مفہوم کیا ہے؟ آئیے دیکھیں کہ اقبالؒ کے ہاں ان اصطلاحات سے مراد کیا ہے؟

اقبال کے ہاں مشرق یا مغرب سے مفہوم کوئی خاص خطۂ زمین نہیں۔ ان کے مفہوم زندگی کے دو جداگانہ تصوّرات (IDEOLOGIES) ہیں۔ مشرق کو آپ دیکھئے تو اس میں آپ کو ایک چیز خاص طور پر نمایاں نظر آئے گی۔ قرآن نے جن انبیاء کرامؑ کا ذکر کیا ہے وہ سب مشرق میں پیدا ہوئے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ یہ سب کے سب سامی النسل تھے۔ قرآن نے یہ ضرور کہا ہے کہ ان انبیاء کے علاوہ جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے مختلف اقوام میں اور انبیاء بھی آتے رہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ صرف مشرق کی اقوام ہی ہیں جو اپنی تعلیم کو انبیاء کی طرف منسوب کرتی ہیں یا یوں کہیئے کہ اپنے ہاں کے نوشتوں کو آسمانی کتابیں کہہ کر پکارتی ہیں۔ مغرب کی کسی قوم کا یہ دعوےٰ نہیں کہ

مشرق ان کے ہاں کوئی نبی آیا تھا یا ان کے ہاں کوئی تعلیم ایسی ہے جس کا سرچشمہ ذہن انسانی سے ماوراء ہو۔ ہم اس بحث میں نہیں جانا چاہتے کہ ان اقوام میں فی الواقع کوئی رسول آیا تھا یا نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی تاریخ نے اپنے دامن میں کسی رسول کا ذکر محفوظ نہیں رکھا۔ نہ ہی وہ اقوام اپنی تعلیم کو کسی رسول کی طرف منسوب کرتی ہیں۔ یورپ میں یہودیت

اور عیسائیت عام ہے لیکن ان دونوں مذاہب کے رسول مشرقی ہیں مغربی نہیں. لہٰذا مشرق کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ وحی کی قائل ہے. دنیا کے تمام مذاہب سرزمینِ مشرق ہی کی پیداوار ہیں. لہٰذا یوں کہیئے کہ اقوامِ مشرق مذہب پرست ہیں. مذہب میں ایک طرف کسی بالا ہستی کا تصور ناگزیر ہے اور دوسری طرف کسی نہ کسی شکل میں موت کے بعد کی زندگی کا عقیدہ بھی.

اس کے برعکس مغرب کو لیجئے. وہاں یا تو فلسفہ کارفرما رہا ہے اور یا عصرِ حاضر میں طبیعیات کی بنیادوں پر پیدا شدہ تصوراتِ زندگی، فلسفہ ہو یا طبیعیات، دونوں کا سرچشمہ ذہن انسانی ہے.

مغرب

یہ ماورائے سرحدِ ادراک کے قائل ہی نہیں. ان کے ہاں علوم کا دائرہ محسوسات میں گھرا ہوا ہے. وہاں تمام مسائلِ حیات کا حل تنہا عقل کی رُو سے تلاش کیا جاتا ہے. عقل ہمیشہ وقت کی مصلحتوں کے تابع چلتی ہے اس لئے مختلف اوقات اور مختلف حالات میں عقل کے فیصلے مختلف ہوتے ہیں. لہٰذا، یوں کہیئے کہ مغرب کی دنیا میں مستقل اقدار کا کوئی تصور نہیں. وہاں صرف تقاضائے مصلحت (EXPEDIENCY) فیصلے کا معیار قرار پاتا ہے. وہاں یا تو کسی بالا ہستی کا تصور ہی نہیں ملتا، اور اگر ملتا ہے تو صرف ایسے خدا کا جو کائنات کی مشینوں کو ایک دفعہ کوک دے کر الگ ہو بیٹھتا ہے اور اب یہ مشینری قوانینِ فطرت کے مطابق خود بخود چلے جا رہی ہے. اگر وہ لوگ اس سے ذرا آگے بڑھتے ہیں تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ خدا انہی قوانینِ فطرت کا نام ہے اور چونکہ قوانینِ فطرت دنیائے محسوسات ہی سے متعلق ہیں اس لئے خدا بھی انہی چار دیواریوں میں گھرا ہوا ہے. زندگی، مادی اجزاء میں ایک خاص ترتیب سے پیدا ہوتی ہے اور اسی ترتیب کے منتشر ہو جانے سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے. لہٰذا، انسانی اعمال کا تعلق اسی دنیا سے ہے. اس سے آگے کچھ نہیں.

یہ ہیں وہ متضاد تصورِ حیات اور نظریاتِ زندگی جن کی مظہر مشرق اور مغرب ہیں. اقبالؒ جب مشرق کہتا ہے تو اس سے اس کی مراد یہی تصوراتِ زندگی ہوتے ہیں. بنیادی طور پر یہ تصورات مختلف اقوامِ مشرق میں مشترک ہی کیوں نہ ہوں لیکن کہیں یہ بالکل خالص اور غیر ملوث شکل میں ہیں اور کہیں ان میں ذہنِ انسانی کی آمیزشیں بھی ہو چکی ہیں. یہ اپنی اصلی اور غیر ملوث حالت میں صرف قرآن کے اندر باقی رہ گئی ہیں. اس کے علاوہ ہر مقام پر ان میں انسانی تصورات کی

آمیزش ہو چکی ہے۔ اس لئے اقبالؒ جب مشرق کا نام لیتا ہے تو اس سے اس کا حقیقی مفہوم قرآن ہی کی تعلیم ہوتا ہے۔ اور یہی وہ تعلیم ہے جسے وہ مغربی تصوراتِ حیات کے مقابلے میں لاتا ہے اور انہیں چیلنج دیتا ہے کہ وہ اس کے مقابل میں انسانی زندگی کے مسائل کا حل پیش کریں۔ ایک مرتبہ ایک نجی صحبت میں حضرت علامہ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا تھا جب انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہ تمام انبیاء مشرق ہی میں کیوں آئے مغرب ہی میں کیوں نہ آئے اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں فرمایا کہ بات یوں تھی کہ روزِ اوّل جب خدا اور ابلیس میں جھگڑا ہوا ہے تو ان دونوں نے اپنے اپنے ملک بانٹ لئے تھے۔ مشرق کو خدا نے لے لیا اور مغرب ابلیس کے حصہ میں آگیا۔ یہ ہے وہ مقام جہاں اقبالؒ مغرب کے مقابلے میں ہمیشہ مشرق کی برتری ثابت کرتا ہے۔ یہ برتری درحقیقت عقلِ انسانی کے تراشیدہ نظامہائے زندگی کے مقابلہ میں قرآنی نظامِ زندگی کی برتری کے مترادف ہوتی ہے۔ اقبالؒ کا سارا پیغام اسی برتری کا نقیب ہے اور اسی کو عام کرنے کے لئے اس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اس کی فکر کا ماحصل عقل کے مقابلے میں عشق کی فضیلت اور فوقیت ثابت کرنا ہے اور عشق سے اس کی مراد وحیٔ خداوندی ہوتی ہے۔ عقل ہی کا دوسرا نام اس کے نزدیک تہذیبِ فرنگ ہے۔ دیکھئے کہ وہ "پیامِ مشرق" میں فرنگ کے نام کیا پیغام دیتے ہیں۔

عقل و عشق

از منِ اے بادِ صبا گوئے بہ دانائے فرنگ عقل تا بال کشود است گرفتار تر است

برق را ایں بہ جگر می زند آں رام کند عشق از عقلِ فسوں پیشہ جگردار تر است

چشم جز رنگِ گل و لالہ نہ بیند ورنہ آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است

دانشِ اندوختہ دل زکف انداختہ آہ زاں نقدِ گراں مایہ کہ در باختہ

ذرا آگے چل کر کہتے ہیں۔

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است

دگر است آں سوئے نہ پردہ کشادن نظرے ایں سوئے پردہ گمان و ظن و تخمیں دگر است

اے خوش آں عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست
نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم با اوست

لیکن اقبالؒ کے ہاں مشرق و مغرب سے ایک اور مفہوم بھی ہے اور اس مفہوم کے لئے بھی اقبالؒ نے ان اصطلاحات کو جابجا استعمال کیا ہے۔ مشرق کو تعلیم تو وحی کے ذریعہ سے ملی لیکن اس نے اس تعلیم کو اس درجہ مسخ کر دیا کہ ان کی نگاہوں سے زندگی کا مقصود ہی اوجھل ہو گیا۔ ان کے ہاں حقائق کی جگہ اشخاص پرستی

مذہب پرستی

نے لے لی۔ دین کے نظامِ زندگی کی جگہ دھرم (مذہب) کی رسومات آ گئیں۔ عقل و فکر کی جگہ اندھی تقلید نے لے لی۔ قوائے فکریہ کے ساتھ ہی ان کے قوائے عملیہ بھی مفلوج ہو گئے۔ دنیا کی زندگی کو قابلِ نفرت سمجھ کر انہوں نے اپنی توجہ کو اپنے ذہن کی تراشیدہ "اخروی زندگی"[1] پر مرکوز کر دیا اور اس زندگی سے مفہوم اپنی موہوم امیدوں کے علاوہ کچھ نہ سمجھا۔ نتیجہ یہ کہ تمام اقوامِ مشرق رفتہ رفتہ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئیں۔

ان کے مقابل میں مغرب نے ہر سامنے آنے والے معاملہ کو علم اور عقل کی رُو سے جانچا اور اس کا عملی حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔ قوانینِ فطرت کے مطالعہ اور اشیائے فطرت کے مشاہدے سے انہوں نے قوائے فطرت کو ایک ایک کر کے مسخر کر لیا۔ انہوں نے زمین پر جال بچھا دیئے۔ پانیوں پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ وہ فضا کی پہنائیوں پر مسلط ہو گئے اور اپنی قوتوں سے ساری دنیا پر چھا گئے۔ ان کے ہاں کمی رہ گئی تو فقط یہ کہ ان کے پاس مستقل ضابطۂ حیات ایسا نہ تھا جس سے انسانی معاشرہ میں توازن قائم رکھ سکتے۔

اقبالؒ کے ہاں مشرق سے دوسرا مفہوم دبی پژمردگی اور افسردگی، بے کسی اور بے بسی، محکومی اور نا امیدی، تقلید و جمود اور بے حسی اور بے عملی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مغرب سے مفہوم بیباک قوتیں اور بے ضبط طاقتیں ہوتا ہے۔ اس مقام پر وہ مشرق اور مغرب دونوں پر سخت تنقید کرتا ہے۔ وہ برملا کہتا ہے کہ

مشرق ہمہ افسانہ مغرب زتو بیگانہ　　وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

اقبالؒ کے پیغام میں جہاں جہاں مشرق کی تنقیص ہے وہ اس تصورِ حیات پر تنقید ہے جس نے ان سے زندگی کی حرارت چھین کر ان کی دنیا کو مُردوں کی بستی بنا رکھا ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک نہ مشرق کے یہ

---

[1] وہ اُخروی زندگی نہیں جس کا تصور قرآن نے دیا ہے بلکہ انسانوں کے ذہن کی خود ساختہ اخروی زندگی کا تصور۔

انداز صحیح ہیں نہ مغرب کا وہ اسلوب۔ اس کے نزدیک صحیح نظام زندگی عقل اور عشق کے امتزاج کا نام ہے۔ یعنی دنیا کو وحی کی روشنی میں عقل کی آنکھ سے دیکھنے کا نام۔ اس کے لئے وہ مشرق اور مغرب دونوں کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ

غربیاں را زیرکی ساز حیات　　شرقیاں را عشق راز کائنات

زیرکی از عشق گردد حق شناس　　کارِ عشق از زیرکی محکم اساس

عشق چوں با زیرکی ہمبر شود　　نقشبندِ عالمِ دیگر شود

خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ　　عشق را با زیرکی آمیزدہ

اور یہ قرآن کے پیغام کی صحیح تفسیر ہے۔ اس کے نزدیک مردانِ مومن کی تعریف یہ ہے۔ اُولوا الالباب الذین یذکرون اللہ قیامًا و قعودًا و علیٰ جنوبھم۔ یعنی اربابِ عقل و دانش جو اٹھتے بیٹھتے لیٹتے ہر وقت اپنے سامنے وحی کے محکم قوانین رکھتے ہیں اور انہی کی روشنی میں اپنی عقل سے کام لے کر اپنے زمانہ کے تقاضوں کا حل تلاش کرتے ہیں۔ اقبالؒ دنیا میں اسی قسم کے انسان دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ مغرب والوں سے کہتا تھا کہ وہ مشرق سے وحی کا تصور لے لیں اور مشرق والوں سے کہتا تھا کہ وہ مغرب والوں سے عقل کی باتیں سیکھیں۔ اقبالؒ کا جہانِ نو وہی تھا جس میں ہر کام عقل اور وحی کے اس حسین امتزاج سے طے پائیں اور اس طرح مشرق اور مغرب کی حدود مٹ کر الارض للہ کا منظر عام ہو جائے۔ اسی میں وہ فوز و فلاحِ انسانیت کا راز دیکھتا تھا اور اسی میں وہ قیامِ آدمیت کا امکان پاتا تھا۔

۱۹۵۱ء
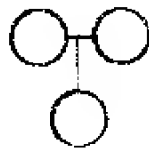
حضرت علّامہ اقبالؒ سے آخری مُلاقات

نوشتہ ۱۹۳۹ء

۳۸ء اور ۳۹ء کی درمیانی شب گزشتہ سال کی ڈائری کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ گزری ہوئی کہانیاں ایک ایک کر کے سامنے آ رہی تھیں۔ جس طرح کوئی چھوٹا سا بادل کا ٹکڑا چاند کے سامنے سے گزرے تو یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ چاند دوڑ رہا ہے یا بادل؛ اسی طرح دن گزرتے جاتے ہیں اور یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں یا زمانہ۔ ڈائری کے اوراق سے بعض بھولے ہوئے افسانوں کی یاد یوں تازہ ہوتی جا رہی تھی جس طرح عرقِ لیموں سے لکھے ہوئے حروف، کاغذ کو آگ کے سامنے رکھنے سے خود بخود اُبھرتے چلے آتے ہیں۔ ابھی چند ورق لٹنے پایا تھا کہ ۱۰ر جنوری کے صفحہ ایک ایسا واقعہ مندرج پایا جس نے نگاہوں کو وہیں روک لیا اور ایسا محسوس ہوا کہ یہ کسی واقعہ کی یاد نہیں بلکہ ایک مضراب ہے جس نے میرے بربطِ ہستی کی تاروں کو یوں چھیڑ دیا ہے کہ ان کے اندر سوتے ہوئے المیہ نغمات پھر سے بیدار ہو رہے ہیں اور شعلہ ریز دیپک کے سروں میں تمام کائنات پر چھائے جا رہے ہیں۔ واقعہ کی تمہید یوں ہے کہ ۹ر جنوری کو دہلی کا "قافلہ" زیرِ امارت مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری بتقریب "اقبال ڈے" لاہور پہنچا۔ رات تک مصروفیت رہی۔ اس اجلاس کا تذکرہ بھی ڈائری میں لکھا پایا۔ لیکن ۱۰ر جنوری کی صبح کے واقعہ کی تفصیل جو ڈائری کے کئی ایک صفحات پر پھیلی ہے کچھ ایسی وجد انگیز ہے کہ جی چاہتا ہے کہ بزمِ طلوعِ اسلام کو بھی اس حظ و کیف میں

شریک کروں بہتر ہو کہ اسے ڈائری کے الفاظ ہی میں سنیئے:۔

۱۰ جنوری بروز سوموار صبح ۹ بجے جاوید منزل واقع میورروڈ پر حاضر ہوئے۔ نذیر نیازی صاحب حسب وعدہ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ حضرت علامہ پلنگ پر استراحت فرما رہے تھے۔ لحاف اوڑھے بلکہ لحاف کے ساتھ ایک کمبل بھی ملفوف تھا حقہ سامنے تھا۔ جو ہمیشہ سامنے رہتا ہے۔ نیازی صاحب نے بتایا کہ جب پچھلے دنوں لارڈ لوتھین ملنے کے لئے آیا تو بھی آپ اسی انداز میں لیٹے لیٹے ملے تھے۔ آواز ابھی تک صاف نہیں ہوئی۔ اس طرح بولتے ہیں جیسے کسی کی گھگھی بندھ رہی ہو۔ مولانا صاحب کی وجہ سے سلسلہ گفتگو اُردو میں چھڑا لیکن آپ کے لب و لہجہ سے حسب معمول پنجابیت صاف نمایاں تھی جسے وہ کسی تکلف کے پردے میں چھپانا نہیں چاہتے۔ عمر قریب ساٹھ برس سمجھئے۔ لیکن اس دفعہ کمزور ہو رہے تھے۔ بایں ہمہ اس کمزوری اور بڑھاپے میں بھی دبدبہ اور عظمت کی وہی شان تھی۔ لیکن سادگی اتنی کہ اگر کسی کا پہلے تعارف نہ ہو تو وہ شاید ہی سمجھے کہ کسی پڑھے لکھے آدمی کے سامنے بیٹھے ہیں۔ پہلے متفرق سلسلہ کلام شروع ہوا۔ آپ کی باتوں میں ہلکی سی ظرافت کی چاشنی جسے ظرافت کی بجائے شگفتگی کہنا زیادہ موزوں گا ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ لیکن آج کل آپ کی علالت کی وجہ سے یہ ضرورت بھی رہتی ہے کہ سنجیدہ گفتگو کو یہاں وہاں سُبک رَد کر دیا جائے۔ ضمناً ایک بات سامنے آگئی۔ فرمایا کہ جب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے واپس آرہے تھے تو مولوی شفیع (مرحوم) بھی ساتھ تھے۔ میں عرشہ جہاز پر کانفرنس کی روئیداد دیکھ رہا تھا کہ کتاب ہاتھ سے گر گئی۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر عرب لڑکے جہاز کے ساتھ ساتھ آرہے تھے مولوی صاحب کو عربی آتی نہیں تھی، گھبراہٹ میں آواز دی کہ یا شیخ! ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهَا۔ وہ سمجھ گئے اور کتاب جو اتفاق سے ایک کشتی میں جاگری تھی اٹھا لائے۔

جاوید نامہ کے متعلق کچھ ذکر آیا تو میں نے عرض کیا کہ دربارِ فرعون کے ساحرین کی قوتِ ایمانی استبدادِ فرعون کا دندان شکن جواب ہے، انہیں جاوید نامہ میں ضرور جگہ ملنی چاہیئے تھی۔ فرمایا کہ جاوید نامہ میں تو بہت سی چیزیں لکھنے سے رہ گئیں۔ جی چاہتا تھا کہ کہیں سید احمد (بریلوی) اور سید احمد (دہلوی)، (سرسید) کی روحوں کو بھی اکٹھا کر دوں۔ یہ بھی نظر انداز ہو گیا اور بھی بہت سی

باتیں میں نے نوٹ کر کے رکھی تھیں۔ اب کسی اور موقعہ پر ان کو لکھوں گا۔

اگلی منزل

میں نے عرض کیا کہ قرآن کریم میں اس منزل کے بعد دوسری منزل کے لئے جہاں ایک طرف انسانوں کے متعلق یہ ہے کہ و الی ربھم ینسلون (وہ اپنے رب کی طرف دوڑتے ہوتے جائیں گے)۔ دوسری طرف خدا کے متعلق بھی ہے کہ وجاء ربك و الملك (کہ تیرا رب اور فرشتے صف در صف آئیں گے) گویا خدا خود اس زمین پر آئے گا اور اشرقت الارض بنور ربھا (زمین اس کے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی) تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی یہ ڈراما کچھ اور سین اسی اسٹیج پر دکھائے گا۔ فرمایا کہ یہ درست ہے لیکن ارض وسما، پستی و بلندی کا تصور تو موجودہ شعور کے تابع ہے۔ جب شعور بدل جاتا ہے تو زمان و مکان (TIME AND SPACE) کے تصورات بھی بدل جاتے ہیں۔ اگلی منزل میں شعور بدل جائے گا۔ کیا معلوم ارض کیا ہو اور سما کیا ہو یا دونوں ایک ہی ہوں۔ اسی لئے تو فرمایا کہ یوم تبدل الارض غیر الارض و السمٰوٰت (جس دن یہ ارض و سمٰوٰت بدل جائیں گے)۔ شعور کی ارتقائی منازل کا تقاضا ہے کہ زمان و مکان کے بُعد باقی نہ رہیں۔ خواب میں دونوں چیزیں باقی نہیں رہتیں۔ نہ وقت کوئی شے رہتا ہے نہ مکان ایک سیکنڈ کے خواب میں ایک شخص بارہ برس امریکہ بھی رہ آتا ہے۔ یہ محض ایک مثال ہے ورنہ کیا معلوم کہ دوسرے شعور میں کیفیت و کمیت کا کیا عالم ہو۔

فرمایا کہ جب میں کیمبرج میں پڑھتا تھا تو (TIME) کے نظریہ پر ایک مقالہ لکھ کر اپنے استاد (MACTAGGART) کے پاس لے گیا۔ اس نے کہا کہ یہ کیا لکھ دیا؟ اس پر لوگ ہنسیں گے۔ میں نے اسے ضائع کر دیا۔ ایک عرصے کے بعد جب برگساں کے نظریئے شائع ہوئے تو ان میں ٹائم کے متعلق وہی کچھ تھا جو میں نے لکھا تھا۔ اس وقت مجھے اپنے مقالہ کے ضائع کر دینے کا بڑا افسوس ہوا اس لئے کہ میرے مقالہ سے قرآن کریم کی حقیقت ثابتہ سامنے آجاتی تھی۔

برگساں اور نیٹشے

اس کے بعد برگساں اور نیٹشے اور اپنے فلسفہ کے اختلافات کی توضیح فرماتے رہے اور بتایا کہ وہ فلسفہ جس کا سرچشمہ علمِ الٰہی ہو کس طرح ایک یقینی شے بن جاتا ہے اور وہ فلسفہ جو محض انسانی دماغ کا رہینِ منت ہو

کس طرح ظن و قیاس کی وادیوں میں سرگرداں رہتا ہے اور جب کبھی اُسے یقین کا رتبہ حاصل ہوتا ہے تو ہو نہیں سکتا کہ وہ قرآن کے خلاف ہو، آپ یہ کچھ بیان فرمارہے تھے اور ہمیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نئی دنیا میں ہیں۔ اس وقت معلوم ہوا کہ ذہنِ انسانی کی وسعتیں کس قدر حدود ناآشنا ہیں اور یہ ہستی جسے دنیا نے محض ایک شاعر کی حیثیت سے پہچانا ہے، علم و ادراک کی کن بلندیوں پر ہے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سر سے پاؤں تک دماغ ہی دماغ ہے اور دماغ بھی ایسا جو ثریا سے ورے کی بات ہی نہ کرتا ہو۔ بڑے بڑے اہم حقائق اور ادق مسائل کو دو دو جملوں میں واضح کرتے جاتے تھے۔

پھر قرآن کے متعلق ذکر آگیا۔ فرمایا کہ جب میں ایف۔ اے میں پڑھتا تھا تو صبح کی نماز کے بعد قرآن کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ والد مسجد سے نماز پڑھ کر آتے تو کبھی منزل ختم کر چکا ہوتا کبھی جاری ہوتی۔ ایک دن آکر پوچھتے ہیں کیا پڑھتے تھے۔ مجھے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آگیا کہ چھ مہینے ہو گئے اور ہر روز دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم پڑھتا ہوں۔ پھر یہ سوال کیسا۔ نہایت نرمی سے فرمایا کہ میں پوچھتا ہوں کہ کچھ سمجھ بھی آتا ہے۔ اب میرا استعجاب اور غصہ جاتا رہا اور کہا کہ کچھ عربی جانتا ہوں کہیں سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ کوئی چھ ماہ بعد ایک دن لے کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ بیٹا قرآن کریم اسی کی سمجھ میں آسکتا ہے جس پر یہ نازل ہوتا ہے۔ میں حیران تھا کہ کیا نبیِ اکرمؐ کے بعد قرآن کریم کسی کی سمجھ میں آ نہیں سکتا۔ فرمایا کہ یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ قرآنِ کریم حضورؐ کے بعد اب کسی پر نازل ہی نہیں ہو سکتا۔ میں پھر حیران تھا؟ فرمایا کہ انسانیت کو جس معراج پر پہنچانا فطرت کا مقصود ہے اس کا نمونہ ہمارے سامنے محمدؐ کی صورت میں پیش کر دیا گیا۔ حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک ہر ایک نبی محمدؐ ہی کے مختلف مدارج تھے۔ وہ سلسلہ گویا تکمیل محمدؐ کے منازل تھے (MOHAMMAD IN THE MAKING) بنیادی اصول ہر جگہ ایک تھا۔ البتہ شعورِ انسانی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ فروعات کی تکمیل ہوتی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ "محمدؐ" مکمل ہو گیا۔ بابِ نبوت بند ہو گیا۔ انسانیت اپنے معراجِ کبریٰ تک پہنچ گئی۔ اب ہر انسان کے سامنے معراجِ انسانیت کا نمونہ محمدؐ ہے۔ کوئی انسان جتنا محمدیت کے رنگ میں

رنگا جاتا ہے اتنا ہی قرآنِ کریم اس پر نازل ہوتا جاتا ہے۔ یہ مفہوم تھا میرے کہنے کا کہ قرآنِ کریم اسی کی سمجھ میں آسکتا ہے جس پر یہ نازل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

یہ تو تھی قرآنِ کریم کے قلب کے راستے سمجھ میں آنے کی صورت۔ دماغ کے راستے سے

قرآن فہمی

سمجھ میں آنے کے متعلق حضرت علامہ نے فرمایا کہ قرآن فطرت اللہ ہے یعنی دنیا میں مختلف اوقات میں مختلف حقائق ظاہر ہوتے۔ کوئی یہاں کوئی وہاں۔ ہر حقیقت فطرت اللہ ہوتی ہے۔ ان حقائق کے منتشر اوراق ایک جگہ جمع کر دیئے۔ اس مجموعہ کا نام ہے قرآنِ کریم۔ اب بھی جہاں کہیں کوئی حقیقت ظاہر ہوگی، وہ لینن کے الفاظ میں ہو یا سنوسی کے قرآن ہی کی کسی آیت کا ترجمہ ہوگا۔ اس لئے کہ حیاتِ انسانی کے لئے جس قدر حقائق کی ضرورت تھی وہ سب کے سب اس کے اندر آچکے ہیں۔ اب قرآنِ کریم کو اس طرح سمجھنا چاہیئے جس طرح یہ دنیا کو ملتا چلا آرہا ہے۔ کبھی ایک حقیقت کسی زرتشت کو ملی تھی، کہیں کسی بدھ کو وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے پہلے ان تمام مذاہب کو دیکھئے۔ وہاں نظر آجائے گا کہ حقائق کون کون سے ہیں اور افسانے کون کون سے۔ حالانکہ اس مذہب والے ان افسانوں کو بھی حقائق ہی سمجھتے ہوں گے۔ ان کے حقائق قرآنِ کریم میں موجود ہوں گے اور ان کے افسانوں کی تردید ہوگی۔ یہ افسانے انسانی دماغ کے وضع کردہ ہوں گے۔ جب تک ان افسانوں سے واقفیت نہ ہو معلوم نہیں ہو سکتا کہ قرآنِ کریم کس چیز کی تردید کر رہا ہے۔ مثلاً قرآنِ کریم میں ہے کہ ہم نے ارض و سما کو لاعبین (IN SPORT) کھیل کود میں پیدا نہیں کیا۔ ہندوؤں کے ہاں ایک عقیدہ ہے کہ یہ تمام کائنات ایشور نے ایک "لیلا" رچائی ہے۔ چنانچہ ان کے ایک خدا کا نام نٹراجن "کھلاڑیوں" کا بادشاہ ہے۔ اس کی مورتی بھی ایسی ہے کہ وہ رنگ راگ میں مصروف ہے اور دنیا پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس افسانہ کی تردید لاعبین کے اندر ہے۔ یا مثلاً قرآنِ کریم میں ہے کہ لا تاخذہ سنۃ ولا نوم (خدا کو اونگھ یا نیند نہیں آتی)۔ ہندوؤں کے ہاں ایک عقیدہ ہے کہ یہ سب کائنات پرماتما کا خواب ہے۔ جب وہ بیدار ہو جائے گا تو یہ خواب بھی پریشان ہو جائے گا۔ خود ہمارے ہاں بھی بعض صوفیا میں اس قسم کا تصور موجود ہے۔ اس افسانہ کی تردید قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں کی ہے۔ لہٰذا قرآنِ کریم سمجھنے کے لئے پہلے اس قسم کے

"افسانوں" کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے۔ خالص حقائق اب قرآنِ کریم کے سوا اور کہیں سے نہیں مل سکتے۔

رسالت رسول کی تعریف (DEFINITION) کے متعلق فرمایا کہ ایک رسول میں اللہ کی طرف سے یہ شعور پیدا کر دیا جاتا ہے کہ وہ امتدادِ زمانہ (LENGTH OF TIME) کو سمیٹ کر ایک حال (PRESENT) کے اندر مرتکز کر لے۔ لہٰذا جو باتیں دوسروں کے نزدیک دو ہزار برس بعد آنے والی ہوتی ہیں وہ رسول کے سامنے زمانۂ مستقبل کی نہیں بلکہ حال کی ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ اپنی وحی میں اس قدر محکم یقین رکھتا ہے کہ اس کی سچائیاں اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں۔ وہ ان کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ اس لئے اس کے دل میں شک و ریب کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔

سیاستِ حاضرہ کے متعلق بہت سی باتیں ہوتی رہیں۔ فرمایا "مجھے تو نظر آتا ہے کہ انہی عوام میں سے کوئی صاحبِ ایمان کھڑا ہو جائے گا اور مسلمانوں کو ایک مرکز پر لے آئے گا۔ اس کی عملی شکل ان کے سامنے وہی ایک اسلامی ریاست (پاکستان) کا تصور ہے۔ فرمایا کہ اس کے سوا ہندوستان کی سیاست کا کوئی اور عملی حل سمجھ میں نہیں آتا۔

یہ سب کچھ اقبالؒ کے دماغ کے متعلق تھا لیکن حقیقی اقبالؒ ان پردوں کے پیچھے قلب کی انتہائی گہرائیوں کے اندر چھپا رہتا ہے۔ ہر چند نیازی صاحب نے کہہ رکھا تھا کہ کسی جذباتی چیز کا تذکرہ نہ چھیڑنا کیونکہ اس کا ان کی صحت پر بے حد مضر اثر پڑتا ہے۔ لیکن ایک بات غیر ارادی طور پر ایسی آ گئی جس سے ہمیں حقیقی اقبالؒ کی ایک جھلک دیکھنی بھی نصیب ہو گئی۔ مولانا صاحب نے دریافت کیا کہ آجکل کوئی تازہ کلام کہا گیا ہے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ زخمہ کس تار پر جا لگے گا۔ فرمایا کہ گزشتہ چھ ماہ سے جب سے حج کا ارادہ ہوا ہے' صبح سے شام تک مدینہ ہی کے راستے میں رہتا ہوں۔ جو کچھ کہتا ہوں وہ بھی کچھ وہیں کی باتیں ہی ہوتی ہیں۔ یہ کہا اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے

طبیعت کچھ سنبھلی تو فرمایا' بہت کچھ دل میں ہے کہ حضورؐ کے آستانہ اقدس پر پہنچوں تو یہ بھی عرض کرونگا وہ بھی۔ راستہ طے کر لیتا ہوں لیکن جب وہاں پہنچتا ہوں تو طبیعت قابو میں نہیں رہتی۔ نیازی صاحب سے فرمایا کہ تازہ کلام سے کوئی شعر ان کو سناؤ۔ انہوں نے ایک شعر سنایا تو فرمایا کہ ہاں ایک شعر یاد آگیا۔ کعبۃ اللہ میں پہنچ کر بہ حضورِ حق یہ عرض کیا ہے کہ:۔

تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز!
کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست!

جذب کیف پہلا مصرعہ تو آسانی سے پڑھ دیا لیکن دوسرے مصرعہ میں "منزلِ دوست" تک پہنچے تو ایک عجیب کیفیت سامنے آئی۔ دیکھا کہ تمام جسم پر ایک ارتعاشی حالت پیدا ہو گئی ہے۔ لیٹے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ یوں محسوس ہوا کہ سارا کلیجہ اُمنڈ کر مُنہ میں آگیا ہے۔ گلا پھول گیا۔ چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اسے بڑی مشکل سے یوں دبایا جیسے کسی چیز کو حلق سے نیچے لیجا رہے ہیں۔ بڑے کرب و اذیت کے بعد انتہائی اضطراب کے عالم میں بچوں کی طرح ہچکیاں لے کر رونے لگے۔ غش کی سی حالت ہو گئی اور نڈھال ہو کر لیٹ گئے۔

ہم ششدر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ یا اللہ! یہ کیا ہو گیا۔ ایک ہیبت سی طاری ہو گئی۔ سارے کمرے میں سناٹا تھا۔ ہمیں رہ رہ کر افسوس آتا تھا کہ ہم نے کیوں اس مضمون کو چھیڑ دیا۔

کچھ دیر اور بیٹھے کہ ان کی طبیعت سنبھل جاتے۔ اجازت چاہی تو مولانا صاحب سے فرمایا کہ ایک دن اور ٹھہرنے کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی! ہماری دفتر کی پابندیاں اس کی کب اجازت دیتی تھیں! طوعاً و کرہاً رخصت ہوتے۔ دیکھا تو بارہ بج چکے تھے۔ تین گھنٹے گزر گئے اور یوں معلوم ہوا کہ شاید پانچ منٹ ہوتے ہیں۔

بعض اوقات زندگی میں چند لمحات حاصلِ زندگی بن جاتے ہیں۔ یہ چند لمحات اسی قسم کے تھے۔ اب کچھ سمجھ میں آیا کہ اقبالؒ کہاں پہنچ چکا ہے۔ دماغ ہے تو عرش کی بلندیوں پر اور قلب ہے تو عشقِ رسولؐ میں خاکستر! اے کاش مسلمانوں کی سمجھ میں آجاتا کہ انہیں فطرت کی کرم گستری نے

کس قدر بیش بہا نعمت عطا فرمائی ہے!　　　　مرقومہ ۱۲، جنوری ۱۹۳۸ء

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس ملاقات میں جتنی باتیں ہوئیں اور جس طرح ہوئیں میں نے وہ سب اس یادداشت میں لکھ لی تھیں۔ بہرحال یہ تھے وہ تاثرات جو میرے ذہن میں باقی تھے جنہیں میں نے محفوظ کر لیا۔ اس وقت اس کی بھی کیا خبر تھی کہ یہ ملاقات آخری ہو گی اور اس کے بعد عالمِ اسلامی کی یہ جلیل المرتبت ہستی ہمیشہ کے لئے آنکھوں سے پنہاں ہو جائے گی۔ اس کمی کو کچھ وہی محسوس کر سکتے ہیں جنہیں کبھی حضرت علامہ کی خدمت میں باریابی کی سعادت حاصل ہوئی ہو۔ آج تو اس قسم کی یادداشتوں کے اوراق ہیں اور دلِ حرماں نصیب کی حسرتیں کہ

دگر دانائے راز آید کہ ناید!

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء

علامہ اقبالؒ کے "یومِ وفات" پر تقریر

بیسویں صدی کا آغاز ہے۔ مشرق کی تہذیب و تمدن کے ٹمٹمانے والے آخری چراغ بھی گُل ہو چکے ہیں۔ مغرب نے ایک نئے نظامِ تمدن کی طرح ڈالی ہے جس کی درخشندگی اور تابناکی نے بڑے بڑے دیدہ وروں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر رکھی ہے۔ دنیا بھر کی قومیں اس تہذیبِ جدید کی نقالی میں فخر و سعادت محسوس کر رہی ہیں۔ جلیل القدر دانایانِ روزگار اس نئے تمدن کو انسانیت کے مصائب و نوائب کے لئے مسیحا سمجھ رہے ہیں۔ بڑے سے بڑے مفکر انسانی دانش و بینش کے اس اوجِ کمال پر نازاں و فرحاں دکھائی دیتے ہیں۔ ہر طرف سے اس نئی روشنی کی مدح و ستائش میں قصائد لکھے جا رہے ہیں۔ چاروں سمت سے تحسین و تبریک کے غلغلے بلند ہو رہے ہیں۔ چھوٹے بڑے اس نسخۂ کیمیا کی برکات کے معترف ہیں۔ ایسا دکھائی دیتا ہے، گویا انسان نے اس فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پالیا جس کی تلاش میں اس نے ساری عمر دشت پیمائیوں اور صحرا نوردیوں میں گزار دی تھی۔ نئے انداز کی سیاست، نئی وضع کی معاشرت، معیشت کے طور طریق نرالے، تعلیم کے ڈھب انوکھے، تمام نظامہائے کہنہ کی بنیادیں تک اکھیڑی جا چکی ہیں۔ اور نئے نقشے کے مطابق بالکل جدید بنیادوں پر اس تہذیبِ نو کے قصرِ فلک بوس کی عمارت اوپر کو اٹھتی چلی جا رہی ہے جس کی رفعت و بلندی، نقش و نگار، آئینہ بندی، حریر و اطلس

کے نگاہ فریب پردے، بجلی کے قمقمے اور ان قمقموں کی عالمتاب روشنی میں ایک رنگین دنیا، ہر دیکھنے والے کی نگاہ کو حیرت کدہ بنا رہی ہے کہ اتنے میں مشرق کے تیرہ و تار ویرانوں کا ایک تیس سالہ نوجوان اس طلسم خانۂ ہوش ربا میں جا نکلتا ہے۔ وہ تہذیبِ نو کے اس جہانِ رنگ و بو میں کھویا کھویا اِدھر اُدھر پھرتا ہے۔ ہر شے پر ایک غائرانہ نگاہ ڈالتا ہے۔ ہر چیز کو متجسسانہ نظر سے پرلھتا ہے۔ کہیں رُکتا ہے تو پہروں کسی گہری فکر میں ڈوبا ہوا خاک کے ذرّوں کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر اٹھتا ہے تو دیوانوں کی طرح اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے۔ ہونہار ایسا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین اسے مستقبل کا درخشندہ ستارہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کے اس کمالِ ہوش میں کچھ ایسے غیر محسوس سے 'جنون' کی آمیزش ہے جو اُسے دوسرے ہوش مندوں سے بجسر الگ کئے ہوئے ہے۔ وہ فکر و نظر اور ہوش و جنوں کے اس نرالے امتزاج سے تہذیبِ جدیدہ کے اس طلسم کدہ کے ایک ایک عنصر کو دیکھتا ہے اور عین اس وقت جبکہ ساری فضا اس نظامِ تمدّن کی توصیف و ستائش میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کے لبوں پر خفیف سی ہنسی اور اس کی آنکھوں میں ہلکے سے تبسّم کی موج کے ہلکورے نظر آتے ہیں۔ وہ اس پورے تماشے کو اپنی نگاہوں کے دامن میں سمیٹ کر لوٹتا ہے اور لبِ ساحل ایک اونچی سی چٹان پر کھڑا ہو کر پیچھے مڑ کر دیکھتا اور بلند آواز سے پکارتا ہے کہ

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا!

اور یاد رکھو کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

سننے والوں نے سُنا اور اُسے مجذوب کی بڑ سمجھ کر ایک فلک بوس قہقہہ لگایا اور اس کے بعد پھر اسی کیف و مستی کی دنیا میں جذب ہو گئے۔ یہاں پہنچنے پر پوچھنے والوں نے پوچھا کہ کہو بھائی! حیرت خانۂ مغرب کی سیر تو کی، وہاں تہذیبِ نو کے "پری محل" کو بھی دیکھا۔ کیا خیال ہے؟ اس نے اپنے مخصوص انداز میں نگاہوں کو اوپر اٹھایا اور کہا کہ ہاں دیکھا! چمک دمک تو بڑی ہے لیکن

پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ سست بنیاد بھی ہے آئینہ دیوار بھی ہے

زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ شیشہ گرانِ فرنگ اپنے کاخِ تہذیب کی آئینہ بندی میں پہلے سے بھی زیادہ تیزی اور انہماک سے مصروف رہے۔ دنیا سے بدستور خدا کی رحمت تصور کرتی رہی۔ انسانیت اسی طرح اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی تا آنکہ ۱۹۱۴ء میں ایک عالمگیر دھماکہ محسوس ہوا دھماکہ زلزلہ کی صورت اختیار کر گیا اور چار برس تک متواتر بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہوتی رہیں۔ میدانوں کا ذرہ ذرہ انسانی خون کی ارزانی کی زندہ داستان بن گیا۔ لیکن مغرب نے اس کے بعد پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا اور اس قصرِ جدید کی تزئین و آرائش اور حفاظت و صیانت میں پہلے سے بھی زیادہ جوش اور سرگرمی سے منہمک ہو گیا۔ سطح بین نگاہوں نے اس "ہوشمند دیوانہ" سے پھر پوچھا کہ اب کیا کہتے ہیں آپ؟ آپ کی وہ پہلی پیشین گوئی تو غلط ثابت ہوئی۔ اس مردِ دانا کی آنکھوں میں پھر تبسم کی لہر دوڑی اور اب کے پہلے سے بھی زیادہ نمایاں ہو کر دوڑی۔ اپنے مخصوص انداز میں سر اٹھایا اور کہا کہ میری آنکھوں نے غلطی نہیں کی۔ میں نے جو کچھ کہا تھا حرف حرف دیکھ کر کہا تھا۔ وہ غلط نہیں ہو سکتا۔ مغرب کو یہ فطرت کی طرف سے پہلی تنذیر ملی تھی۔ وہ اس سے عبرت حاصل کرتے تو بچ جاتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اور میری آنکھیں پھر دیکھ رہی ہیں کہ

فتنہ را کہ دو صد فتنہ در آغوشش بود
دخترے ہست کہ در مہدِ فرنگ است ہنوز

سننے والوں نے اسے سُنا اور سُن کر اَن سُنی کر دی۔ مغرب کے قمقموں کی روشنی اپنی خیرگی میں اور بھی بڑھتی گئی۔ اب ساری دنیا اس کی نقال تھی، اور اس نقالی میں فخر محسوس کرتی تھی۔ پوچھنے والوں نے پھر اس "مجذوب زیرک" سے پوچھا کہ فرمائیے! آپ کیا کہتے ہیں۔ اب تو اس قصرِ بلند کی رفعت کہکشاں تک جا پہنچی ہے۔ اس نے پھر ایک سیلابِ تبسم سے پوچھنے والوں کی طرف دیکھا اور کہا کہ

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے — کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی
الٹ جائیں گی تدبیریں بدل جائیں گی تقدیریں — حقیقت ہے نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی

دنیا نے اس پر ایک قہقہہ لگایا اور مغرب اپنی شیشہ گری اور مشرق اس کی نقالی میں پھر مصروف ہو گیا۔

اور وہ مردِ زیرک پھر اپنی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ مغرب نے زمین پر جال بچھایا۔ مغرب نے آسمان پر قابو پا لیا۔ اس نے پانی پر اپنا تسلط جما لیا۔ اس نے خشکی اور تری کو مسخر کر لیا۔ اس نے اپنی حفاظت کے پورے سامان مہیا کر لئے۔ اِدھر یہ ہوتا گیا اور اُدھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس دانائے راز پر کچھ عجیب سراسیمگی کا عالم طاری ہو رہا ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے اس طرح چونک اٹھتا جس طرح ایک حسین و معصوم بچہ خواب میں دہشت ناک عفریتِ خونخوار کو دیکھ کر چیخ اٹھتا ہے۔ وہ تصور ہی تصور میں کچھ دیکھتا اور یوں ڈر کر سہم جاتا جیسے آگ اور خون کا کوئی سیلاب بلا بڑھتا چلا آ رہا ہو۔ وہ پہاڑی کی چوٹی پر، دُور افق سے اُس پار، کچھ دیکھتا اور بے ساختہ چلا اٹھتا کہ

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے! یہ جوئے خوں ہے
طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ!
وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

وہ دیکھو!

جہانِ نَو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

وہ راتوں کی تنہائیوں میں اکیلا دیوانہ وار اِدھر اُدھر پھرتا۔ کبھی آسمان کے خاموش ستاروں سے باتیں کرتا۔ کبھی ندی کی ساکت روانیوں سے محوِ تکلم ہوتا۔ وہ جنگل کے ویرانوں سے شہر کی اس محفلِ شعر و شراب کی چکا چوند کو دیکھتا جسے بڑے بڑے ہوشمندوں نے باعثِ گرمیٔ کائنات سمجھ رکھا تھا تو ایک ٹھنڈی سانس بھرتا اور اپنے سینے کے داغوں کو نمایاں کر کے پکار اٹھتا کہ

وہ بزمِ عیش ہے مہمان یک نفس دو نفس چمک رہے ہیں مثالِ ستارہ جس کے ایاغ
دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا قریب آ گئی شاید جہانِ پیر کی موت

وہ کبھی کسی نخلستان کے قریب کھجوروں کے جھنڈ کے سایہ میں وجد و مستی میں رقص کرتا اور مطرب

فطرت کی نے نوازی کی ہم آہنگی میں والہانہ انداز میں گاتا نظر آتا کہ

زمانہ کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا تماشا دکھا کر مداری گیا!

ایک حجازی قافلہ پاس سے گزر رہا تھا۔ سالارِ کارواں نے اس تماشے کو حیرت سے دیکھا اور کہا کہ بابا! یہ کیا کہتے ہو۔ آؤ تمہیں دکھائیں کہ اس تہذیب نو نے ہمارے عروقِ مُردہ میں کس طرح ایک نیا خونِ زندگی دوڑا دیا ہے۔ اس نے اس سادہ لوح میر کارواں کی بات سنی اور ہنس کر کہا کہ اے ناداں!

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور

اس نے پوچھا کہ پھر ہو گا کیا؟ بتایا کہ

آنچہ بود است و نباید ز میاں خواہد رفت آنچہ بایست و نبود است ہماں خواہد بود

اس نے پوچھا کہ اس کے لئے کرنا کیا چاہیئے؟ جواب ملا کہ

اگر در دل جہانِ تازہ داری بروں آور
کہ افرنگ از جراحت ہائے پنہاں بسمل افتاد است

اس نے پوچھا کہ کیا دنیائے مسیحیت پھر کسی صلیبی جنگ کے ارادے کر رہی ہے؟ اس مردِ دانا نے کہا کہ نہیں۔

من از بلال و چلیپا دگر نیندیشم کہ فتنۂ دگرے در ضمیر ایام است

اس نے کہا کہ مغرب کے آہنی پنجے تو زمین و آسمان کو اپنی قاہری گرفت میں لئے بیٹھے ہیں۔ اس جنگل سے رستگاری بھلا کیسے ممکن ہے! مردِ قلندر ہنسا اور اس نے کہا کہ اس گرفت کی شدت بجا اور درست۔ لیکن

پانی بھی مسخر ہے ہوا بھی ہے مسخر کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے
دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے

لیکن یہ باتیں اس پوچھنے والے کی سمجھ سے باہر تھیں۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یورپ جو اس قدر

بے پناہ قوتوں کا مالک ہے کبھی تباہ و برباد ہو سکتا ہے، وہ شوکت و سطوت، غلبہ و تسلط، استیلاً و قہرمانی کے اس بحرِ موّاج کو دیکھتا اور کانپ اٹھتا۔ وہ بھلا کیسے باور کرلیتا کہ کہنے والا سچ کہتا ہے لیکن کہنے والا کچھ ایسے حزم و یقین سے کہہ رہا تھا گویا اس کے سامنے سینما کا ایک فلم چل رہا ہے جسے یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بتاتا جاتا ہے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ اس نے اس پوچھنے والے سے کہا کہ تیری حیرت اور استعجاب درست! لیکن جو کچھ میں کہتا ہوں وہ بھی غلط نہیں۔

تونے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج　　　موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ
آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس　　　سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ
کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنیوالے دَور کی دھندلی سی اِک تصویر دیکھ

سننے والے نے سننے کو تو سُنا کہ ان باتوں میں لذت و جاذبیت بہت تھی۔ لیکن اسے محض شاعری سمجھا اور دادِ سخن دے کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے جاتے جاتے بھی اس مردِ قلندر نے اُسے آواز دی اور کہا کہ میری باتوں کو شاعری نہ سمجھ۔ یہ حقیقت ہے۔

چشم بکشائے اگر چشم تو صاحب نظر است　　　زندگی در پئے تعمیر جہانِ دگر است

لیکن سننے والے نے اسے پھر بھی شاعری ہی سمجھا اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اس مردِ دانا نے ایک ٹھنڈی آہ کھینچی اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

مغرب ز تو بیگانہ مشرق ہمہ افسانہ　　　وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

دنیا اپنی روش پر بدستور چلی جارہی تھی۔ تہذیبِ مغرب اپنے پورے شباب پر تھی۔ نظامِ افرنگ کی رعنائیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن یہ فقیرِ کج کلاہ برابر اپنی پکار کو دہرائے جارہا تھا کہ

خدا اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

کسی کی سمجھ میں یہ معمہ نہیں آتا تھا کہ اس دیدہ ور کو کیا نظر آرہا ہے جس کی بنا پر یہ اس شدت و اصرار سے اپنی بات کو دہرائے جارہا ہے لیکن کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے یہ مغنیِ آتش نفس، خلوت و جلوت، بستی اور ویرانہ میں ہر جگہ اپنے پیغام کو پہنچاتے جارہا تھا۔

بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم   غزل سرایم و پیغام آشنا گویم
بخلوتے کہ سخن می شود حجاب آنجا   حدیث دل بزبانِ نگاہ می گویم

جب پوچھنے والے زیادہ اصرار کرتے تو وہ ایک ہلکے سے معنی خیز تبسم سے اتنا کہہ دیتا کہ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اس سے ان کی حیرت اور بھی بڑھ جاتی اور زیادہ کاوش سے بات کریدنے کی کوشش کرتے تو یہ زمزمہ حجاز کا متوالا یارانِ میکدہ سے کہہ دیتا کہ

بگرداں جام و از ہنگامۂ افرنگ کم تر گو
ہزاراں کارواں بگذشت ازیں ویرانہ پے در پے

متجسس قلوب سے تو وہ اس شانِ دلربائی سے باتیں کرتا لیکن اگر کوئی ضد اور کد سے ان حقائق کو جھٹلانے کی کوشش کرتا تو اس سے ذرا کھلے کھلے الفاظ میں گفتگو کرتا اور برملا کہہ دیتا کہ

گفت اے گندم نمائے جو فروش   از تو شیخ و برہمن اندر خروش
حکمتے کو عقدۂ اشیا کشاد   باتو غیر از فکرِ چنگیزی نداد
مرگِ تو اہلِ جہاں را زندگی است   باش! تا بینی کہ انجام تو چیست

وہ کچھ اسی قسم کی باتیں کرتا لیکن اس کی باتوں میں کچھ ایسی حلاوت تھی کہ ہر ایک کا جی چاہتا کہ اس سے ذرا اور قریب ہو کر اس کی باتیں سنی جائیں۔ لوگ قریب تر ہوتے تو وہ ذرا اور دُور ہو جاتا کہ اپنا محرم راز کسی کو نہ پاتا۔ وہ اپنی باتیں اپنے دل سے زیادہ اطمینان سے کرتا لیکن غیر سے کرتا یا اپنے آپ سے۔ آنے والے انقلاب کے تصور سے اس کا دل طلسمِ پیچ و تاب بنا رہتا۔ وہ رات کی تنہائیوں میں اُٹھ اُٹھ کر روتا اور دعائیں مانگتا کہ

یا بکش در سینۂ من آرزوئے انقلاب
یا دگرگوں کن نہادِ ایں زمان و ایں زمیں
یا چناں کن یا چنیں!

وہ زمانہ کی بے کیف گردشِ دولابی سے گھبرا اٹھتا اور خالقِ فطرت سے اپنے عجیب محبوبانہ انداز

ہیں کہتا کہ

طرحِ نو افگن کہ ما جدّت پسند افتادہ ایم   ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

زمانہ آگے بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے نواز کی نوا میں تلخی اور نے میں سوز بھی زیادہ ہوتا گیا۔ وہ اب حقائق کو زیادہ نکھرے ہوئے الفاظ میں بیان کرنے لگ گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جو چیزیں اس کے عالمِ تصور میں دھندلے سے خواب کی صورت میں متشکل تھیں اب محسوس پیکر اختیار کر رہی ہیں۔ اب وہ کُھلے کُھلے الفاظ میں کہتا کہ

یہ عناصر کا پرانا کھیل یہ دنیائے دوں
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں
اس کی بربادی پر آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں

(ابلیس کی مجلسِ شوریٰ۔ ارمغانِ حجاز آخری تصنیف)

ابلیس کے ایک دوسرے مشیر کی زبان سے کہلوایا گیا ہے۔

زاغِ دشتی ہو رہا ہے ہمسرِ شاہین و چرخ   کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار
چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر   جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار
فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج   کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے   جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

غرضیکہ وہ صاحبِ خرد و جنوں اس تہذیب کے مآل سے دنیا بھر کو آگاہ کئے جاتا رہا۔ لیکن دنیا کی وہی حالت رہی کہ اس کی باتوں کو سُنا اور اپنے دھندوں میں مصروف ہو گئے۔ زمانہ یونہی گزرتا گیا کہ ایک دن بستی والوں نے دیکھا کہ یہ مردِ درویش کچھ اس انداز سے مضطرب و بیتاب ہے جس طرح بعض پرندے طوفان آنے سے پیشتر اضطراب و سراسیمگی میں اِدھر اُدھر اُڑتے اور چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ بابا خیر ہے! آج یہ بے کلی اور بے چینی کیوں ہے؟ کہا کہ تمہیں کیا بتاؤں۔ اگر عافیت چاہتے ہو تو اب بھی اپنے آپ اور اپنی نسلوں کو خدائے قوی و مقتدر کی حفاظت میں لے آؤ۔ ورنہ یاد رکھو کہ طوفانِ بلا انگیز میں خس و خاشاک

کی طرح بہ جاؤ گے۔

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

بستی والوں نے سُنا اور حسبِ دستور ایک خفیف سی ہنسی سے اس کا استقبال کیا۔ رات کو معمولاً محفلِ رقص و سرود میں محوِ کیف و سرور رہے۔ آخرِ شب آنکھ لگی تو محسوس ہوا کہ گویا زلزلہ کے جھٹکے آرہے ہیں۔ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ دیوانگی میں اِدھر اُدھر بھاگے۔ دیکھا تو اس قصرِ مشید کی بنیادیں تک ہل رہی ہیں جس کے متعلق کبھی تصور میں بھی نہ آتا تھا کہ متزلزل ہو سکے گا۔ آندھی اور جھکڑ کا طوفان، زلزلے کے جھٹکے، یہ مکان گرا وہ دیوار ٹوٹی، باہر تند و تیز بارش، اندر تباہی و بربادی۔ سامنے ڈنزگ کی پہاڑیوں کو دیکھا تو آتش فشاں چوٹیوں سے لاوے کا سیلاب اُمنڈا چلا آرہا ہے[1] اور جو کچھ سامنے آتا ہے اسے اپنے مہیب شعلوں کی لپیٹ میں لئے بربادیوں کے جہنم میں دھکیلتا چلا جاتا ہے۔ بستی والوں کو اپنے پرائے کا کچھ ہوش نہ تھا۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ وہ مردِ دانا کیا کہتا تھا۔ اس سراسیمگی میں اٹھے اور اس فقیر کی کٹیا کی طرف لپکے کہ اسی دانائے راز سے پوچھیں کہ اس سیلابِ فنا سے بچنے کی کوئی صورت بھی ہے۔ بھاگے بھاگے گئے۔ پہنچے لیکن دیکھا تو کٹیا خالی ہے۔ وہ مردِ درویش کہیں چلا گیا۔ سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہ اب کوئی تدبیر سجھائی نہیں دیتی تھی۔ کٹیا کے اندر عین وسط میں نورِ قرآنی کی قندیل جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ ایک طرف ایک کدوئے کہنہ میں عشقِ محمدیؐ کی شرابِ کوثرین چھلک رہی تھی اور سامنے دیوار پر جبریل کے پروں سے لکھا تھا کہ

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟
نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید؟

○

بستی والوں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو ایک طرف ایک کشکول دکھائی دی جس پر جلی حروف

---

[1] دوسری جنگِ عظیم کا آغاز۔

میں لکھا تھا۔

بحضورِ ملت

دیکھا تو اس میں کاغذ کے کچھ ٹکڑے نہایت ترتیب سے رکھے ہیں۔ سب سے اوپر ۱۹۰۷ء کا ایک ٹکڑا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب ملتِ بیضا کا انحطاط اپنی انتہائی پستی تک پہنچ چکا تھا اور کہیں کسی طرف سے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی۔ عین اس مایوسی اور بے کسی کے ماحول میں اس امیدوں کے شہزادے نے گرتی ہوئی قوم کا بازو تھاما اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ کیوں گھبراتے ہو۔ کیوں خوف کھاتے ہو؟

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
سفینۂ برگِ گُل بنالے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

لوگوں نے سُنا اور معنی خیز تبسم سے اس کا استقبال کیا کہ انحطاط کا یہ عالم اور اس پر یہ "موہوم" امیدیں! اس کے نیچے ۱۹۱۲ء کا ایک پرزہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب جنگِ بلقان میں ملتِ اسلامیہ کے ترکش کا آخری تیر بھی نشانہ خطا کر کے ٹوٹ کر گر چکا تھا۔ سطوتِ اسلامیہ کے ابھرنے کی بظاہر کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ مایوسیوں کی تاریکی نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ اس ظلمت و تاریکی میں وہ شمع بردارِ کاروانِ حجاز اٹھا اور اپنی مخصوص لَے میں پکار کر کہا کہ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ آ ۔۔ اور ۔۔ جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ ۔۔ دیکھ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ کہ کس طرح

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش　　اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار　　نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک　　بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں　　محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اس کے ساتھ ہی ایک اور ٹکڑے پر یہ لکھ رکھا تھا۔

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی　　کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی　　گل بر انداز ہے خونِ شہدا کی لالی

رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنّابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے　　(جوابِ شکوہ)

اُدھر یورپ کے میدانوں میں خونِ مسلم کی یوں ارزانی ہو رہی ہے اور ادھر ہندوستان میں ان ہی دنوں ایک ایسی تحریک کی ابتدا تھی جو آتشِ خاموش کی طرح وحدتِ ملت اور عالمگیریتِ اسلام کو اندر ہی اندر جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دینے والی تھی۔ اس مردِ دانا کی نگاہِ دوررس اگر ایک طرف لالہ زارِ مغرب کے آتشیں منظر پہ محوِ خوننابہ نشانی تھی تو دوسری طرف اس تحریکِ جدید کی ہلاکت سامانیوں سے بھی غافل نہ تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب یہ چیز کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ قومیت پرستی (یعنی وطن کو وجہِ جامعیت قرار دے کر متحدہ قومیت کی تشکیل) میں بھی مسلمانوں کے لئے کسی قسم کا کوئی خطرہ ہے۔ بڑے بڑے دردمندانِ ملت اپنی وطن پرستی پہ فخر کرتے نظر آتے تھے۔ لیکن ان سب میں اکیلا یہ مردِ دانا تھا جس نے بلند آہنگی سے پکار کر کہا کہ

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور　　ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور　　تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ وہ زمانہ تھا جب تہذیبِ مغرب کی تقلید میں نیشنلزم گویا وطن کا فیشن بن رہی تھی۔ مہذب ہونے کا ثبوت یہ تھا کہ انسان نیشنلسٹ ہو۔ عین اُس زمانہ میں اس دیدہ ور کی نگاہوں نے دیکھ لیا کہ یہ نیا فتنہ کس قدر اسلام کے بنیادی خطوط سے متضاد و متبائن ہے۔ اس نے قوم کو جھنجھوڑ کر کہا کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر　　خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار　　قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اس لیے کہ:

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے!

اس کے بعد ایک اور ورق ملا۔ یہ اس زمانہ کا لکھا ہوا تھا جب ہندوستان میں جدید اصطلاحات کا دور دورہ تھا جس کی رو سے یہاں مغربی انداز کے جمہوری نظام کی طرح ڈالی گئی تھی۔ یہ وقت وہ تھا کہ مغربی جمہوریت کو نوعِ انسان کی تمام مصیبتوں کا حل بتایا جاتا تھا۔ اسی میں اصل آزادی کا راز مضمر سمجھا جاتا تھا۔ تمام ہندوستان نے جمہوری نظام کی طرف ان اصلاحی اقدام کا خیر مقدم کیا حتیٰ کہ مسلمانوں کی طرف سے بلند آہنگی سے نعرے لگنے شروع ہو گئے کہ اسلام جمہوریت کا مذہب ہے اور کسی نے یہ نہ سمجھا کہ اس جمہوریت اور اسلامی جمہوریت میں کس قدر بُعد المشرقین ہے۔ یہ جمہوریت وہ تھی جس کی رُو سے قانون سازی کا اختیار انسانوں کی ایک جماعت کو تفویض کر دیا جاتا تھا اور یوں اقلیت پر اکثریت کے فیصلوں کی پابندی لازم تھی۔ اِدھر ساری دنیا اور ہندوستان کے مسلمان ان جمہوری اصلاحات پر چراغاں کر رہے تھے اور اِدھر یہ مردِ دانا انہیں متنبہ کر رہا تھا کہ یاد رکھو!

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایاتِ حقوق طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

اس ورق کے دوسری طرف لکھا تھا۔

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمے شود

ان ہی دنوں کا لکھا ہوا ایک اور ورق ملا۔ زمانہ وہ تھا جب یورپ کے گدھ، ترکی کے مردِ بیمار کی لاش

پر منڈلا رہے تھے۔ عرب و عجم میں مسلمانوں کی رہی سہی قوتیں بھی ختم ہو رہی تھیں۔ (پہلی) جنگِ عظیم کے بعد کے اثرات سے ملّتِ اسلامیہ کا جسمِ ناتواں نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ زمانہ جس میں

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل — خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہو گیا مانندِ آبِ ارزاں مسلماں کا لہو — مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

اس عالمگیر مایوسی میں جب کہیں سے شعاعِ اُمید جلوہ افروز نظر نہیں آتی تھی، اس مردِ مومن نے اپنی قرآنی فراست سے دیکھا کہ مایوسیوں کے ان خوفناک بادلوں کے پیچھے امید کی سنہری کرن بھی موجود ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر ڈوبتی ہوئی قوم کو حوصلہ دیا کہ وجہ اضطراب کچھ نہیں۔

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی — افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا — سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی!
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونیوالا ہے
شکوہِ ترکمانی ذہنِ ہندی نطقِ اعرابی

اس کے نیچے لکھا تھا۔

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا — خلیل اللہ کے دریا میں ہونگے پھر گہر پیدا
کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے — یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

ادھر اس قدر تابناک امیدوں کی قندیل کو روشن کیا، لیکن اس کے ساتھ ہی یورپ کی ہمسائیگی میں بسنے والے ترکوں کو اس سے بھی آگاہ کر دیا کہ یاد رکھو کہیں تم بھی تہذیبِ مغرب کے فریب میں نہ آجانا۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی — یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو — ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے
تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

پھر ایک اور یادداشت ملی۔ یہ اس زمانہ میں لکھی گئی تھی جب روس کا بالشویکی نظام عالمگیر حیثیت اختیار کئے جا رہا تھا۔ اور چونکہ یہ نظام سرمایہ داری کا ردِّ عمل تھا اور گھبرایا ہوا انسان یہ سمجھ رہا

تھا کہ بس وہ تریاق ہاتھ آگیا جو زمانۂ حاضر کے ہر قسم کے زہر کا مداوا ہے۔ اسی لئے اپنے مرکز سے ہٹا ہوا مسلمان بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ ہاں! یہ نظام عین اسلامی نظام ہے۔ اس عالمگیر غلغلہ اندازی میں اس مردِ دانا نے اس نظامِ اشتراکیت کا تجزیہ کیا اور فریب خوردہ مسلمان سے کہا کہ یاد رکھو قومیں صرف تخریب (لَا) سے زندہ نہیں رہا کرتی۔ اس کے ساتھ تعمیر (اِلَّا) کی بھی ضرورت لاینفک ہوتی ہے۔ نظامِ اشتراکیت پر غور کرو۔

فکرِ او در تُندِ بادِ لَا بماند ۔۔۔ مرکبِ خود را سوئے اِلَّا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں ۔۔۔ خویش را زیں تند باد آرد بروں
در مقامِ لَا نیاساید حیات ۔۔۔ سوئے اِلَّا می خرامد کائنات

لَا و اِلَّا سازو برگِ امتاں
نفیِ بے اثبات مرگِ امتاں

پھر ایک اور یادداشت ملی۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب یورپ نے بین الاقوامی معاملات کے تصفیہ کے لئے مجلسِ اقوام کی طرح ڈالی تھی اور دنیا خوش تھی کہ اب نزاع اور جھگڑوں کا زمانہ ختم ہوگیا۔ جنگ نابود ہوگئی۔ اب کمزوروں پر ظلم و استبداد روا نہیں رکھا جائے گا۔ ہر ایک کی دادرسی ہوگی۔ دنیا خوش اور مطمئن تھی لیکن اس مردِ دانا نے سر ہلا دیا اور کہہ دیا کہ

برفتد تا روشِ رزم دریں بزمِ کہن ۔۔۔ دردمندانِ جہاں طرحِ نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند ۔۔۔ بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

اس کے نیچے لکھا ہے ؎

نقشِ نو اندر جہاں باید نہاد ۔۔۔ از "کفن دزداں" چہ امید کشاد
در جنیوا چیست غیر از مکر و فن ۔۔۔ صید تو ایں میش و آں نخچیرِ من
نکتہ ہا کو می نگنجد در سخن ۔۔۔ یک جہاں آشوب و یک گیتی فتن

ادھر یہ ہو رہا تھا اور اُدھر ہندوستان میں وطن پرستی، متحدہ قومیت کا دامِ ہمرنگِ زمین وسیع

لہ لیگ آف نیشنز سے مراد ہے جس کا ہیڈکوارٹر جنیوا تھا۔

سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا اور بھولا بھالا مسلمان بلا سوچے سمجھے اپنے ہاتھوں اس دام کے حلقے کستا چلا جا رہا تھا۔ لیکن یہ دانائے راز برابر پکارتا چلا جا رہا تھا کہ یاد رکھو یہ سرابِ رنگ و بُو ہے۔ یہ تمہاری غلامی کی نئی زنجیریں ہیں۔ وطن کی بنا پر قومیت کا تصور تمہیں دورِ اسلام سے نکال کر عہدِ جاہلیت کی طرف لے جائے گا۔

ایک کاغذ کے پُرزے پر اس بحری تار کی نقل تھی جو گول میز کانفرنس میں شریک ہونے والے نمائندوں کے نام بھیجی گئی تھی کہ دیکھنا کہیں مخلوط انتخاب کو تسلیم نہ کر لینا۔ یہ تمہاری جمعیتِ اسلامی کی بنیادیں اکھیڑ کر رکھ دے گا۔ ایک یادداشت کا تھوڑا سا ٹکڑا موجود تھا جس پر نہرو رپورٹ کی مخالفت کی تلقین تھی۔ ۱۹۳۰ء کی لکھی ہوئی ایک لمبی چوڑی دستاویز ایک خریطہ کے اندر سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ اس میں بڑے کام کی باتیں تھیں۔ ایک مقام پر جلی حروف میں لکھا تھا:۔

> میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ ہندوستان کو حکومتِ خود اختیاری زیرِ سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر کچھ بھی ہو۔ مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ ریاست کا قیام اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔[1]

بستی کے لوگ کشکول کی ان دستاویزوں کو کھول رہے تھے اور فقیر کی ہیبت ان کے دلوں پر چھائے جا رہی تھی۔ وہ محسوس کرتے تھے گویا وہ ابھی تک کٹیا کے اندر ہی ہے۔ ان دستاویزوں کا انداز کچھ ایسا لاہوتی سا تھا کہ وہ اس زمین کی باتیں نظر ہی نہیں آتی تھیں۔

پھر کچھ اور متفرق یادداشتیں ملیں۔ کسی میں افسردہ دل صوفی سے کہا گیا تھا کہ

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علمِ لاہوتی	حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور	تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

کہیں ظواہر پرست مُلّا سے مخاطب تھا کہ:۔

---

[1] خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم لیگ۔ منعقدہ الٰہ آباد۔

فقیہِ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور — کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی — اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

کہیں اس زمانہ کے جھوٹے مدّعیانِ امامت و نبوّت سے خطاب کیا تھا کہ

فتنۂ ملّتِ بیضا ہے امامت اس کی — جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

کہیں افرنگ زدہ مسلمان سے کہا گیا تھا کہ

ترا وجود سراپا تجلّیِ افرنگ — کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے خالی ہے — فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

کہیں اربابِ فنونِ لطیفہ کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا کہ

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

کہیں فلسفہ دانوں کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا کہ

سُن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز
انجامِ خرد ہے بے حضوری — ہے فلسفۂ زندگی سے دوری

بستی والے ان یادداشتوں کو دیکھتے تھے اور حیران ہوتے جاتے تھے کہ یہ مردِ قلندر کس مقامِ بلند پر تھا کہ اس کے سامنے ہر شے اپنی اصلی شکل میں بے نقاب ہو جاتی تھی اور وہ ان تمام چیزوں کے محاسن و معائب کو کس طرح کھلے کھلے الفاظ میں بیان کر دیتا تھا اور یہ سب کچھ اس چھوٹی سی کٹیا کے اندر بیٹھے بیٹھے، اس کی نگاہ کس طرح

یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خم خانہ مے

اپنے دامن میں رکھتی تھی کہ زندگی کا کوئی شعبہ اور علم و سائنس کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس کو یہ محیط نہ ہو۔ ایک پرزہ دیکھا تو اس پر گویا آتشیں حروف میں چند شعر لکھے ہوئے ملے۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ — ز دیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است — چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

پڑھنے والوں میں سے ایک نے کہا کہ جن صاحب کا نام لیا گیا ہے یہ تو سُنا ہے کسی دینی مکتب کے صدر مدرس تھے۔ ایک گوشے میں ایک سفید ریش بزرگ بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو واقعی صدر مدرس تھے لیکن اس فقیرِ دانا کو تم کیا سمجھے ہو۔ اس کی شکل وصورت اور وضع قطع پر نہ جاؤ۔ اس کے لگنے کا عالم ہم نے تو اپنی زندگی میں دیکھا نہیں۔ بستی والے یہ سب کچھ دیکھ اور سُن رہے تھے اور بیٹھے سر پیٹ رہے تھے کہ ہم نے اس دانائے راز کی کچھ قدر نہ کی۔ یہ تو بیٹھے ہی بیٹھے دنیا کو کچھ سے کچھ کر گیا ہے۔ بستی والوں نے اس مردِ بزرگ سے پوچھا کہ سائیں بابا! یہ تو بتاؤ کہ یہ مردِ دانا اس قسم کی باتیں کہتا کس طرح سے تھا! یہ تو ہمیں کسی اور ہی دنیا کا انسان نظر آتا ہے۔ اس نے کہا کہ لوگوں کی یہی تو بھول ہے۔ یہ مردِ دانا اِسی دنیا کا انسان تھا۔ اس نے نہ (معاذ اللہ) نبی ہونے کا دعویٰ کیا نہ مہدی کا۔ نہ وہ مجدّدیت کا مدّعی ہوا نہ امامت کا۔ اس نے اپنے آپ کو سیدھا سادا مسلمان کہا اور بس۔ بستی والوں نے پوچھا کہ ہماری بات تو وہیں کی وہیں رہی کہ جب اس نے کوئی دعویٰ بھی نہیں کیا تو پھر وہ ایسی باتیں کس طرح کہتا تھا۔ مردِ بزرگ نے کہا کہ میں نے خود اس سے یہ سوال کیا تھا جس کے جواب میں مردِ دانا نے اپنے مخصوص تبسم سے کہا تھا کہ اس میں "کرامات" کی کوئی بات نہیں اپنی آنکھیں جن پر کسی بیرونی اثر کا رنگین چشمہ نہ ہو اور قرآنِ کریم کی روشنی۔ اس سے وہ فراست پیدا ہو جاتی ہے جس سے ہر شے کی حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

میانِ آب و گِل خلوت گزیدم — ز افلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزہ چشم — جہاں را جُز بچشمِ خود ندیدم

"میری صہبائے بصیرت" (مردِ دانا نے کہا) خمکدۂ حجاز سے سربمہر آبگینوں میں آتی ہے جس میں خالص قرآن ہوتا ہے۔" یہ کہا اور مردِ دانا کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ فرمایا کہ کیا آپ نے میری وہ دعا نہیں سنی جو آہِ سحرگاہی اور نالۂ نیم شبی کے حقیر سے نذرانے کے ساتھ میں نے بحضور خواجہؐ کونینؐ پیش کی ہے۔ سنئے کہ میں نے کیا درخواست پیش کی ہے۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است — ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن — ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا — بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

آخری مصرع پڑھا اور پڑھتے ہی وہ مردِ دانا بچوں کی طرح ہچکیاں لے کر رونے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا سر سے پاؤں تک قلب ہی قلب ہے۔ جو سوز و گداز و تپش و خلش کا نازک آبگینہ ہے۔

بستی والے اس مردِ بزرگ کی باتیں سُن رہے تھے۔ ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو اور دل میں طلسمِ اضطراب موجزن تھا۔ انہوں نے دیکھا تو ایک پُرزے پر لکھا تھا۔

پس از من شعرِ من خوانند و مے یابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

بستی والوں نے اس شعر کو دیکھا اور بلک بلک کر رونے لگ گئے۔ جب ذرا سنبھلے تو کہا کہ اے کاش! ہمیں یہ بھی بتا دیا ہوتا کہ بالآخر اب ہم کیا کریں۔ دیکھا تو ایک ورق پر لکھا تھا۔

اے اسیرِ رنگ، پاک از رنگ شو		مومنِ خود کافرِ افرنگ شو
رشتۂ سود و زیاں در دستِ تست		آبروئے خاوراں در دستِ تُست
ایں کہن اقوام را شیرازہ بند		رایتِ صدق و صفا را کن بلند
اہلِ حق را زندگی از قوت است		قوتِ ہر ملت از جمعیت است

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں
قوتِ بے رائے جہل است و جنوں

بستی والے افسردہ و غمگین کٹیا سے باہر آ گئے۔ ہر ایک کی آنکھیں متلاشی اور قلب متمنی تھا کہ اے کاش وہ مردِ دانا کہیں سے پھرتا پھراتا ایک مرتبہ پھر اِدھر آ نکلے۔ وہ اسی سوچ میں ڈوبے ہوئے آہستہ آہستہ جا رہے تھے کہ انہوں نے سُنا کہ دُور پہاڑی کے دامن میں بیٹھے بیٹھے سروں میں کوئی گا رہا تھا کہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
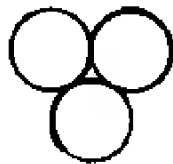
اقبالؒ کی کہانی خود اقبالؒ کی زبانی

یومِ اقبالؒ ۱۹۵۱ء کی تقریر

یہ کہانی "سوانحعمری" نہیں جس میں ترتیبِ واقعات کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے
یہ صرف اقبالؒ کے قلب و دماغ کی مختلف کیفیتوں کا مطالعہ ہے جسے
زمان و مکان کی قیود سے الگ ہٹ کر پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس "کہانی"
کو اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھئے۔

برادرانِ عزیز!

علامہ اقبالؒ نے اپنے آخری کلام "ارمغانِ حجاز" میں کہا ہے کہ

چو رختِ خویش بر بستم ازیں خاک   ہمہ گفتند با ما آشنا بود
و لیکن کس ندانست ایں مسافر   چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

جب کیفیت یہ ہے کہ خود اقبالؒ کے اپنے اندازے کے مطابق کوئی شخص اقبالؒ کی حقیقت سے کماحقہٗ واقف نہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر حقیقی اقبالؒ کی جھلک دیکھی کہاں سے جاتے؟ اس سوال کا جواب چنداں مشکل نہیں اس لئے کہ اقبالؒ خود اپنے متعلق اتنا کچھ بتا گیا ہے کہ اس سے اقبالؒ کی پوری تصویر نگۂ تجسس کے سامنے آجاتی ہے۔ میرے لئے تو یہ مشکل ہے کہ اس مختصر سے وقت میں اس پوری تصویر کے تمام گوشوں کی تفاصیل آپ کے لئے جنتِ نگاہ بنا سکوں۔ اس وقت صرف اتنا ہو سکے گا کہ اس کے اُبھرے ہوئے نقش و نگار اور نمایاں خط و خال سامنے لائے جاسکیں۔ اس

مرقع نگہ تاب اور پیکر خوش انداز کی تفصیلی گل کاریوں اور جلوہ طرازیوں کو میں نے اپنی اس تصنیف کے لئے اٹھا رکھا ہے جو "پیامِ اقبال اور قرآن کریم" کے عنوان سے برسرِ پیش نظر ہے اور جسے میں حضرت علامہ کے ان احسانات کی بنا پر، جن سے میری نگہ تشکر ہمیشہ نگوں سار ہے، اپنے ذمہ ایک قرض سمجھتا ہوں۔ خدا مجھے اس قرض سے سبکدوش ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم۔

اس وقت میری دوسری مشکل یہ ہے کہ حضرت علامہ کے کلام کا بیشتر حصہ فارسی میں ہے اور اس قسم کا مخلوط مجمع فارسی زبان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مجھے تو راُن کے اُردو کلام ہی پر اکتفا کرنا ہوگا اور فارسی اشعار صرف ان مقامات پر پیش کئے جائیں گے جہاں ایسا کرنا ناگزیر ہو۔

اب سنئے اقبالؒ کی کہانی، خود اقبال کی زبانی۔

انیسویں صدی کے آخر شب کے ستارے جھلملا رہے ہیں اور بیسویں صدی کی نازنینہ سحر انگڑائیاں لے رہی ہے۔ قلبِ زندہ دلانِ پنجاب یعنی لاہور کی کیف بار فضائیں، شباب و شعر کی نگہتوں اور رنگ و تعطر کی نزہتوں سے دامانِ باغبان و کفِ گل فروش کا منظر پیش کر رہی ہیں۔ گورنمنٹ کالج کی درس گاہ اپنے معیارِ تعلیم کی پابندی کے ساتھ ساتھ دولت مند خاندانوں کے عشرت پسند نونہالوں کی لااُبالیوں کے لئے دُور دُور تک شہرت حاصل کر چکی ہے کہ اتنے میں سیالکوٹ کے ایک متوسط خاندان کا نہایت ذہین طالب العلم اس حیرت کدۂ علم و تماشا میں آنکلتا ہے۔ شروع شروع میں جہاں وہ نوجوان اس فضا کو اپنے لئے غیر مانوس پاتا ہے وہاں خود وہ فضا بھی اس نو وارد کو اجنبی سا محسوس کرتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ نو وارد طالب العلم اپنی سحر طرازیوں سے اس پوری فضا پر چھا جاتا ہے اور جس محفل میں شریک ہو جاتا ہے اسے تبسم فشاں و قہقہہ بار بنا دیتا ہے۔ تعلیمی منازل میں اس کا یہ عالم ہے کہ اساتذہ اس کا معلم کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ دوستوں کی مجلس میں یہ کیفیت کہ ہر شخص اس کے قریب تر ہونے میں ایک خاص نشاطِ روح محسوس کرتا ہے۔ اس کی شرکت سے شعر و سخن کی محفلوں میں ایک تازہ حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ تھوڑے ہی دنوں میں یہ محسوس ہونے لگ جاتا ہے کہ

اس سے بیشتر لاہور محض ایک پیکرِ آب و گل تھا اور اس میں زندگی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ

کالج کا زمانہ

پہلے پہل ابھی مسکرائی ہے لیکن اس کے باوجود اس نوجوان کی حالت یہ ہے کہ وہ اس محفلِ طرب و نشاط کے کسی ساز کو اپنا ہم آہنگ اور اس گل کدۂ حسن و تماشا کے کسی پھول کو اپنا ہم رنگ نہیں دیکھتا۔ اسے ہر ایک اپنا ہمنوا اور اپنا ہم ذوق سمجھتا ہے لیکن وہ کسی کو بھی اپنا ہم صفیر و ہم نگاہ نہیں پاتا۔ اس کی شرکت سے اجڑی ہوئی محفلوں پر بھی بہار آجاتی ہے۔ لیکن یہ بھری محفلوں میں بھی اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کسی شے کی جستجو ہے جس نے اسے سراپا اضطراب بنا رکھا ہے۔ کوئی خلشِ تجسس ہے جو اسے کسی پہلو چین نہیں لینے دیتی۔ وہ اپنی تشنگیٔ ذوق کی تسکین کے لئے ہر دور سے نظر آنے والے چشمہ کی طرف لپکتا ہے لیکن اسے سراب پاکر مضطرب و بیقرار واپس آجاتا ہے۔ وہ کبھی اس تسکینِ خاطر کے لئے لارنس گارڈن میں جانکلتا ہے لیکن اس جہانِ رنگ و بو کی جمال افروز شادابی و شگفتگی بھی اس کے لئے جاذبِ نگاہ نہیں بنتی۔ وہ ایک حسین شاخ پر مسکرانے والے "گُلِ رنگیں" کو نہایت غور سے دیکھتا ہے اور اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ

توشناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں ‌ ‌ ‌ اے گُلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیبِ محفل ہے شریکِ شورشِ محفل نہیں ‌ ‌ ‌ یہ فراغت بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں

اس چمن میں میں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو

سوزبانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے ‌ ‌ ‌ راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے
میری صورت تو بھی اِک برگِ ریاضِ طور ہے ‌ ‌ ‌ میں چمن سے دور ہوں تو بھی چمن سے دُور ہے

مطمئن ہے تُو پریشاں مثلِ بُو رہتا ہوں میں
زخمیٔ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

ہو سکتا تھا کہ وہ اس خلشِ پیہم اور سوزِ مسلسل کے ہاتھوں تنگ آکر اپنی زندگی کا رُخ بدل لے لیکن کوئی بے صوت صدا ہے جو چپکے ہی چپکے اس کے کان میں کچھ کہہ دیتی ہے اور وہ پکار اٹھتا ہے کہ نہیں مجھے گھبرانا نہیں چاہئے۔ کہیں

یہ پریشانی مری سامانِ جمعیت نہ ہو		یہ جگر سوزی چراغِ خانۂ حکمت نہ ہو
ناتوانی ہی مری سرمایۂ قوّت نہ ہو		رشکِ جامِ جم مرا آیئنۂ حیرت نہ ہو

یہ تلاشِ متّصل شمعِ جہاں افروز ہے
توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے

یہ تجسّس اسے پھر آمادۂ تجسّس کر دیتی اور وہ ہلاکِ ذوقِ جستجو پھر اسی تپش و خلش کے لئے سیماب پا ہو جاتا ہے۔ جب اس سے پوچھا جاتا کہ بالآخر اس سوزِ پیہم اور خلشِ مسلسل کی وجہ کیا ہے۔ ہر شخص نے اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصود متعیّن کر رکھا ہے اور اس کا دل اس سے مطمئن ہے لیکن ایک تم ہو کہ تمہیں کسی پہلو قرار ہی نہیں۔ کوندے کی لپک کی طرح یہاں سے وہاں اور شعلے کی تڑپ کی طرح وہاں سے یہاں۔ وہ سب کچھ سنتا اور ایک آہ بھر کر کہہ دیتا کہ

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد		دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوبروئے		تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے		سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد		بہ نگاہِ ناشکیبے بدلِ امیدوارے

اس کی فطرت کی یہی سیمابیت اور ذوقِ جستجو کی اضطرابیت تھی جو اسے ہر محفل میں دیوانہ وار لئے پھرتی تھی۔ کبھی حکمت و فلسفہ کی خشک گھاٹیوں میں اور کبھی شعر و ادب کی شاداب وادیوں میں کبھی مسجد و خانقاہ کی خلوتوں میں اور کبھی محفلِ رنگ و چنگ کی جلوتوں میں۔ اور یہ سب کچھ اس بیباکانہ اعتراف کے ساتھ کہ

مدّتے با لالہ رویاں ساختم		عشق با مرغولہ مویاں باختم
بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم		بر چراغِ عافیت داماں زدم

چنانچہ اس کی یہ ہر رہ نوردی اور ہر منزل نشینی کی کیفیت جسے قرآن نے فی کل واد یھیمون کی شاعرانہ نفسیاتی کیفیت سے تعبیر کیا ہے، دیکھنے والوں کے دل میں اس کے متعلق عجیب و غریب خیالات پیدا کیا کرتی۔ اسی کیفیت کو ایک مولوی صاحب کی زبان سے سنیئے جو اُس زمانہ میں اقبالؒ کی ہمسائیگی میں رہتے تھے۔ اقبالؒ کے الفاظ ہیں:۔

حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا — اقبال کہ ہے قمریِ شمشادِ معانی
پابندیِ احکامِ شریعت میں ہے کیسا؟ — گو شعر میں ہے رشکِ کلیمِ ہمدانی
سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل — مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی
کچھ عار اُسے حسن فروشوں سے نہیں ہے — عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی
گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت — اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی
لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے — بے داغ ہے مانندِ سحر اس کی جوانی

○

اس شہر میں جو بات ہو اُڑ جاتی ہے سب میں — میں نے بھی سنی اپنے احبا کی زبانی
اک دن جو سرِ راہ ملے حضرتِ زاہد — پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی
میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے — یہ آپ کا حق تھا ز رہِ قربِ مکانی
اگر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت — پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمہ دانی
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا — گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں — کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

واعظ کو اس قسم کے مسلک سے وجۂ شکایت بجا تھی۔ لیکن حیرت تو یہ ہے کہ اس باب میں زندانِ میکدہ بھی کچھ کم گلہ طراز نہ تھے۔ اس کی بھی سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا کہ اقبال ہے کیا؟ وہ بھی یہ کہتے تھے کہ

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو — رونقِ ہنگامۂ محفل بھی ہے تنہا بھی ہے
عینِ شغلِ مے میں پیشانی ہے تیری سجدہ ریز — کچھ ترے مسلک میں رنگِ مشربِ مینا بھی ہے
ہے حسینوں میں وفا نا آشنا تیرا خطاب — اے تلون کیش! تو مشہور بھی ہے رسوا بھی ہے

لے کے آیا ہے جہاں میں عادتِ سیماب تو
تیری بیتابی کے صدقے، ہے عجب بیتاب تو

یہ سنکر اقبالؔ مسکرایا اور کہتا کہ

عشق کی آشفتگی نے کردیا صحرا جسے — مشتِ خاک ایسی نہاں زیرِ قبا رکھتا ہوں میں
آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے — مضطرب ہوں دل سکوں نا آشنا رکھتا ہوں میں

فیض ساقی شبنم آسا ظرفِ دل دریا طلب
تشنۂ دائم ہوں آتش زیرِ پا رکھتا ہوں میں

خلشِ آرزو سے اقبالؔ کی یہ آشفتگی روز بروز بڑھتی گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے سینہ شعلہ ساماں و آذر فشاں میں جو حشر بپا ہو رہا ہے اسے اپنے ہم جلیس احباب کو کس طرح دکھائے؟ یہی وجہ تھی کہ وہ بھری محفل میں بھی اپنے آپ کو تنہا پاتا تھا اور یہ تنہائی اسے رہ رہ کر ستاتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ

لطف مرنے میں ہے باقی نہ مزہ جینے میں — کچھ مزہ ہے تو اسی خونِ جگر پینے میں
کتنے بیتاب ہیں جوہر مرے آئینے میں — کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں

اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہیں وہ لالے ہی نہیں

اسے تلاش تھی کسی ایسے محرمِ راز کی جو اسے کی سنتا اور اسے سمجھتا لیکن اسے کہیں ایسا رفیقِ ہمنوا نہیں ملتا تھا حتیٰ کہ وہ اپنی تلاش میں تھک کر کہہ اٹھتا کہ

یہاں کہاں ہم نفس میسر یہ دیس نا آشنا ہے اے دل
وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیرِ چرخِ کہن نہیں ہے

اسے اس تنہائی کا احساس آخر تک رہا اس لئے کہ وہ جس دیس کی بولی بولتا تھا اسے سمجھنے والا یہاں کوئی نہ تھا۔ اس لئے وہ ہر راہرو سے کہتا کہ

غریبِ شہر ہوں میں سُن تو لے مری فریاد — کہ تیرے سینے میں بھی ہوں قیامتیں آباد
مری نوائے غم آلود ہے متاعِ عزیز — جہاں میں عام نہیں دولتِ دلِ ناشاد
گلہ ہے مجھ کو زمانہ کی کور ذوقی سے — سمجھتا ہے مری محنت کو محنتِ فرہاد
صدائے تیشہ کہ بر سنگ می خورد دگر است — خبر بگیر کہ آوازِ تیشہ و جگر است

یہ تنہائی بعض اوقات اس قدر شدت اختیار کر جاتی کہ وہ سمجھتا کہ وہ کسی اور دنیا کا انسان ہے جو بھولے بھٹکے یہاں چلا آیا ہے. وہ راتوں کی تنہائیوں میں اُٹھ اُٹھ کر روتا اور خدا سے کہتا کہ

درین میخانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر
کہ من شاید نخستین آدمم از عالمے دیگر

لیکن اس تنہائی کے باوجود کسی فردوسِ گم گشتہ کی تلاش تھی جو اُسے ہر وقت گوشہ بگوشہ لئے لئے پھرتی تھی. تلاشِ حقیقت کی یہی خلش بے پایاں تھی جو اسے دانشکدۂ فرنگ میں لے گئی۔ وہاں پہنچ کر ایک اور کشمکش شروع ہو گئی یا یوں

دانشکدۂ فرنگ

کہیئے کہ اس کی دیرینہ کشمکش کی نوعیت متعین ہو گئی. اقبالؒ کی کیفیت یہ تھی کہ ابتدائی تعلیم و تربیت کے اثر سے ایمان اس کے قلب کی گہرائیوں میں پیوستہ ہو چکا تھا. اس کے تحت الشعور میں اس کے نقوش بہت گہرے تھے. لیکن دماغی طور پر وہ ابھی تک فلسفی تھا. فلسفہ سے اُسے شُغف بھی خاص تھا. مغرب میں پہنچے تو وہاں کے فلاسفرز کی صحبت اور تعلیم نے اس شغف کو اور گہرا کر دیا. لیکن اس سے ہوا یہ کہ جو کچھ قلب کی گہرائیوں میں بلا دلیل و برہان جاگزیں تھا فلسفہ اس کی تائید نہیں کرتا تھا اور جو کچھ فلسفیانہ دلائل و براہین سے ثابت ہوتا تھا اس کی گواہی دل نہیں دیتا تھا. دل اور دماغ کی یہی وہ کیفیت تھی جو آگے چل کر مشرق اور مغرب کی کشمکش کے نام سے ابھری. یہی وہ کشمکش ہے جو اقبالؒ کے سارے پیغام میں مختلف اصطلاحات سے سامنے آتی ہے. عقل و عشق دل و دماغ، خرد و جنوں، علم و حضور، خیر و نظر، ذکر و فکر، رازی و رومی، ابلیس و جبریل، مصطفیٰ و بولہب، اہرمن و یزداں، یہ سب تقابل درحقیقت ادراک و جذبات کی اسی کشمکش کے مظہر تھے. مغرب میں میکانکی تصورِ حیات نے انسان کو ایک پیکرِ آب و گل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دی تھی. اس تصور کی رُو سے زندگی مادی تبدیلیوں سے وجود میں آجاتی تھی اور انہی اجزاء کے پریشان ہو جانے سے اس کا خاتمہ ہو جاتا تھا. اس کے برعکس ایمانی تصورِ حیات کی رُو سے حیاتِ انسانی کا سرچشمہ مادہ سے ماوراء تھا اور موت اس کی آخری حد نہیں تھی بلکہ زندگی کی جوئے نغمہ خواں اس کے بعد بھی مسلسل رواں دواں رہتی تھی. مغربی سائنس کی رو سے علم کا دائرہ محسوسات کی چار دیواری تک محدود تھا. اس کے برعکس ایمانیات کی رُو سے علم حقیقی کا سرچشمہ وحی

تھا جو سرحدِ ادراک سے ماوراء تھا۔ مغربی معاشرے کی بنیادیں تنہا عقل پر استوار تھیں جن کا تقاضا ہر فرد کے اپنے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، ایمانیات کی رو سے معاشرے کی اساس ان مستقل اقدار پر رکھی جاتی تھی جو تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں طور پر نفع و نقصان اور خیر و شر کی میزان ہوتی ہیں۔ عقل کا تقاضا دوسروں کا سب کچھ چھین کر اپنا آپ بنانا تھا۔ لیکن عشق کا تقاضا دوسروں کی ربوبیت سے اپنے نشوو ارتقاء کا سامان بہم پہنچانا تھا۔ عقلِ انسانی زندگی کو سمٹا کر انفرادی دائرہ میں محبوس کر دیتی تھی، عشق اسے پھیلا کر ساری دنیا پر محیط کر دیتا تھا۔ عقل خود بیں تھی، عشق جہاں بیں۔ عقل من و تو کے امتیاز سے درخت کو شاخوں اور پتوں میں منقسم دیکھتی تھی۔ عشق کو ہر ذرہ میں آفتاب پنہاں نظر آتا تھا۔ عقل محوِ تماشائے لبِ بام رہتی تھی، عشق آتشِ نمرود میں بے خطر کود پڑنے کا متقاضی تھا۔ عقل بولہبی حیلہ جوئیاں سکھاتی تھی اور عشق روحِ مصطفویؐ کا پیامبر تھا اور یہ حقیقت ہے کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز   چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

عقل و عشق کی یہی کشمکش تھی جس نے دانشکدۂ مغرب میں اقبالؒ کے سینے کو وقفِ اضطراب کر دیا اور اس سے دن کا چین اور رات کا آرام چھین لیا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

یہی وہ دور تھا جسے یاد کر کے وہ بعد میں کہا کرتے تھے کہ

مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں   کہاں حضور کی لذت کہاں حجابِ دلیل

اقبالؒ کی زندگی میں یہ مقام بڑا مشکل اور یہ دور اپنا بڑا فیصلہ کن تھا۔ اگر اس کشمکش میں دماغ دل پر غالب آجاتا۔ اگر مملکتِ عشق میں عقل کی حکمرانی ہو جاتی۔ اگر فلسفہ کی دلیلیں ایمان کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتیں۔ اگر زندگی کی سوداگرانہ مصلحت کوشیاں متاعِ فقر و قلندری کو خرید لیتیں، تو اس کے بعد نہ صرف یہ کہ اقبالؒ، اقبالؒ نہ ہوتا بلکہ نہ دنیا کے نقشے پر پاکستان کا وجود ہوتا اور نہ ہم آپ آج عشق و محبت کے ان جگر سوز افسانوں کو اس طرح دہراتے۔ نہ ملتِ اسلامیہ ہندیہ کا اپنا کوئی مستقر و مقام ہوتا اور نہ آج یہاں ایمان و قرآن کے انسانیت ساز تصورات کے چرچے ہوتے

اس نازک وقت میں خود اقبالؒ پر کیا گزر رہی تھی، اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس پر کبھی یہ کیفیات خود وارد ہوئی ہوں۔ جب عقل و حکمت کی فسوں سازیاں اس کے لئے فریبِ نگاہ بننے کی کوشش کرتیں تو عشق و مستی کی رندانہ جرأت فرمائیاں عروسِ حقیقت کے حسین چہرے سے ذرا نقاب سرکا دیتیں۔ وہ حقیقت کی اس ایک جلمنی جھلک سے فریبِ عقل سے جھنجھلا کر منہ موڑ لیتا اور اثر درد میں ڈوبی ہوئی نوائے جگر گداز سے کہتا کہ

الٰہی عشقِ خجستہ پا کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری مجھے سرِ پیرہن نہیں ہے

اور کبھی بے تاب ہو کر دعائیں مانگتا کہ

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر　　　شریکِ زمرۂ لَا یَحْزَنُوْن کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں　　　مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

مبداءِ فطرت کا یہ انداز عجیب ہے کہ جب تلاشِ حقیقت کی تڑپ و خلش انتہائی شدت اختیار کر لیتی ہے تو حقیقت اپنے چہرے سے خود آپ نقاب اٹھا دیتی ہے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں نبی اکرمؐ سے فرمایا گیا کہ وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی۔ ہم نے تمہیں تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو منزلِ حیات کی طرف راہ نمائی کر دی۔ چنانچہ جو شخص بھی تلاشِ حقیقت میں سرگرداں رہتا ہے فطرت کا غیر مرئی ہاتھ اس کی راہ نمائی کر دیتا ہے۔ عام انسانوں کی صورت میں یہ راہ نمائی سُبل (پگڈنڈیوں) کی طرف ہوتی ہے۔ وَ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ (۲۹/۶۹) لیکن رسول کی راہ نمائی صراطِ مستقیم یعنی زندگی کی متوازن شاہراہ کی طرف ہوتی ہے۔ پگڈنڈیوں پر چلنے والے اگر اپنا رُخ اس صراطِ مستقیم کی طرف کر لیں جس پر رسول گامزن ہوتا ہے تو ان کی پگڈنڈیاں بھی اسی شاہراہِ حیات سے جا ملتی ہیں ورنہ ان کا روانِ حیات فضائے عقل و خرد کے پیچ و خم میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ جب تلاشِ حقیقت میں قلبِ اقبالؒ کی تپش و خلش بھی شدت تک پہنچ گئی تو اس فیصلہ کن لمحہ میں مبداءِ فیض کی کرم گستری سے اس کا قدم صحیح راستہ کی طرف اٹھ گیا۔ جب عقل کی شر انگیزیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر کر کہا کہ اس طلسمِ پیچ و تاب سے نکلنے کی راہ کون سی ہے تو وہ گھبرایا لیکن ایک ثانیہ میں اس کا دلِ پُرسوز پکار اٹھا کہ

چارہ ایں است کہ عشق کشائے طلبیم پیشِ او سجدہ گزاریم و مرادے طلبیم

اس جواب سے اقبالؒ کا وہ قلبِ بیتاب جو اس کشمکشِ خرد و جنوں سے سراپا اضطراب بن رہا تھا، ایمان و یقین کی طمانیت بخش آسودگی سے قرار و سکون کی جنت بن گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کی یاد میں وہ اس کیف و مستی سے پکار اٹھتا تھا کہ

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے خوبیٔ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے[1]

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ

اب تاثر کے جہاں میں وہ پریشانی نہیں اہلِ گلشن پر گراں میری غزل خوانی نہیں
قید میں آیا تو حاصل مجھ کو آزادی ہوئی دل کے مٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی
ضو سے اس خورشید کی اختر مرا تابندہ ہے چاندنی جس کے غبارِ راہ سے شرمندہ ہے

یک نظر کردی و آدابِ فنا آموختی
اے خنک روزے کہ خاشاکِ مرا در سوختی

اس سے اقبالؒ کے دل کو کس قدر یکسوئی نصیب ہوگئی اس کی خفیف سی جھلک اس نے اپنی اس نظم میں دکھائی ہے جو "حسن و عشق" کے عنوان سے "بانگِ درا" میں شامل ہے۔ مضمون کے علاوہ اس نظم میں حسنِ شعریت، تراکیب کی ندرت، تشبیہات کی موزونیت اور استعارات کی برجستگی دیکھئے اور پھر اندازہ لگائیے کہ ابتدا ہی سے فطرت نے اس حقائق شناس قلب کو اسلوبِ بیان بھی کس قدر حسین و دلکش عطا فرمایا تھا۔ (یہ ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیانی دور کی نظموں میں سے ہے) کہتے ہیں۔

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیٔ سیمینِ قمر نورِ خورشید کے طوفان میں ہنگامِ سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا آنچل لیکر چاندنی رات میں مہتاب کا ہمرنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم

---

[1] عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس سے اقبالؒ کا اشارہ کسی اور طرف ہے لیکن جہاں تک میرے مضمون کا تعلق ہے خواص کو مطلب ہے گہر سے نہ صدف سے

ہے ترے سیلِ محبت میں یونہی دل میرا

ہے مرے باغِ سخن کے لئے تو بادِ بہار — میرے بیتاب تخیل کو دیا تو نے قرار

جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں — نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں

حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریکِ کمال — تجھ سے سرسبز ہوئے میری امیدوں کے نہال

قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا

یہ عشق کی پہلی منزل تھی جس میں قرار و سکون ہی مدعائے حیات سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ منزل آئی جس میں شورش و حرارت مقصودِ کائنات نظر آتا ہے۔ عشق کی ان بلا انگیز شورشوں میں وہ لذت تھی کہ اقبالؒ اس حظ و کیف کے لئے قدم قدم پر **ھل من مزید** کی دعائیں مانگتا اور عجیب رقص و مستی میں پکار اٹھتا تھا کہ

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر — ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر!

عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں — یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر!

جب اقبالؒ کو اس کشمکشِ پیہم سے اس طرح فراغ نصیب ہو گیا تو اس نے عقل و خرد کے اس تمام دفترِ بے معنی پر جو اپنے آپ کو وجۂ قیامِ کائنات سمجھے ہوئے تھا ایک تبسم ریز نگاہ ڈالی اور اس سے اپنے مخصوص انداز میں کہہ دیا کہ

تیری متاعِ حیات، علم و ہنر کا سرور — میری متاعِ حیات، ایک دلِ ناصبور

فلسفہ نے یہ سُنا تو اقبالؒ سے پوچھا کہ ذرا یہ تو بتایئے کہ اس آشفتہ سامانی اور چاک گریبانی کی منطقی توجیہہ کیا ہے۔ اقبالؒ نے ہنس کر کہا کہ

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے — ورائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

چلتے چلتے طبیعیات کی جھاڑیوں نے اس کا دامن الجھایا اور کہا کہ ذرا ٹھہریئے کہ آپ کو آغازِ حیات کا راز بتاؤں۔ اقبالؒ نے سُنا اور قلندرانہ استغناء کی شان سے جواب دیا کہ

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے

کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

فلکیات نے کہا کہ میری رصدگاہوں سے فضائے آسمانی کی محیّر العقول پہنائیوں اور ان میں تیرنے والے

تحیّر انگیز کرّوں کا تماشا نظر آئے گا۔ اس مردِ دانا نے سُنا اور ایک خندۂ زیرِ لبی سے جواب دیا کہ اب یہ لاانتہا وسعتیں میرے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

عشق کی اِک جست نے طے کر دیا قصّہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

○

منزل کا تعیّن

اقبالؒ کے سامنے جب مقصودِ حیات اس طرح واضح ہوگیا تو اس نے اپنے لئے مستقبل کا راستہ متعیّن کر لیا۔ اس کے سامنے عشق کے اس زندگی بخش پیغام کو تمام دنیا کے انسانوں میں عام کرنا تھا۔ یاد رکھئے۔ جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا عشق سے اقبالؒ کی مراد وہ نظامِ ربوبیّت تھا جو وحی کی بنیادوں پر استوار ہوتا تھا اور جس کا مقصود نوعِ انسانی کی فطری صلاحیتوں کا کامل نشو و ارتقاء تھا۔ یہ نظام تمام انسانیت کے لئے تھا۔ لیکن اس کی ابتداء کسی ایسے خطّۂ زمین اور ایسے گروہ سے کی جا سکتی تھی جو اس پیغام کی عملی تشکیل کے لئے اوّلین خمیر بن سکے۔ اس نے جب اپنی قوم پر نگاہ ڈالی تو اسے یکسر راکھ کا ڈھیر پایا۔ بایں ہمہ اسے اس راکھ کے ڈھیر کے نیچے سے کچھ سلگتی ہوئی چنگاریاں بھی دکھائی دیں۔ اس نے تہیّہ کر لیا کہ وہ اپنی آتش نوائی سے اس راکھ کے ڈھیر کو شعلۂ جوّالہ بنا کر اس سے نوعِ انسانی کے لئے زندگی کی حرارت کا کام لے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے رفقاء کو اس پروگرام سے آگاہ کر دیا۔ عبدالقادر مرحوم کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر — بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں
ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط — اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں
اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق — سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

بلکہ اس سے بھی زیادہ واضح اور متعیّن انداز سے کہ

گئے وہ ایّام اب زمانہ نہیں ہے صحرا نوردیوں کا — جہاں میں مانندِ شمع سوزاں میانِ محفل گداز ہو جا

وجود افراد کا مجازی ہے ہستی قوم ہے حقیقی فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زنِ طلسم مجاز ہو جا
یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ رہ حجاز ہو جا

ان آرزوؤں اور دعاؤں، ان ولولوں اور تمناؤں کو دل میں لے کر اقبالؒ ہندوستان واپس آ گیا۔ گیا تو ایک مجموعۂ اضداد تھا واپس آیا تو ہمہ تن یک رنگ و یک آہنگ۔ گیا تو دل میں شکوک و شبہات کی ہزاروں پھانسیں لئے ہوئے۔ آیا تو اسے سکون و طمانیت کی جنت بنائے ہوئے۔ گیا تھا فلسفی بننے کے لئے، آیا تو نوعِ انسانی کے لئے پیامبر بن کر۔ گیا تھا سازِ

یورپ سے واپسی

عقل لے کر، آیا سوزِ عشق خرید کر، اور اس متاعِ سوز و ساز اور سرمایۂ تپش و گداز کو لے کر آیا۔ اُس برف آلود سرزمینِ مغرب سے جہاں عشق و ایمان کی رہی سہی چنگاریاں بھی بجھ جایا کرتی ہیں، گیا تھا تو وہ انداز تھا اور واپس آیا تو اس شان سے کہ کیف و مستی کی فضاؤں میں جھوم رہا ہے اور وجد و رقص کے عالم میں گنگنا رہا ہے کہ

کافرِ ہندی ہوں میں، دیکھ مرا ذوق و شوق دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود
شوق مری لَے میں ہے شوق مری نے میں ہے نغمۂ اللہ ھو میرے رگ و پے میں ہے

لیکن عشق و جنوں کی ان وادیوں میں پہنچ کر اقبالؒ نے عقل کو تیاگ نہیں دیا۔ اس لئے کہ عقل و خرد کو تیاگ دینا قرآن کا پیغام نہیں، رہبانیت کا مسلک ہے۔ قرآن کی رُو سے عقل اور وحی کا تعلق ایسا ہی ہے جیسے انسان کی آنکھ اور روشنی کا تعلق ہے۔ جو شخص اپنی آنکھ سے کام نہیں لیتا اس کے لئے روشنی کا عدم و وجود برابر ہے اور آنکھ بغیر روشنی کے بیکار ہے۔ لہٰذا، قرآن کا پیغام عقل کو وحی کے تابع رکھنا اور ان دونوں کے امتزاج سے ایک نئی دنیا کی تعمیر کرنا ہے۔ چنانچہ عقل و عشق، خرد و جنوں، ذکر و فکر، خبر و نظر، علم و حضور کے اس حسین امتزاج کا نام تھا اقبالؒ جس نے کہا کہ

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ

اور مشرق کو مغرب دونوں کو یہ پیغام دیا کہ

غربیاں را زیرکی سازِ حیات شرقیاں را عشق رازِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس کارِ عشق از زیرکی محکم اساس

عشق چوں با زیرکی ہمبر شود — نقشبندِ عالمِ دیگر شود
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ — عشق را با زیرکی آمیز دہ

مغرب نے تنہا عقل کی ابلہ فریبیوں سے ساری دنیا کو قمار خانہ بنا رکھا تھا مشرق میں مُلاّ اور صوفی کی کم نگہی نے اسلام جیسے انقلاب در آغوش نظامِ حیات کو بے نتیجہ رسوم کا مجموعہ اور محکومی و نا اُمیدی کے مسلکِ گوسفندی کا نقیب قرار دے رکھا تھا۔ اقبالؒ کے پیشِ نظر مشرق اور مغرب کے ان دونوں تصوّراتِ زندگی کے خلاف جنگ کرنا تھا۔ چونکہ فطرت نے اقبالؒ سے یہ بڑا کام لینا تھا اس لئے اسے اس مقصدِ عظیم کے لئے خاص طور پر تیار کیا گیا۔ فرشتوں کے نام خدا کے پیغام میں ہے کہ

تہذیبِ نوی کار گہِ شیشہ گراں ہے — آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو!

اور انہی آداب و جنوں کا اثر تھا کہ اس نے تہذیبِ حاضر کے اس نگاہ فریب طلسم کو توڑ کر رکھ دیا۔

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی — مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختیِ خارا

لیکن تہذیبِ نو کے اس سیلاب سے کہیں زیادہ ہلاکت انگیز خود اپنے ہاں کے مکتب و خانقاہیت کی تعلیم تھی جس کے خلاف اقبالؒ کو مسلسل جہاد کرنا تھا۔ اس کے لئے اس نے متلاشیانِ حقیقت کو پکار کر کہا کہ

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادہ ناب — نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

وہ ان سے بار بار کہتا کہ

رہ و رسمِ حرم نا محرمانہ — کلیسا کی ادا سوداگرانہ
تبرک ہے مرا پیراہن چاک — نہیں اہلِ جنوں کا یہ زمانہ

اس نے دیکھا کہ مدّعیانِ علمِ شریعت انسانی زندگی کے ابتدائی مسائل تک سے ناواقف ہیں اس لئے ان کے لئے قطعاً ناممکن ہے کہ وہ مقامِ کبریا کو پہچان سکیں۔ اس نے مُلاّ سے برملا کہا کہ ے

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو — تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال — تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

جب اربابِ شریعت و طریقت کی سطح بین نگاہیں اس کے حقیقت رس پیغام پر تنقید کرتیں تو وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکراتا اور بے نیازانہ کہہ دیتا کہ یہ بیچارے معذور ہیں اس لئے معاف کر دینے کے قابل۔ یہ نہیں جانتے کہ میں کیا کہتا ہوں اور کس مقام سے کہتا ہوں۔

کیا صوفی و مُلّا کو خبر میرے جنوں کی ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

لیکن جاننے والی نگاہیں جانتی تھیں کہ یہ دانندۂ اسرارِ حقیقت کیا کہتا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے ملتے اور اعتراف کرتے کہ

رازِ حرم سے شاید اقبالؒ باخبر ہے ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ

وہ جانتا تھا کہ ہماری مروّجہ شریعت اور طریقت دونوں کے مستعار تصورات اسلام کے عجمی ایڈیشن ہیں جن پر صرف ڈسٹ کور (DUST COVER)، قرآن کا ہے۔ اسے خوب معلوم تھا کہ یہ عجمی نظریاتِ زندگی فکرِ اسلامی کے شجرِ طیّب پر اکاس بیل کی طرح مسلط ہیں۔ جب تک اس اکاس بیل کو الگ نہیں کیا جائے گا، شجرِ ملّت کبھی سرسبز و شاداب نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے وہ پوچھنے والوں سے کہتا کہ

کئے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

ظاہر ہے کہ ایسے انقلاب آفریں پیغام کی ہر طرف سے مخالفت ہونی تھی۔ لیکن اس نے اس کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی آتش نوائی کو مسلسل جاری رکھا اور اس طرح رفتہ رفتہ فضائے ملّت اس کی آہِ نیم شبی اور نالۂ سحری سے اثر پذیر ہوتی چلی گئی۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر اس نے کہا تھا کہ

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی دیا ہے میں نے انہیں ذوقِ آتش آشامی

لیکن اس کے باوجود اس کی قوم جس خوابِ گراں میں سو رہی تھی اسے اس سے جگانا کچھ آسان کام نہ تھا۔ ہزار برس سے گاڑی زندگی کی صراطِ مستقیم چھوڑ کر دوسری پٹڑی پر چلی جا رہی تھی۔ اسے اس مقام سے واپس لا کر پھر سے صحیح لائن پر ڈالنا آفتابِ مغرب کی طنابیں کھینچ کر اسے سوئے مشرق لانا تھا۔ اسے خدا سے شکایت ہی یہ تھی کہ

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو　　لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
تاثیر یہ ہے میرے نفس کی کہ خزاں میں　　مرغانِ سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند
لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

آزادی کا پیغام

واضح رہے کہ اقبالؒ کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ نہیں تھا کہ انگریزوں کی بجائے حکومت ہمارے ہاتھ میں آجائے۔ بلکہ یہ کہ اس خطۂ زمین کے مسلمان انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی بجائے ضابطۂ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں۔ اسی مقصد کے لئے اس نے ملّتِ اسلامیہ کو پاکستان کا تصور دیا تھا۔ لیکن قوم نے اس وقت اس تصور کو ایک شاعر کا افسانوی تخیل سمجھ کر اس پر غور و فکر کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ ایک طرف اپنی قوم کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف مخالف قوتیں برق رفتاری کے ساتھ چاروں طرف سے ہجوم کرکے اُمنڈے چلی آرہی تھیں۔ حالات ایسے نامساعد تھے۔ لیکن بایں ہمہ وہ اس سیلابِ بلاانگیز میں روشنی کے مینار کی طرح کھڑا تھا کہ زمانہ کی تلاطم انگیز موجیں آئیں اور اپنا سر پھوڑ کر واپس چلی جائیں۔ یہی تھے وہ حالات جن کے متعلق اس نے کہا تھا کہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

ان ناموافق حالات میں ہمرہانِ سُست عناصر اسے مایوسیوں کے چھلاوے سے ڈراتے اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے کہ

ہر نفس اقبالؔ تیرا آہ میں مستور ہے　　سینۂ سوزاں ترا فریاد سے معمور ہے
قصۂ گل ہم نوایانِ چمن سنتے نہیں　　اہلِ محفل تیرا پیغامِ کہن سنتے نہیں
زندہ پھر وہ محفلِ دیرینہ ہو سکتی نہیں　　شمع سے روشن شبِ دوشینہ ہو سکتی نہیں

تو اس کا چہرہ تمتما اٹھتا۔ پیشانی جوشِ حمیت سے شفق آلود ہو جاتی۔ وہ امیدوں کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے اٹھتا اور حزم و یقین کی پوری قوتوں سے کہتا کہ

ہمنشیں! مسلم ہوں میں توحید کا حامل ہوں میں　　اس صداقت پر ازل سے شاہدِ عادل ہوں میں

نبضِ موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے
اور مسلم کے تخیل میں جسارت اس سے ہے
حق نے عالم اس صداقت کے لیئے پیدا کیا
اور مجھے اس کی حفاظت کے لیئے پیدا کیا
میری ہستی پیرہنِ عریانیٔ عالم کی ہے
میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے
کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسہ اپنی ملت کے مقدر پر مجھے
ہاں یہ سچ ہے چشم بر عہدِ کہن رہتا ہوں میں
اہلِ محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں
یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

وہ جانتا تھا کہ نا اُمیدیوں کے چھلاوے سے ڈرانے والے وہ ہیں کہ مدت ہائے دراز سے تقلید اور بے عملی کے حیات سوز اثرات ان کی ہڈیوں کے گودے تک میں سرایت کر چکے ہیں اور وہ اپنی زندگی میں خفیف سی تبدیلی کے تصور تک سے گھبرا اٹھتے ہیں۔ وہ ان پیرانِ کہن سے کوئی توقع نہیں رکھتا تھا۔ اس لیئے وہ اپنے پیغام کا حقیقی مخاطب ان نوجوانوں کو سمجھتا تھا جن کے قلب و نگاہ کی تبدیلی قوموں کی تقدیریں بدل دیا کرتی ہے۔ انہی کو وہ اپنی متاعِ سوز و گداز کا وارث سمجھتا اور انہی کے لیئے راتوں کو اٹھ اٹھ دعائیں مانگا کرتا تھا کہ

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا
خرد کو غلامی سے آزاد کر!
جوانوں کو پیروں کا استاد کر!
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے!
دلِ مرتضیٰؓ، سوزِ صدیقؓ دے!
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر!
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر!
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں!
مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں!
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز!
مری خلوت و انجمن کا گداز!
امنگیں مری، آرزوئیں مری!
امیدیں مری جستجوئیں مری!
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر!
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!

مرے قافلے میں لُٹا دے اسے!
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے!

ملت کے مستقبل کا یہی غمِ پنہاں تھا جس نے اقبالؒ پر راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ علی بخش[1] کا بیان ہے کہ جن دنوں آپ کی طبیعت زیادہ خراب تھی۔ ایک رات پچھلے پہر میں نے سنا کہ پلنگ سے سسکیوں کی آواز آرہی ہے۔ چپکے سے قریب گیا تو دیکھا کہ آپ تکیہ پر کہنیاں ٹیکے دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھے ہیں اور زار و قطار رو رہے ہیں۔ رو رہے اور گنگنا رہے ہیں کہ

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا   تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

اسی غزل کے دو شعر اور بھی سنئے۔ فرماتے ہیں:۔

ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی   کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغِ بے نیام آیا
چل اے میری غریبی کا تماشہ دیکھنے والے   وہ محفل اٹھ گئی جس دم تو مجھ تک دورِ جام آیا

علالت

علی الصباح حسبِ معمول حکیم صاحب آئے۔ دیکھا تو رنگ معمول سے زیادہ زرد ہے اور چہرہ پہلے سے زیادہ افسردہ۔ آنکھیں سوج رہی ہیں اور کمزوری بڑھ گئی ہے۔ کیفیتِ مزاج پوچھی تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور بمشکل اتنا کہہ سکے کہ

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات
کہنہ ہے بزمِ کائنات تازہ ہیں میرے واردات

حکیم صاحب نے ہلکے سے تبسم سے کہا کہ آپ تو دنیا بھر کے مسائل کا حل دوسروں کو بتاتے رہتے ہیں، اپنی مشکل کا حل کیوں نہیں تلاش کر پاتے۔ انہوں نے بھی اسی انداز کے تبسم زیرلبی سے فرمایا کہ کیا کہوں!

مقامِ ہوش سے آساں گزر گیا اقبالؔ   مقامِ شوق میں کھو یا گیا یہ دیوانہ

حکیم صاحب نے پوچھا کہ بالآخر وہ کونسی بات ہے جس کا غم آپ کو اس طرح نڈھال کئے جا رہا ہے۔ کہا کہ حکیم صاحب آپ دیکھتے نہیں کہ

---

[1] اقبالؒ کا فدائی جو دنیا میں عام طور پر اقبالؒ کے ملازم کی حیثیت سے متعارف ہے لیکن جو درحقیقت اقبالؒ کا عاشق تھا اور اس عشق کو آج تک زندہ رکھے ہوئے ہے۔ (اب اس کا بھی انتقال ہو چکا ہے)۔

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مُردہ ذوق		خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو

ہیں کہ میری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ		میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

حکیم صاحب نے کہا کہ آپ کا مرض زیادہ تشویشناک ہوتا جا رہا ہے۔ آپ کو کچھ دنوں کے لئے ان تفکرات کو چھوڑنا ہوگا۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا کہ حکیم صاحب! میں جانتا ہوں کہ

پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے

لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ

اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

اتنے میں ڈاک آگئی۔ دیکھا تو اس میں ایک خط ایسے فلسفہ زدہ نوجوان کا تھا جس کے والد سے آپ کے دیرینہ مراسم تھے۔ اس نے، جیسا کہ فلسفہ کے ابتدائی مراحل میں، جب کہ طالب علم کے افکار میں ہنوز پختگی نہیں آتی، اکثر ہوتا ہے، نفسِ انسانی؟ وحی، حیات بعد الممات، مستقل اقدار وغیرہ تصورات پر نہایت طنز آمیز اعتراضات کئے تھے۔ آپ نے خط پڑھ کر پنسل اٹھائی اور اس کی پشت پر لکھ دیا کہ:۔

میں اصل کا خاص سومناتی		آبا مرے لاتی و مناتی

تو سیّد ہاشمی کی اولاد		میری کفِ خاک برہمن زاد!

ہے فلسفہ میرے آب و گل میں		پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

اقبال اگرچہ بے ہنر ہے		اس کی رگ رگ سے باخبر ہے

شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز		سُن مجھ سے یہ نکتہ دل افروز

افکار کے نغمہ ہائے بے صوت		ہیں ذوقِ طلب کے واسطے موت

دیں مسلکِ زندگی کی تقویم		دیں سرِ محمدؐ و ابراہیمؑ

دل در سخنِ محمدیؐ بند		اے پورِ علیؓ ز بوعلی چند

ابھی اس خط کا جواب ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ لاہور کے ایک مشہور روزنامہ کے مدیر جن کا شمار آپ کے حلقۂ ارادت مندان میں ہوتا تھا، اندر آگئے۔ خیریتِ مزاج کے بعد کہا کہ آپ نے دیکھا ہے کہ آپ کے حالیہ بیان پر فلاں اخبار کے ایڈیٹر نے کیسے رکیک حملے کئے ہیں۔ آپ مسکرائے اور کہا کہ میں نے

دیکھا تو نہیں کل شام فلاں صاحب سے سُننا ضرور تھا۔ انہوں نے جھجکتے ہوئے پوچھا کہ کیا آپ کوئی جواب لکھیں گے۔ آپ نے اس کی طرف مُڑ کر دیکھا اور کہا کہ بھائی! میں ان جھمیلوں میں کبھی نہیں الجھتا۔ آپ مجھے جانتے ہیں کہ:

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی — گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق — نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش — میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش — میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند
پُرسوز و نظر باز و نکوبین و کم آزار — آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند
ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم — کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند

حتیٰ کہ میرا تو یہ عالم ہے کہ

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال — کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا مُنہ بند

صحافی نے کہا کہ درحقیقت یہ ایک سازش ہے دو قوموں کے اس نظریہ کے خلاف جس کا تصور آپ نے پیش کیا ہے اور جس کی رُو سے مسلمانانِ ہند کو اپنے مستقبل کے لئے ایک واضح اور درخشندہ نصب العین مل گیا ہے۔ آپ نے پھر مسکرا کر فرمایا کہ سازش ہے تو ہوا کرے، مجھے اس کی کیا پرواہ ہے؟

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک — مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

بعد سہ پہر حسبِ معمول پھر ملنے والوں کا اجتماع ہوا۔ دنیا بھر کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایک صاحب

معرکۂ دین و وطن

نے کہا کہ (مولانا) حسین احمد مدنی نے آپ کے اشعار کے جواب میں جو بیان دیا ہے وہ آپ کی نظروں سے گزرا۔ فرمایا کہ ہاں میں نے دیکھا ہے۔ اس نے کہا کہ مولوی صاحب نے قوم اور ملّت کے متعلق جو لفظی بحث چھیڑی ہے، آپ اس کا کچھ جواب دیں گے؟ فرمایا کہ

قلندر جز دو حرفِ لاالٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا — فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا
حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھکو — نہ کر خاراشگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

پھر حقہ کا کش لگایا اور مسکراتے ہوئے فرمایا کہ:

کہاں سے تو نے اے اقبالؔ سیکھی ہے یہ درویشی   کہ چرچا پادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

آپ کے حلقۂ احباب میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جنہیں ہمیشہ اس بات کا قلق رہتا کہ نالائق اور جاہل لوگ بڑے بڑے مناصب و مدارج حاصل کئے جاتے ہیں اور آپ ہیں کہ جن کی قابلیت کا سکہ ساری دنیا مان رہی ہے لیکن اس طرح ایک گوشے میں پڑے ہیں۔ وہ آتے اور آپ سے کہتے کہ فلاں اسامی خالی ہو رہی ہے۔ آپ اپنی آمادگی ظاہر کر دیجئے فوراً کامیابی ہو جائے گی۔ آپ ان مخلص بہی خواہوں کی سادگی پر مسکراتے اور جی ہی جی میں کہتے کہ میں انہیں کس طرح بتاؤں کہ مبداء فیض کی عنایاتِ خسروانہ نے مجھے کیا عطا کیا ہے اور یہ مجھے کس طرف بلا رہے ہیں۔ وہ زیادہ اصرار کرتے تو آپ ان سے کہتے کہ:-

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشۂ چالاک   رکھتی ہے مگر طاقتِ پرواز مری خاک
وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقلِ ادراک   وہ خاک کہ جبریل کی ہے جس سے قبا چاک
وہ خاک کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی   چنتی نہیں پہنائے چمن سے خس و خاشاک

اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو
کرتی ہے چمک جن کی ستاروں کو عرقناک

جاوید

جاوید سے آپ کو بہت محبت تھی۔ وہ ابھی بچہ تھا لیکن اس سے آپ بڑے کام کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک دن اس نے پوچھا کہ ابا جان! آپ کے پاس نہ اچھے اچھے کپڑے ہیں نہ قیمتی صوفے اور قالین۔ نہ بہت سے نوکر چاکر ہیں نہ موٹر ہی ہے لیکن آپ کے پاس بڑے بڑے لوگ آتے ہیں۔ یہ آپ کی اتنی عزت کیوں کرتے ہیں۔ آپ نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کہا کہ بیٹا!

ہے میری بساط کیا جہاں میں   بس ایک فغانِ زیر بامی
اک صدقِ مقال ہے کہ جس سے   میں چشمِ جہاں میں ہوں گرامی

جب آپ لندن گئے ہیں تو جاوید نے پہلا خط اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجا۔ اس کے جواب میں آپ نے اسے لکھا کہ

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر   نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

زمانہ آگے بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ ہی اقبالؒ کے پیغام کی تندی اور تیزی بھی شدت اختیار کرتی چلی گئی. اس کی نگہِ بصیرت دیکھ رہی تھی کہ دنیا میں کیا ہونے والا ہے اور اس کی بساطِ سیاست پر مسلمان کس طرح پٹ رہا ہے. اس آنے والے انقلاب کے تصور سے جوں جوں اس کا احساس شدید ہوتا جاتا اس کی نوا کی تلخی بھی تیز ہوتی جاتی۔ اقبالؒ کے پیشِ نظر پوری انسانیت کے اندر ایک ایسا انقلاب برپا کرنا تھا جس سے یہ زمین بدل جائے' یہ آسمان بدل جائے اور خاکِ آدم کو وہ نمود حاصل ہو جس کے لئے اسے اس طرح سنوارا گیا تھا. انقلاب آفرینی کا یہی وہ جذبہ تھا جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے پیدا
ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا!

دوسرے مقام پر کہتے ہیں کہ

کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی گستاخ ہے کرتا ہے فطرت کی حنابندی
خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی رومی ہے نہ شامی ہے کاشی نہ سمرقندی
سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی

ادھر آسمان پر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں لیکن اِدھر زمین والے ہنوز یہی طے نہیں کر پاتے تھے کہ اقبالؒ جو کچھ

سرچشمۂ پیغامِ اقبالؒ

کہتا ہے اس کا سرچشمہ کیا ہے؟ کوئی کہتا کہ اس کے کلام میں سوز و گداز اور کیف و مستی کے تذکرے ان نقوش کے اثرات کا نتیجہ ہیں جو بچپن کی مشرقی تعلیم اور تصوف آمیز ماحول نے اس کے تحت الشعور میں مرتسم کر رکھے ہیں. کوئی کہتا کہ ان کی فکر نیٹشے' برگساں' ایگزینڈر' وارڈ' جیمز جیسے مغربی مفکرین کے فلسفہ کی رہینِ منت ہے. اقبالؒ یہ سب کچھ سنتا اور ان سادہ لوح معترضین سے کہتا کہ جب تم اس منبع علم و یقین سے آشنا نہیں ہو جو میری فکر کا سرچشمہ ہے تو اس باب میں قیاس آرائیاں کیوں کرتے ہو؟

میری فکر نہ مشرقی کتب و خانقاہ سے متأثر ہے نہ مغربی حکمت و فلسفہ کی منت پذیر۔

نہ فلسفی سے نہ مُلّا سے ہے غرض میری
یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

میں نے مشرق و مغرب دونوں کے علوم و فنون کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان میں مجھے حقیقت کا سراغ سراغ نہیں ملا۔

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

میری فکر کسی سے بھی متأثر نہیں۔ میں نے کسی چیز کو تقلیداً دیکھا ہی نہیں بلکہ ہر شے کو از خود پرکھا ہے اور اپنے نتائج آپ مستنبط کئے ہیں۔

میانِ آب و گل خلوت گزیدم — زافلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزۂ چشم — جہاں را جز بہ چشمِ خود ندیدم

یہی میرا مسلک ہے جس سے اب کیفیت یہ پیدا ہو چکی ہے کہ لاکھ پردوں میں چھپی ہوئی حقیقت میری نگہِ تجسس کے سامنے از خود بے نقاب ہو جاتی ہے۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ

اقبالؔ نے کل اہلِ خیاباں کو سنایا — یہ شعرِ نشاط آور و پُرسوز و طربناک
میں صورتِ گل دستِ صبا کا نہیں محتاج — کرتا ہے مرا جوشِ جنوں میری قبا چاک

یہی وہ حقیقت کشائی ہے جس سے میری دیدہ وری کا یہ عالم ہے کہ

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

چنانچہ وہ جہانِ فردا جس کے انتظار میں آسمان کے تاروں کی آنکھیں ایک مدت سے محرومِ خواب ہیں، میرا پیغام اس کے لئے طائرِ پیش رس ہے۔

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں — میری نواؤں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

لہٰذا، اس عالمِ ہست و بود کی حقیقت صرف اس پر کُھل سکتی ہے جس کی سمجھ میں میرا پیغام آجائے۔

نظر آئے گا اُسی کو یہ جہانِ دوش و فردا
جسے آگئی میسّر مِری شوخیٔ نظر را

لوگ سمجھتے ہیں کہ اقبالؔ جاوید منزل میں پلنگ پر لیٹے حقّہ پیتا رہتا ہے اور شاعری کرتا رہتا۔ انہیں کیا خبر کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

مرے ہمصفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے!
انہیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

شاعری نہیں

یہ شاعری نہیں، نہ ہی شاعری کسی پیغام بر کے شایانِ شان ہوتی ہے۔ جس کے سامنے زندگی کا نصب العین متعین ہو۔ اس کا ہر قدم اُسی نصب العین کی طرف اٹھ رہا ہو اور اس لئے وہ ہر مخاطب کو اسی منزل کی طرف دعوت دے رہا ہو، اسے شاعری سے کیا واسطہ!

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ　　　کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

یہ وہی "رازِ درونِ میخانہ" تھے جن کے متعلق میں نے زبورِ عجم میں کہا ہے کہ

زبرون درگذشتم ز درونِ خانہ گفتم
سخنے نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم

تم اسے شاعری سمجھتے ہو اور میں شاعری کو اپنے خلاف تہمت خیال کرتا ہوں۔

نہ پنداری کہ من بے بادہ بستم　　　مثالِ شاعراں افسانہ بستم
نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست　　　کہ بر ما تہمتِ شعر و سخن بست

تم اسے حُسن و شباب کے رنگین افسانے سمجھتے ہو۔ تم اسے عہدِ کہن کی خواب آور داستانیں تصور کرتے ہو۔ تم یہی سمجھے بیٹھے ہو کہ یہ گل و بلبل کی فرضی کہانیاں ہیں۔ تمہارا اندازہ یہی ہے کہ یہ ایک شاعر کی دنیائے تصورات کی پریشاں خیالیاں ہیں۔ اگر تمہارا یہی اندازہ ہے تو کس قدر غلط ہے تمہارا یہ اندازہ۔ اگر تمہارا یہی خیال ہے تو کس قدر باطل ہے تمہارا یہ خیال۔ اگر تم جاننا چاہتے ہو کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ درحقیقت ہے کیا تو آؤ میرے مئے سخن کے پیالے میں جھانک کر دیکھو کہ اس میں کیا نظر آتا ہے؟

دو عالم را تواں دیدن بہ مینائے کہ من دارم　　　کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم
دگر دیوانہ آید کہ در شہر افگند ہوئے　　　دو صد ہنگامہ برخیزد ز سودائے کہ من دارم
مخور ناداں غم از تاریکیِ شبہا کہ می آید　　　کہ چوں انجم درخشد داغِ سیمائے کہ من دارم

ندیم خویش می سازی مرا لیکن ازاں ترسم
نداری تابِ آں آشوبِ غوغائے کہ من دارم

سننے والے یہ سب کچھ سنتے لیکن ان کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آتا تھا کہ اگر یہ خیالات نہ فکرِ مغرب سے مستعار لئے ہیں نہ تصوراتِ مشرق سے۔ نہ یہ مکتب کی زلہ چینی ہے نہ خانقاہ کی دریوزہ گری۔ نہ یہ شاعری ہے نہ افسانہ طرازی۔ تو پھر بالآخر ان تصوراتِ حیات کا سرچشمہ کیا ہے۔ وہ مردِ خود آگاہ و خدامست یہ کچھ سنتا اور کہتا کہ آؤ تمہیں بتاؤں کہ میرے انقلاب بردوش پیغام کا سرچشمہ کیا ہے۔ اس کا سرچشمہ ہے۔

قرآن

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم　　　حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات　　　بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

میں نے عمر بھر اسی شمع عالمتاب سے اکتسابِ ضیا کیا ہے۔ اسی یم ناپیدا کنار سے حکمت کے موتی نکالے ہیں۔

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام　　　شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام

اس لئے

از تب و تابم نصیبِ خود بگیر　　　بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر

لیکن سننے والے کہتے کہ اس قرآن کو تو ہم ہر روز پڑھتے ہیں۔ اس کی تفسیریں بھی دیکھتے ہیں۔ ہمیں تو اس میں یہ کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ دانائے راز ان سادہ لوحوں کی یہ باتیں سنتا اور کہتا کہ قرآن اپنے آپ کو اس طرح بے نقاب نہیں کیا کرتا۔ اس کے سمجھنے کے انداز کچھ اور ہی ہیں۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

اس لئے

چوں مسلماناں اگر داری جگر　　　در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر

برادران! یہ ہے وہ اقبالؒ جس نے کہا تھا کہ

چو رختِ خویش بربستم ازیں خاک　　　ہمہ گفتند باما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر　　　چہ گفت و باکہ گفت و از کجا بود

میں نے بھی اسی اقبال کی تلاش میں ساری عمر گزار دی۔ اسے مختلف وادیوں اور متنوع شاہراہوں میں ڈھونڈتا رہا۔ لیکن آخر الامر قرآن ہی سے اس کی راہ اور منزل کا سراغ پایا۔

اسی اقبالؒ کی میں جستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مدت کے بعد آخر یہ شاہیں زیرِ دام آیا

اے کُشتۂ سُلطانی و مُلّائی و پیری

یومِ اقبالؒ۔ اپریل ۱۹۶۷ء کی تقریر

آپ نوعِ انسانی کی تاریخ پر غور کیجئے۔ جس زمانہ میں، جس ملک میں اور جس قوم میں آپ کو فسادِ آدمیت کی جھلک نظر آئے، تحقیق کے بعد معلوم ہوگا کہ اس فساد انگیزی کے عوامل و عناصر تین ہی تھے۔ یعنی ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری ـــــ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ یہ ابالیسِ دہر اپنا پیکر بدلتے رہیں گے، لیکن روح ہر زمان اور ہر مکان میں وہی کارفرما رہے گی۔ اگر آپ قرآنِ کریم پر بہ نگاہِ تعمق غور کریں گے تو یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے گی کہ حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت، انہی فساد انگیز عناصر کے خلاف، نعرۂ انقلاب تھی۔ وہ انسانوں کو نظامِ خداوندی کے مرکز پر جمع کرتے تاکہ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کے تختوں کو الٹ دیا جائے۔ انبیائے گزشتہ کے کوائف اور امم سابقہ کی داستانیں، جو قرآن میں مذکور ہیں، وہ اسی کشمکش کی سرگذشت اور اسی انقلابی جدوجہد کی تفاصیل ہیں۔ ان داستانوں میں قصۂ بنی اسرائیل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے اس کشمکش میں، فسادِ آدمیت کے یہ تینوں گوشے یکجا سامنے آگئے تھے۔ یعنی فرعونؔ، استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ۔ ہامانؔ، مذہبی پیشوائیت کی ابلیسانہ روباہ بازیوں کا پیکر اور قارونؔ، سرمایہ داری کی خون آشامیوں کا نمائندہ ـــــ یہ تینوں یک جا، اور ان کے پنجۂ فولادی کی گرفت میں تڑپتی، پھڑکتی قومِ بنی اسرائیل جس کی

کے لئے ایک چھوڑ، دو دو اولوالعزم پیغمبر (صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ) مصروفِ جہاد ــــ اور اگر تاریخ کا بیان صحیح ہے تو وادیٔ سینا میں ایک اور پیغمبر حضرت شعیبؑ ان کے مددگار۔

یہ کشمکشِ حق وباطل، یہ چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری، اسی طرح مسلسل چلی آرہی تھی کہ آج سے چودہ سو سال پہلے، خدا کی آخری کتاب ــــ قرآنِ کریم ــــ اور اس کا آخری رسول ــــ نبیٔ اکرمؐ ــــ نوعِ انسان کو ان فساد انگیزیوں سے نجات دلانے کے لئے آئے۔

انقلابِ عظیم

قرآنِ کریم نے حضور نبیٔ اکرمؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ (۷/۱۵۷)۔ وہ ان زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آرہی تھی اور ان بوجھل سلوں کو اس کے سر سے اتار دے گا جن کے نیچے وہ کچلی جا رہی تھی ــــ نبیٔ اکرمؐ نے اپنی عدیم المثال انقلابی جدّوجہد سے ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کی ان زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے رکھ دیا اور اس طرح خدا کی مخلوق دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہوگئی۔

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست
نقش ہائے کاہن و پاپا شکست

حیرت انگیز رجعت

لیکن یہ دورِ حریت وآزادی تھوڑے سے عرصہ تک قائم رہا اور اس کے بعد خود مسلمانوں نے ان زنجیروں کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو اپنی "مژگانِ عقیدت" سے ایک ایک کرکے چنا اور اس طرح اپنے گلے میں ڈال لیا کہ پھر کوئی قوت انہیں توڑ نہ سکے۔ میں اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ ایسا کس طرح ہوا۔ (اس کی وضاحت میں اس سے پہلے متعدد مقامات پر کرچکا ہوں)۔ اس وقت میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ آسمان کی آنکھ نے اس سے زیادہ حیرت انگیز تماشا کہیں نہیں دیکھا ہوگا کہ

خود طلسمِ قیصر وکسریٰ شکست
خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

جب ہم اپنی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو محوِ حیرت رہ جاتے ہیں کہ مسلمان اس غیر قرآنی زندگی کا

اس قدر خوگر ہو چکا ہے کہ اس کے نزدیک قفس حلال اور آشیانہ حرام ہے۔ اس کے اسباب و علل ظاہر ہیں۔ مفاد پرست گروہ نے اقتدار کی کرسیوں اور رزق کے سرچشموں پر قبضہ کرلیا۔ مذہبی پیشوائیت نے اس خلافِ اسلام نظام کو عین اسلام ثابت کرنے میں "شرعی سندات" مہیا کیں ـــ اربابِ حکومت ان کے وظیفے مقرر کر دیتے تھے اور یہ منبروں پر کھڑے ہو کر انہیں "ظل اللہ علی الارض" قرار دیتے اور ان کی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ یہ وہی فرعون، ہامان اور قارون کی ملی بھگت تھی جسے قرآن نے داستانِ بنی اسرائیل کے سلسلہ میں اس شرح وبسط سے بیان کیا ہے۔ گمان غالب ہے کہ اس دوران میں خدا کے ایسے بندے بھی پیدا ہوئے ہوں گے جنہوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی ہو۔ لیکن جیسا کہ ہر مستبد نظام کیا کرتا ہے، ان کا گلا گھونٹ دیا گیا اور ان کے آثار تک کو مٹا دیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ آج ہمارے ہاں ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی تاریخ تو پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہے لیکن اس کے خلاف آواز اٹھانے والوں کا ذکر تک نہیں ملتا۔ بجز اس کے کہ اس تاریخ میں کہیں طعن وتشنیع کے ساتھ انہیں ہدفِ ملامت بنا دیا گیا ہو۔ اس سارے طوفانِ بلا میں اگر امید کا کوئی سہارا ہے تو وہ یہ کہ خدا کی کتاب کے الفاظ ہمارے ہاں محفوظ چلے آتے ہیں۔

یہی تھی خدا کی وہ کتابِ محفوظ جس پر ہمارے دور کے ایک عظیم مفکر نے عمر بھر غور و فکر کیا اور اس کے بعد اس کی حقیقت کو واشگاف الفاظ میں امت کے سامنے پیش کیا کہ اس کی یہ حالت اس لئے ہوئی ہے کہ

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر سود خوار و والی و ملا و پیر

اور اس نے مسلمان کو مخاطب کرکے کہا کہ

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

میں آج کی نشست میں مختصر الفاظ میں اس حقیقت کو آپ کے سامنے لانے کی کوشش کروں گا کہ قرآنِ کریم نے فسادِ آدمیت کے ان تینوں گوشوں ـــ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری ـــ کے متعلق کیا کہا ہے اور اقبالؒ نے اس کی اپنے حسین و بلیغ انداز میں کس طرح تشریح کی ہے۔

ملوکیّت

ہمارے ہاں' ملوکیّت سے مراد موروثی بادشاہت لی جاتی ہے. یعنی باپ کے بعد بیٹے کا تخت نشین ہونا. یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں جہاں یہ آیا ہے کہ (حضرت) معاویہؓ نے اپنے بیٹے کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تو کہا جاتا ہے کہ اس سے ملوکیّت کا آغاز ہوا. دنیا کے عام تصوّر کے مطابق بھی ایک فرد کی حکومت کو پہلے ملوکیت (MONORCHY)، یا شخصی اقتدار (AUTOCRACY)، کہا جاتا تھا اور اب اسے آمریت (DICTATORSHIP)، سے تعبیر کیا جاتا ہے. اس کے ساتھ ہی عام تصوّر کے مطابق اگر کسی ملک پر اس ملک کے رہنے والوں کی حکومت ہے تو اُسے آزادی کہا جاتا ہے اور اگر اس پر کسی دوسرے ملک کی قوم حکمران ہے تو اسے محکومی کہا جاتا ہے. آزادی اور محکومی کا یہ تصوّر تو دنیا میں اب تک موجود ہے لیکن انقلاب فرانس نے' ایک جدید سیاسی نظام کو جنم دیا جسے جمہوریت یا ڈیماکریسی کہہ کر پکارا گیا. لفظی طور پر تو اس سے مفہوم ہے پوری کی پوری قوم کی حکومت، لیکن عملاً اس سے مراد ہے نمائندگانِ قوم میں سے اس پارٹی کی حکومت جسے اکثریت حاصل ہو. یعنی اس میں اقتدارِ مملکت' ایک فرد کے بجائے ایک گروہ کو حاصل ہوتا ہے. میں اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ دوسو سال کے تجربہ نے اس جمہوریت کے متعلق خود یورپ کے اربابِ فکر و نظر اور اصحابِ سیاست و عمرانیت کو کس نتیجے پر پہنچایا ہے اور وہ کس طرح اس کے ہاتھوں تنگ آ چکے ہیں. میں اس وقت اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ مغربی جمہوریت کی مشینری ایسی ہے جس کی رُو سے وہی لوگ قوم کے نمائندوں کی حیثیت سے منتخب ہو سکتے ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی طرح دولت سمیٹ کر معاشرہ میں اثر و رسوخ حاصل کر لیا. لہٰذا' اس طرزِ حکومت سے' جس گروہ کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار آتی ہے وہ صلاحیت و قابلیت یا سیرت و کردار کی رُو سے قوم کا منتخب طبقہ نہیں ہوتا' مفاد پرستوں ہی کا ایک گروہ ہوتا ہے. لہٰذا' ملوکیت و آمریت اور جمہوریت میں فرق اتنا ہی ہوتا ہے کہ ملوکیت میں بزنس (کاروبار) ایک فرد کی ملکیت ہوتا ہے. جمہوریت میں یہ ایک لمٹیڈ کمپنی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے. مقصد دونوں کا سلب و نہب (EXPLOITATION)، ہوتا ہے.

قرآنِ کریم نے انسانی آزادی اور محکومی کا بنیادی تصور ہی بدل دیا۔ اس نے کہا کہ انسانوں پر حکومت کا حق کسی کو حاصل ہی نہیں۔ نہ ایک فرد کو اور نہ افراد کی کسی جماعت کو ـــــ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳/۷۸) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے ضابطۂ قوانین اور اقتدارِ امور، حتیٰ کہ نبوت تک بھی کیوں نہ مل چکی ہو کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے محکوم و فرماں بردار بن جاؤ۔ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) اور اس کی عملی شکل یہ ہے کہ کاروبارِ مملکت، خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق سرانجام پائے۔ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق نظامِ مملکت قائم نہیں کرتے تو انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (۵/۴۵) یہ لوگ ظالم ہیں۔ انسانوں کو حاکم اور محکوم کے طبقات میں تقسیم کر دینے سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے؟ لہٰذا، قرآن کی رُو سے مملکت، قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کی ایجنسی ہے اور یہ مشورہ امت کے باہمی مشورہ سے سرانجام پاتا ہے کہ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) خدا کا ارشاد ہے۔ اس تصور کی رُو سے، ایک ملک پر اگر خود اس ملک کے رہنے والے حکمران ہوں اور حکومت کا انداز مغربی جمہوریت بھی ہو، لیکن کاروبارِ مملکت، خدا کی کتاب کے مطابق سرانجام نہ پا رہا ہو، تو وہ آزادی نہیں غلامی ہے۔ اسے ملوکیت کہا جائے گا۔ لیکن اگر نظامِ مملکت، قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل ہو اور امورِ مملکت امت کے باہمی مشورے سے طے پائیں تو یہ آزادی ہے خواہ طرزِ حکومت (FORM OF GOVERNMENT)، کسی قسم کا ہو۔ اسے ہماری اصطلاح میں "خلافت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں تصوراتِ حکومت، (ملوکیت اور خلافت) ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک اسلامی ہے اور دوسرا غیر اسلامی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ صدارتی نظامِ جمہوریت غیر اسلامی ہے اور پارلیمانی سسٹم مطابق اسلام، تو یہ محض سیاسی نعرہ بازی ہے۔ اسلامی نظامِ جمہوریت اس کے سوا کچھ نہیں کہ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قوم کے مشورہ سے کاروبارِ مملکت سرانجام پائے۔

صدیوں کی ملوکیت کے خواب آور اثرات سے مسلمان، خلافت کے تصور کو فراموش کر چکا

تھا۔ دوسری طرف یورپ نے نظامِ جمہوریت کے حق میں اس قدر پراپیگنڈہ کیا کہ ساری دنیا اس سے مسحور ہو گئی اور یہ سمجھنے لگی کہ جنت سے نکلے ہوئے آدم نے پھر سے فردوسِ گم گشتہ کو پا لیا ہے۔ وہ اس نظام کو آیۂ رحمت اور نوعِ انسانی کے لئے سحابِ کرم خیال کرتی تھی۔ ان کی دیکھا دیکھی، خود مسلمان بھی اسے انعامِ خداوندی سمجھنے لگا اور یہ آوازیں چاروں طرف سے اٹھنی شروع ہو گئیں کہ نظامِ جمہوریت عین مطابق اسلام ہے۔ اس ہنگامہ ہائے و ہو اور تلاطمِ شور و شغب میں جبکہ ساری فضا اسی قسم کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ اقبالؒ کی فراستِ قرآنی نے اس فتنہ کو بھانپا اور اپنی بھرپور آواز سے مسلمانوں کو للکار کر کہا کہ اس فریب میں مت آؤ۔ ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

اس نے کہا کہ یاد رکھو! نظامِ حکومت جمہوری ہو یا شخصی، اگر اس کی اساس خدا کی کتاب پر نہیں تو وہ ملوکیت ہے۔ اس کے برعکس جس نظام کی بنیاد، ضابطۂ قوانینِ خداوندی پر ہے وہ عین اسلام ہے۔ اسے خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور ؎

خلافت بر مقامِ ما گواہی است حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

اس لئے ہر وہ نظام جس میں غیر قرآنی قوانین رائج ہوں، ملوکیت ہے اور ظلم و استبداد کا مظہر!

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اقبالؒ کی آخری کتاب "ارمغانِ حجاز" میں (جو اس کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی) ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے — ابلیس کی مجلسِ شوریٰ — میرے نزدیک وہ عصرِ حاضر کی تہذیب و تمدن اور سیاست و حکمت پر شدید ترین تنقید ہے اور فکرِ اقبالؒ کا نچوڑ۔ اس کے ساتھ ہی اسلام کے ایک زندہ و متحرک نظامِ حیات بننے کے خلاف جو قوتیں نہایت غیر محسوس طور پر مصروفِ تگ و تاز ہیں۔ اس میں ان کی نشاندہی اور نقاب کشائی بڑے شوخ اور حسین انداز سے کی گئی ہے۔ نظم کا پلاٹ یہ ہے کہ ابلیس کی کابینہ (CABINET) کا اجلاس ہو رہا ہے جس کی صدارت خود ابلیس کر رہا ہے۔

اس کابینہ میں ان تمام عوامل کو ایک ایک کر کے سامنے لایا جا رہا ہے جو ابلیسی نظام کے ضعف کا باعث بن سکتے ہیں۔ یہ عوامل زیرِ بحث آتے ہیں اور متعلقہ مشیر (وزیر) یہ بتاتا ہے کہ اس نے اس کی مدافعت کے لئے کیا حربہ تجویز کیا ہے۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جمہوری نظام کی نمود اس حقیقت کی غماز ہے کہ انسان اس نظامِ ملوکیت سے تنگ آچکا ہے جسے ابلیس نے مدت ہوئی وضع کیا تھا۔ اگر انسان نے اس نظامِ نو کو اختیار کر لیا تو پھر ابلیسی نظام کو زوال آجائے گا۔ چنانچہ اس مشیر نے وزیرِ سیاست سے دریافت کیا کہ ؎

خیر ہے سلطانیٔ جمہور کا غوغا کہ شر
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر

وزیرِ امورِ سیاسیہ مسکرایا کہ کہا کہ "ہوں"؟ یعنی میں ان سب تازہ فتنوں سے باخبر ہوں ؎

ہوں، مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے　　جو ملوکیت کا اک پردہ ہو کیا اس سے خطر
ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس　　جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خودنگر

بات یہ ہے کہ

کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے　　یہ وجودِ میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر
مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو　　ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

زمانۂ قدیم کی ملوکیت اور عصرِ حاضر کی جمہوریت اصل کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ دورِ جہالت کی شخصی ملوکیت جو کچھ کرتی تھی، کھلے بندوں کرتی تھی۔ لیکن عصرِ حاضر کی "جمہوری ملوکیت" وہی کچھ تہذیب کی اوٹ میں اور مفادِ عامہ کے تحفظ کے نقاب میں کرتی ہے۔ اس زمانے کی سلب و نہب (EXPLOITATION) کو بادشاہ اپنا حق سمجھتا تھا۔ اس زمانے کی "ملوکیت" اس سلب و نہب کو (PUBLIC INTEREST) کہہ کر عوام کو دھوکا دیتی ہے۔ یہ ہے وہ جمہوریت جس کا
— چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر — ہے۔

یہ تھا وہ جواب، جو ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں، وزیرِ امورِ سیاسیہ کی طرف سے دیا گیا۔ ابلیس

کا یہ حربہ کس قدر کارگر ہے، اس کی تشریح اقبالؒ نے، بالِ جبریل کی ایک نظم میں کی ہے جس کا عنوان ہے "ابلیس کی عرض داشت"۔ ابلیس خدا کے حضور ایک درخواست لے کر پہنچتا ہے جس میں تفصیل سے بتاتا ہے کہ اس دور میں، کارپردازانِ نظامِ مملکت، ان فرائض کو جو ابلیس کے سپرد کئے گئے تھے، کس حُسن و خوبی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ اس لئے اب اس کی اس کرۂ ارض پر ضرورت باقی نہیں رہی۔ اسے کہیں اور "ٹرانسفر" کردیا جائے۔ وہ بحضور ربّ العزت عرض کرتا ہے کہ ؎

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

میرے یہاں سے چلے جانے سے، امرِ مِنی سیاست کے کاروبار میں کسی قسم کا خلل واقع نہیں ہوگا بلکہ وہ اور زیادہ چمک اٹھے گا۔ اس لئے کہ ؎

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ — مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تُو نے — بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

پھر میری تو یہ کیفیت ہے کہ ہر شخص میرا نام سننے پر (زبان ہی سے سہی) لاحول پڑھتا ہے لیکن ؎

شیاطینِ ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادُو
کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری!

یوں اقبالؒ نے دورِ حاضر کی اس ملوکیت (یعنی مغربی نظامِ جمہوریت) کے خلاف مسلسل جہاد کیا۔

مذہبی پیشوائیت

اب برادرانِ عزیز! آگے بڑھیے!

آپ انسانی نفسیات پر غور کیجئے۔ دنیا میں کوئی انسان بھی کسی دوسرے انسان کا محکوم اور غلام بننا نہیں چاہتا۔ اس کی طبیعت ان زنجیروں کے خلاف اِبا کرتی ہے۔ پھر یہ کیا ہے کہ انسانوں کا گروہِ عظیم، ایک انسان یا انسانوں کے گروہ کی محکومی اور غلامی پر اس طرح رضامند ہو جاتا ہے کہ

اس کے خلاف بغاوت کرنا تو ایک طرف اس کے دل میں اس کے خلاف نفرت کا جذبہ تک پیدا نہیں ہوتا! یہ کام مذہبی پیشوائیت کرتی ہے۔ اس کی سحر آفرینی کا اثر ہے کہ

صید خود صیاد را گوید بگیر!

برہمن عوام کو یہ کہہ کر افیون پلاتا ہے کہ راجہ ایشور کا اوتار ہے۔ کلیسا کا اُسقف، سادہ لوح انسانوں سے کہتا ہے کہ بادشاہ کو حقوقِ خداوندی (DIVINE RIGHTS) حاصل ہوتے ہیں۔ محراب و منبر سے یہ سحر آفرین الفاظ دہرائے جاتے ہیں کہ۔ اَلسُّلطَانُ ظِلُّ اللّٰہِ عَلَی الْاَرضِ۔ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے۔ اس لئے بادشاہ کے حکم کی تعمیل درحقیقت اطاعتِ خداوندی ہے جو اس سے سرتابی کرتا ہے وہ خدا کی معصیت کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس قسم کے وعظ کہتا رہتا ہے کہ دنیا قابلِ نفرت شے ہے، اس سے دُور بھاگو۔ اس دنیا کی قوت و دولت، ثروت و حشمت، زیب و زینت، فاسق و فاجر لوگوں کے لئے ہے۔ خدا کے بندوں کی دنیا آخرت ہے۔ اُنہیں اسی پر نگاہ رکھنی چاہیئے۔ اور آخرت کے حصول کے لئے، وہ چند بے روح عقاید اور بے جان رسومات کو عینِ دین قرار دے کر، لوگوں کو ان میں زیادہ سے زیادہ منہمک رکھتا ہے تاکہ اُن کی نگاہ دوسری طرف اٹھنے ہی نہ پائے۔

مذہبی پیشوائیت، عوام کو اس فریب میں مبتلا رکھتی ہے تاکہ ملوکیت کو اپنی سلب و نہب میں کسی قسم کا خطرہ نہ رہے۔ اس طرح ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا ساجھا ہو جاتا ہے۔ راجہ برہمن کی رکھشا (حفاظت) کرتا ہے اور برہمن راجہ کو اشیرباد و دعا دیتا ہے۔ کنگ کلیسائی نظام کے لئے جاگیریں مقرر کرتا ہے۔ کلیسا، بادشاہ کے حقوقِ خداوندی کا محافظ بنتا ہے۔ سلطان، مذہبی پیشواؤں کے وظائف مقرر کرتا ہے اور مذہبی پیشوا برسرِ منبر اس کے لئے تائید و نصرت کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ یہ ہے ملوکیت اور برہمنیت کی وہ ملی بھگت جس سے استبداد کے فولادی پنجہ کی گرفت کبھی ڈھیلی نہیں ہونے پاتی۔ یاد رکھئے! ہامان کی مدد کے بغیر کسی فرعون کی فرعونیت ایک دن بھی نہیں چل سکتی۔ اسلام نے ملوکیت کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کا بھی خاتمہ کر دیا لیکن جب مسلمانوں میں دوبارہ ملوکیت کی نمود ہوئی تو فطری طور پر اس کے ساتھ مذہبی پیشوائیت بھی جلوہ دہِ محراب و منبر ہو گئی۔ اقبالؒ نے قوم کو اس مہیب خطرہ سے بھی آگاہ کیا اور عمر بھر، سلطانی کے ساتھ ملائی و پیری کے خلاف بھی مصروف

جہاد رہا۔

قرآنِ کریم نے مذہبی پیشوائیت کے فتنہ کے سلسلہ میں کہا تھا کہ۔ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ (۹/۳۴) یاد رکھو! یہ علماء اور مشائخ عوام کی کمائی مفت میں کھا جاتے ہیں۔ یہ لوگوں سے کہتے یہ ہیں کہ ہم تمہیں خدا کا رستہ دکھاتے ہیں حالانکہ خدا کے راستے میں سب سے بڑی روک خود یہی لوگ ہیں۔ ان کی ہر ممکن کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس راستہ پر چلنے ہی نہ پائیں جو خدا نے ان کے لئے تجویز کیا ہے انہی کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ ؎

یہی شیخ حرم ہے جو چُرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ

خدا اپنے رسولوں کی وساطت سے جو دین بھیجتا تھا وہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہوتا تھا جس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ دنیا سے ظلم و استبداد اور سلب و نہب پر مبنی ہر نظام کو مٹا کر اس کی جگہ نظامِ خداوندی متشکل کر دیا جائے۔ دین کے بنیادی تصوّرات اور ارکان و مناسک سب اسی انقلابی پروگرام کے اجزا ہوتے تھے۔ مذہبی پیشوائیت کی ٹیکنیک یہ ہوتی تھی کہ دین کے ان تصوّرات کے الفاظ اسی طرح باقی رکھے جائیں لیکن ان کا مفہوم بدل دیا جائے۔ اس کے ارکان و مناسک کی ظاہری شکل و صورت وہی رہے لیکن وہ چند بے مقصد رسومات کا مجموعہ بن کر رہ جائیں۔ یوں "مذہبی پیشوائیت کا وضع کردہ مذہب" دینِ خداوندی کی ممی شدہ لاش بن کر رہ جاتا تھا جس کے خط و خال تو وہی رہیں لیکن جس کی حقیقت ایک جسدِ بے روح سے زیادہ کچھ نہ ہو۔ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جب کہا کہ

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن　　مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں　　کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

دوسرے مقام پر کہا ہے کہ ؎

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے　　شاید کہ ترے دل میں اُتر جائے مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل　　یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست　　یہ مذہبِ ملاّ و جمادات و نباتات

قرآنِ کریم نے فرعون کے خلاف سب سے بڑا الزام یہ عاید کیا تھا کہ جَعَلَ اَھْلَھَا شِیَعًا یَسْتَضْعِفُ طَآئِفَۃً مِّنْھُمْ (۲۸/۴) وہ قوم میں افتراق پیدا کرتا رہتا. انہیں پارٹیوں میں تقسیم کر دیتا. کبھی ایک پارٹی کو اوپر چڑھا دیتا اور دوسری کو نیچے گرا دیتا اور اس طرح انہیں کمزور کرتا رہتا کہ وہ اس کے خلاف اٹھنے نہ پائیں. قرآنِ کریم نے امت میں تفرقہ کو خدا کا عذاب قرار دیا اور واضح الفاظ میں کہا کہ وَ لَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۙ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَ کَانُوْا شِیَعًا ؕ کُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ ○ (۳۰/۳۱-۳۲) مسلمانو! دیکھنا تم ایک خدا پر ایمان لا کر کہیں پھر سے مشرک نہ بن جانا. یعنی تم فرقوں میں نہ بٹ جانا. فرقہ بندی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے اور دوسروں کو باطل پر. اس طرح امت میں مسلسل پھوٹ پڑی رہتی ہے. ملوکیت کا اس میں فائدہ ہوتا ہے. وہ یہ کام مذہبی پیشوائیت سے کراتی ہے. مذہبی پیشوائیت امت کو مختلف فرقوں میں بانٹ دیتی ہے. یہ فرقے ایک دوسرے کی تکفیر کرتے رہتے اور اس طرح انہیں باہم لڑاتے رہتے ہیں اور ملوکیت اطمینان سے اپنی مفاد پرستیوں میں مصروف رہتی ہے. اقبالؒ نے جاوید نامہ میں، سعید حلیم پاشا کی زبان سے اسی حقیقت کو واشگاف کیا ہے. وہ کہتے ہیں کہ ؎

دینِ حق از کافری رسوا تر است　　زانکہ مُلّا مومنِ کافر گر است
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد　　ملت از قال و اقولش فرد فرد
مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب؟　　کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب
دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد　　دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

بالِ جبریل میں انہوں نے اسی حقیقت کو ذرا شوخ انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ قیامت میں ؎

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا　　حق سے جب حضرتِ مُلّا کو ملا حکمِ بہشت
عرض کی میں نے الٰہی! میری تقصیر معاف　　خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقوال　　بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت

اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت ہے بدآموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا

دین کے پروگرام کا ماحصل یہ تھا کہ جماعتِ مومنین، فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں قرآن کی عطا کردہ مستقل اقدار کے مطابق، نوعِ انسان کی منفعت کے لئے عام کر دے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصدِ جلیل کے حصول کے لئے علوم سائنس پر پوری پوری دسترس کے علاوہ، عالمگیر انسانیت کے مقتضیات اور عصرِ حاضر کے تقاضوں پر بھی گہری نگاہ ہونی چاہیئے لیکن جو کچھ ہماری مذہبی درسگاہوں میں پڑھایا جاتا ہے اس سے تو اتنا بھی معلوم نہیں ہو سکتا کہ سوئی کیسے بنائی جاتی ہے اور یونائیٹڈ نیشنز کس بلا کا نام ہے۔ ان درس گاہوں کے فارغ التحصیل "علماء کرام" کو زندگی کے عملی مسائل سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے؟
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام؟

اتنا ہی نہیں — ان کے نصاب میں اٹھارہ اٹھارہ علوم تو ہوتے ہیں لیکن قرآنِ کریم کے لئے اس میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ جو علوم وہاں پڑھائے جاتے ہیں، ان سے ان کے ذہنوں میں فرسودہ یونانی علم الکلام اور پامال شدہ عجمی تصورات اس طرح ٹھونس دیئے جاتے ہیں کہ ان میں دین کے مبادیات تک کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ اس کا رونا روتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیئے		بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
طریقِ شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیئے		وہ رمزِ شوق جو پوشیدہ لاالہٰ میں ہے

طریقت

یہ تو اربابِ شریعت کا حال ہے۔ اصحابِ طریقت ان سے بھی گئے گزرے ہیں — بالِ جبریل میں ہے۔

اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن		رمز و ایما اس زمانے کے لئے موزوں نہیں
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن		قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے!

دین کا انقلابی پروگرام یکسر مجاہدانہ زندگی کا متقاضی تھا جس کے لئے ایک ایسی جماعت کی ضرورت تھی جس کے رگ و پے میں بجلیاں بھری ہوئی ہوں۔ تصوف زندگی سے فرار سکھاتا ہے اس لئے خدا کے دین سے اس کا تعلق کیا ہو سکتا ہے؟ — اقبالؒ کے الفاظ میں — "تصوف اسلام کی سرزمین میں

اجنبی پودا ہے۔ دین، قوموں کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دیتا ہے۔ تصوف رگِ حیات میں رواں دواں خون کو منجمد کرکے رکھ دیتا ہے۔ دین، وہ شعلۂ جوّالا ہے جو باطل کے ہر نظام کو خس و خاشاک کی طرح راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔ تصوف زندگی کی رہی سہی حرارت کو بھی افسردہ کرکے قوموں کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ یہی وہ تأسف انگیز منظر تھا جسے دیکھ کر اقبالؒ نے ایک سرد آہ بھر کر کہا تھا کہ ؎

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال ملّا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

اس نے اربابِ خانقاہیت کو پکار کر کہا کہ ؎

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علمِ لاہوتی حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے یہ سرور تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اقبالؒ سے بھی پہلے، ایک اور قرآنی نگاہ رکھنے والے مردِ مومن — سر سیّد علیہ الرحمتہ — نے ان اجارہ دارانِ روحانیت کے متعلق کہا تھا کہ — "مسکینی اور انکساری ان کو آسمان پر چڑھاتی ہے اس لئے یہ اور زیادہ مسکین و منکسر بنتے ہیں۔ سادہ لوحی پر لوگ فریفتہ ہوتے ہیں اس لئے اور سادہ بنتے جاتے ہیں۔ دنیا سے نفرت ان کو دنیا دلاتی ہے اس لئے یہ دنیا سے زیادہ نفرت کرتے جاتے ہیں۔ بے طمعی، محنت کے بغیر درہم و دینار دلاتی ہے اس لئے یہ اور زیادہ بے طمع ہوتے جاتے ہیں۔ لوگ ان کی ہر بات پر آمنّا و صدقنا کہتے ہیں اس لئے ان کے دل میں دوسروں کی ہر بات کی حقارت جمتی جاتی ہے۔

ان، بظاہر "حجرہ نشینوں" کی یہ کیفیت ہے کہ لوگوں کو یہ دنیاوی آسائشوں اور زیبائشوں سے نفرت دلاتے رہتے ہیں۔ لیکن خود ان کے محلات ہر قسم کی عیش سامانیوں کے مراکز ہوتے ہیں۔ اقبالؒ نے (بالِ جبریل میں)، ایک "باغی مرید" کی زبان سے اسی حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے جب کہا ہے کہ ؎

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن!

نذرانہ نہیں، سود ہے پیرانِ حرم کا ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن!

یہ تھا ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا وہ دجل و فریب جس کے احساس سے اقبالؒ نے خون کے آنسو روتے ہوئے بحضور رب العزت فریاد کی تھی کہ ؎

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ سلطانی بھی عیاری ہے درویشی بھی عیاری

نظامِ سرمایہ داری

اس میں شُبہ نہیں کہ ملوکیت کی گرہیں کسنے کے لئے پیشوائیت کی سحر آفرینی بڑی مؤثر ہوتی ہے لیکن اس میں یہ خطرہ ضرور ہوتا ہے کہ اگر لوگوں نے ذرا بھی علم و عقل سے کام لینا شروع کر دیا تو اس طلسمِ سامری کی نگاہ فریبی کا جال دھواں بن کر اڑ جائے گا۔ اس کے لئے ایک اور حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ سرکس کا شیر، اتنی مہیب قوتوں کے باوجود، رِنگ ماسٹر کے سامنے بکری کیوں بنا رہتا ہے؟ اس لئے کہ اسے متواتر بھوکا رکھا جاتا ہے۔ بھوک، وہ مؤثر ترین حربہ ہے جس سے بڑے بڑے قوی ہیکل سرکشوں کو گردن جھکانے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ انسانی دنیا میں اس حربہ کا نام نظامِ سرمایہ داری ہے جو حکمتِ ابلیسی کا نادر شاہکار ہے۔ اس میں عیار طبقہ رزق کے سرچشموں پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے اور اس طرح جب لوگ روٹی کے لئے اس کے محتاج ہو جاتے ہیں تو ان سے جو کام چاہتا ہے، لیتا ہے۔ دینِ خداوندی، نظامِ سرمایہ داری کے خلاف کُھلا ہوا چیلنج تھا۔ وہ اسے جڑ بنیاد سے اکھیڑنے کے لئے آیا تھا۔ نظامِ سرمایہ داری کی عمارت، فاضلہ دولت (یعنی ضرورت سے زیادہ سرمایہ جمع رکھنے) کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ قرآن نے اس بنیاد ہی کو منہدم کر دیا اور ضرورت سے زیادہ دولت جمع کرنے والوں کو عذابِ جہنم کا مستحق قرار دیا۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا کہ — وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا

فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۹/۳۴) جو لوگ دولت کے انبار جمع کرتے رہتے ہیں اور اُسے دوسروں کی ضروریات کے لیئے عام نہیں کرتے۔ اے رسول! تو ان سے کہہ دے کہ ان کی اس روش کا انجام الم انگیز تباہی ہوگا۔ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ جس دن اس دولت کے سکوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیوں، ان کے پہلوؤں اور ان کی پشت کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا کہ۔ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ ٥ (۹/۳۵) یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنی ذات پر صرف کرنے کے لیئے جمع کر رکھا تھا۔ لہٰذا اب اس دولت کا مزہ چکھو۔

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد تو فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) پر ہوتی ہے۔ لیکن یہ فاضلہ دولت زمانۂ قدیم میں زمینداری سسٹم سے حاصل ہوتی تھی اور عصرِ حاضر میں نظامِ کارخانہ داری (انڈسٹری) کی رُو سے اکٹھی کی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے نظامِ زمینداری کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ زمین، تمام نوعِ انسان کے لیئے رزق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اس لیئے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ (۵۵/۱۰) "زمین کو ہم نے تمام مخلوق کے فائدے کے لیئے پیدا کیا ہے۔" اس لیئے اسے سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ (۴۱/۱۰) ہر ضرورت مند کے لیئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ اس سے جس قدر رزق پیدا ہوتا ہے اس میں کاشت کار کی محنت شامل ہوتی ہے اور باقی سب کچھ فطرت کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے۔ زمیندار فطرت کی ان بخشائشوں کو بھی اپنی ذاتی ملکیت بنا لیتا ہے اور کاشتکار کی محنت کا بیشتر حصہ بھی ہتھیا لیتا ہے۔ قرآنِ کریم اس حقیقت کو بڑے دلنشیں انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ۔ کیا تم نے اس پر کبھی غور کیا ہے کہ تم جو کھیتی کرتے ہو تو اس میں تمہارا حصہ کس قدر ہوتا ہے اور ہمارا کس قدر۔ تم زمین میں ہل چلا کر تخم ریزی کر دیتے ہو۔ اس کے بعد أَأَنْتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ کیا اس دانے کو تم اگاتے ہو یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے؟ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ ٥ إِنَّا لَمُغْرَمُونَ ٥ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ٥ اگر ایسا ہمارا قانونِ مشیّت یوں ساتھ نہ دیتا تو کھیتی کا اُگنا تو ایک طرف تمہارا بیج بھی ضائع ہو

جاتا اور تم سر پکڑ کر بیٹھ جاتے کہ ہم پر مفت میں چٹی پڑ گئی۔ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ۝ پھر تم نے کبھی اس پانی پر بھی غور کیا ہے جس پر زندگی کا اور کھیتی کا دارومدار ہے۔ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۝ کیا اسے تم بادلوں سے برساتے ہو یا ہم ایسا کرتے ہیں؟ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ۝ اگر ہمارا قانونِ مشیت ساتھ نہ دیتا اور جس طرح کا تلخ اور نمکین پانی سمندر میں تھا ویسا ہی یہ بادلوں سے برستا تو کھیتی کا اگنا تو ایک طرف تم خود بھی زندہ نہ رہ سکتے۔ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ۝ پھر کیا تم اس آگ پر غور نہیں کرتے جسے تم جلاتے ہو اور جس کی حرارت میں زندگی کا راز سربستہ ہے۔ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ ۝ کیا درختوں کی سبز شاخوں میں اس شعلہ سامانی کو ہم نے محفوظ رکھ چھوڑا ہے یا تم نے ایسا کیا ہے۔ نحن جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً ہم نے اس داستان کو اس لئے دہرایا ہے کہ تمہیں ایک فراموش کردہ حقیقت کی یاددہانی کرادی جائے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ زراعت کا یہ سارا کاروبار تمہارا اور ہمارا مشترکہ ہے۔ اس لئے اس کے ماحصل میں سے تم اپنا حصہ لے لو اور ہمیں ہمارا حصہ دے دو۔ تم پوچھو گے کہ تمہارا حصہ ہم کیسے دیں، سو سن لو کہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ۝ (۵۶/۶۳-۷۳) اسے بھوکوں کو دے دو، یہ ہم تک پہنچ جائے گا۔ اقبالؒ نے انہی آیات کے مفہوم کو اپنے حسین انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ؎

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون	کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار	خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب	موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

پھر اس نے صنعتی نظام (انڈسٹری) کی چکی میں پسے ہوئے خاک نشیں مزدور کو اٹھا کر گلے سے لگایا اور اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا کہ ؎

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر	شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی	اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار		انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے

اقبالؒ نے "بندۂ مزدور" کو یہ پیغام ۲۲-۱۹۲۳ء میں دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے بالِ جبریل اور ضربِ کلیم میں اسی پیغام کو اور بھی زیادہ واشگاف الفاظ میں دہرایا۔ بالِ جبریل میں ایک نظم کا عنوان ہے۔ فرشتوں کا گیت۔ اس میں ملائکہ خدا سے شکوہ سنج ہیں کہ ؎

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی		نقشِ گر ازل تیرا نقش ہے ناتمام ابھی
خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر		تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی

تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

اس پر خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ

اٹھو! میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو		کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی		اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے		پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے		بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

"فرشتے" وہ کائناتی قوتیں ہیں جو مشیتِ خداوندی کے پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے، زمانے کے تقاضوں کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔ یہی وہ "زمانے کے تقاضے" تھے جنہیں دیکھ کر، اقبالؒ کی نگۂ دُور رس نے بہت عرصہ پہلے اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا کہ اب ؎

زمانے کے انداز بدلے گئے		نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے		زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا		تماشا دکھا کر مداری گیا

حتّٰی کہ انہوں نے یہاں تک بھی کہہ دیا کہ ؎

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے　　ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے

یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے جب ہنوز (شاید) خود چینیوں کو بھی اپنے سنبھلنے کا حتمی طور پر اندازہ نہیں ہوا ہوگا. قرآن پر غور و فکر انسان میں ایسی بصیرت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ حوادثِ زمانہ سے اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ اب ہوا کا رُخ کدھر کو ہے.

قرآن نے نظامِ سرمایہ داری کے ختم کرنے کے سلسلہ میں کہا تھا کہ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ. اے رسولؐ! تجھ سے یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیں. قُلِ الۡعَفۡوَ (۲/۲۱۹) ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زاید ہے سب کا سب. جب روس میں اشتراکی انقلاب آیا تو اقبالؒ نے کہا کہ ؎

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم　　بے سود نہیں روس کی یہ گرمئ گفتار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر　　کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں　　اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

"شاید" اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ روس نے جس اشتراکی نظام کی ایسی عظیم عمارت استوار کرنے کا دعویٰ کیا ہے، اس کے ہاں ایسی بنیاد کوئی نہیں جو اس عمارت کا بوجھ اٹھا سکے. اس نے اہلِ روس سے اسی زمانے میں کہا تھا کہ ؎

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے　　جستۂ اُو را اساسِ محکمے؟

یہ بنیاد قرآن کے علاوہ اور کہیں سے نہیں مل سکتی. اس لئے کہ ؎

داستانِ کہنہ شستی باب باب　　فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب

اور آپ دیکھ رہے ہیں عزیزانِ گرامی قدر کہ اس اساسِ محکم کے نہ ہونے کی وجہ سے روس میں اشتراکیت کس بُری طرح سے ناکام ہو رہی ہے. یہ معاشی نظام، قرآن ہی کی بنیادوں پر کامیابی سے اٹھایا جا سکتا ہے. اس حقیقت کو اقبالؒ نے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کی نظم کے آخری بند میں

نہایت اُجلے، نکھرے اور حسین و شاداب انداز میں بیان کیا ہے۔ اسے غور سے سنئے۔

ابلیس کی کابینہ کے مشیر ہال نے کہا کہ دنیا میں اشتراکیت کا چرچا عام ہو رہا ہے اس لئے مجھے خطرہ ہے کہ ہمارا وضع کردہ نظامِ سرمایہ داری کہیں پامال نہ ہو جائے۔ اس لئے ہمیں اس کی بابت کچھ فکر کرنی چاہیئے۔ ابلیس نے یہ سُن کر کہا کہ تم نے صحیح نہیں سمجھا۔ مجھے اشتراکیت سے کچھ خطرہ نہیں۔ یہ ہمیں شکست نہیں دے سکتی۔ ہمارے لئے خطرہ کا گوشہ ایک اور ہے جس کی طرف تم میں سے کسی کی بھی نگاہ نہیں گئی۔

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایّام ہے — مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

اس پر اس کے مشیروں کی آنکھوں میں خفیف سی ہنسی پیر گئی جو اس تنقید کی غماز تھی کہ موجودہ مسلمان قوم سے بھلا ہمیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ اس پر ابلیس نے کہا کہ ؎

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں

کون سی شرعِ پیغمبرؐ؟

الحذر! آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر — حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے — نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف — منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب

پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

یہ ہے ہمارے لئے حقیقی خطرہ کا موجب۔ اس لئے ؎

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب

یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

اب ابلیس کے مشیروں کی سمجھ میں آیا کہ ان کے لئے حقیقی خطرہ کیا ہے۔ اس پر انہوں نے ابلیس

سے پوچھا کہ اس خطرہ کی روک تھام کے لئے ہمیں کیا پروگرام اختیار کرنا چاہیئے۔ اس نے کہا کرنا کیا چاہیئے؟ — وہی جو ہم کرتے چلے آتے ہیں۔ تم جاؤ اور اپنے نظام کی آلۂ کار مذہبی پیشوائیت کو کھٹکھٹاؤ اور اس سے کہو کہ وہ مسلمانوں کو اس قسم کے اختلافی اور نظری مسائل میں الجھائے رکھیں کہ ؎

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟ ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عین ذات!

آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات!

ہیں کلام کے الفاظ حادث یا قدیم امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات!

ذرا سوچو کہ ؎

کیا مسلماں کیلئے کافی نہیں اس دور میں یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات!

اسے ان نظری مسائل کے الجھاؤ میں ڈالے رکھو اور اس طرح ؎

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات!

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات!

لہٰذا، تم پوری پوری کوشش سے ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اس سے زیادہ اور کچھ کرنے کا کام نہیں — یہ ہو گیا تو تم چین کی نیند سوؤ۔ اس سے یہ قوم، ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کی زنجیروں میں جکڑی رہے گی اور ہمارا پورا لاؤ لشکر فسادِ آدمیت کے پروگرام کی تکمیل میں آزادانہ مصروف رہے گا۔

پاکستان

اقبالؒ نے ابلیس کی اسی سازش کو ناکام بنانے کے لئے پاکستان کا تصور دیا تھا۔ پاکستان سے اس کی مراد تھی ایک ایسا خطۂ زمین جس میں قوانینِ خداوندی

کی حکمرانی ہو تاکہ اسلام پر جو ملوکیت کا ٹھپہ لگ چکا ہے وہ دُور ہو جائے۔ مذہبی پیشوائیت کا اقتدار ختم ہو اور سرمایہ داری کی جگہ صحیح قرآنی نظامِ معیشت رائج کیا جا سکے۔ اس سے "اشتراکیت" کو وہ اساسِ محکم میسر آ جائے گی جس کے بغیر وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

۱۹۴۷ء میں وہ خطۂ زمین ہمیں مل گیا لیکن اُس وقت وہ حکیم الامت یہاں سے جا چکا تھا۔ اگر وہ اس وقت موجود ہوتا تو ہمیں "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کی اُس نشست کی روئیداد بھی اپنے الفاظ میں سُناتا جو حصولِ پاکستان کے وقت، ہنگامی طور پر منعقد ہوئی تھی۔ اس کی تفصیل کچھ اس قسم کی ہوتی کہ جب تقسیم ہند کا اعلان ہوا تو ابلیس کے مشیر چیختے چلاتے اس کے پاس آئے اور کہا کہ جہاں پناہ! غضب ہو گیا۔ تحریک پاکستان کامیاب ہو گئی، مسلمانوں کو ایک آزاد مملکت قائم کرنے کے لئے جداگانہ خطۂ زمین مل گیا۔ اس تحریک کے قائد نے بہت پہلے اعلان کر دیا تھا کہ اسلامی مملکت جس کے قیام کے لئے ہم جدوجہد کر رہے ہیں، قرآنی احکام و قوانین نافذ کرنے کی ایجنسی ہوتی ہے۔ اس نے زمینداروں اور سرمایہ داروں کو وارننگ دے دی تھی کہ تمہیں اپنی روش بدلنی پڑے گی۔ ایسا نہ کرو گے تو تمہارے لئے پاکستان میں کوئی جگہ نہیں ہو گی کیونکہ وہاں نظامِ سرمایہ داری نہیں چل سکے گا۔ اس نے ابھی ابھی (۱۹۴۸ء میں) ایک براڈ کاسٹ میں کہا ہے کہ پاکستان میں تھیاکریسی نہیں ہو گی۔ ہم نے دس برس تک مذہبی پیشوائیت کو برابر آگے بڑھائے رکھا کہ وہ تحریک پاکستان کی مخالفت کرے اور "خدا اور رسول" کے نام پر عوام کو اس کی حمایت کرنے سے باز رکھے۔ لیکن ان کی کسی نے نہ سُنی اور وہ تحریک کامیاب ہو گئی۔ اب اس خطۂ زمین میں قرآنی نظام قائم ہو جائے گا اور ہماری حکمرانی ختم ہو جائے گی — عالی جاہ! یہ کیا ہو گیا؟ — یہ کیسا انقلاب آ گیا؟ ؎

چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر — جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج — کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار

میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے

جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

ابلیس نے یہ سب کچھ خاموشی سے سُنا اور اس کے بعد نہایت سکون و اطمینان سے کہا کہ

اس میں شبہ نہیں کہ یہ انقلاب ہمارے لئے ایک بہت بڑے فتنہ کا پیش خیمہ بن سکتا ہے لیکن اس سے اس طرح گھبرانے اور چیخ و پکار کرنے کی کوئی بات نہیں۔ مسلمان، مذہب پرست قوم ہے، اسے اسی راستے سے بہکایا جا سکتا ہے۔ اسلام دشمن قوتیں بے نقاب ہو کر سامنے آئیں تو مسلمان ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے۔ لیکن یہی قوتیں جب مذہب کا لبادہ اوڑھ کر آئیں تو یہ سادہ لوح نہایت آسانی سے ان کے دامِ فریب میں آجاتا ہے۔ لہٰذا، تم اپنی قوتوں کو ایک بار پھر مجتمع کرو۔ ان کا جال سارے ملک میں بچھا دو۔ وَ اسۡتَفۡزِزۡ مَنِ اسۡتَطَعۡتَ مِنۡهُمۡ بِصَوۡتِكَ ۔ ان کی پراپیگنڈہ کی مشینری کو تیز تر کر دو۔ وَ اَجۡلِبۡ عَلَیۡهِمۡ بِخَیۡلِكَ وَ رَجِلِكَ۔ اپنے لاؤ لشکر ان کے (DISPOSAL) پر چھوڑ دو کہ یہ چاروں طرف سے اس امت پر یورش کریں وَ شَارِكۡهُمۡ فِی الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَوۡلَادِ ۔ روپے پیسے سے ان کی مدد کرو اور ایسا انتظام کرو کہ قوم کا نوجوان طبقہ ان کی گرفت میں رہے۔ وَعِدۡهُمۡ (۱۷/۶۴) اور انہیں حکومت و اقتدار کے سبز باغ دکھا دکھا کر اپنے پیچھے لگاتے رہو۔ تم یہ کچھ کرو اور پھر دیکھو کہ اس خطۂ زمین میں بھی تمہاری حکمرانی کس طرح بدستور قائم رہتی ہے۔ یہ میرے مدتوں کے آزمائے ہوئے تیر ہیں جن کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔ تم نے دیکھا نہیں کہ انہیں حربوں سے میں نے مسلمانوں کی اتنی اتنی بڑی مملکتوں کی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ وہاں کے مسلمانوں کی کیفیت یہ ہے کہ ؎

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو اگر پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!

تم دیکھتے نہیں کہ ؎

یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج　　صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام!

تمہارے لئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ؎

ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا　　کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام!

ان حربوں نے جو کچھ ان ممالک میں کیا ہے، وہی کچھ اس نوزائیدہ مملکت میں بھی کیا جا سکتا ہے جب تک دنیا میں مذہبی پیشوائیت باقی ہے، ہمارے لئے خطرہ کی کوئی وجہ نہیں۔ تم اسے ہر طرح سے تقویت پہنچاتے رہو اور جو پروگرام میں نے پہلے تجویز کیا تھا اُس پر اور بھی زیادہ شدت سے

عمل پیرا ہو جاؤ۔ یعنی جہاں جہاں بھی مسلمان نظر آئے ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اس پروگرام کے مطابق تشکیل پاکستان کے ساتھ ہی وہ مذہبی پیشوائیت، جو مسلسل دس سال تک تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرتی چلی آرہی تھی، پاکستان میں آن موجود ہوئی۔ اقبالؒ اس سے بہت پہلے دنیا سے جا چکا تھا اور جناحؒ قیامِ پاکستان کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ہم سے رخصت ہو گیا۔ اس لئے مذہبی پیشوائیت کو یہاں پوری طرح کھل کھیلنے کا موقعہ مل گیا۔ اس نے سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ

> چونکہ پاکستان، اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اور حصولِ پاکستان کی تحریک اسی مقصد کے تحت چلائی گئی تھی کہ یہاں اسلامی حکومت قائم کی جائے .... اور چونکہ یہاں مسلمانوں کی قومی قیادت اب تک جن لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے وہ ایک اسلامی حکومت کو چلانے کی صلاحیت سے عاریٔ محض ہیں۔ لہٰذا انہیں چاہیئے کہ وہ مسندِ قیادت و سیادت سے دستبردار ہو جائیں اور ایک نئی قیادت کے لئے جگہ خالی کر دیں۔ (جماعت اسلامی)

اٹھائیس سال سے مسلسل یہاں یہی جنگ جاری ہے جس نے قوم کو ان مقاصد کے حصول کی طرف آنے ہی نہیں دیا جن کی خاطر پاکستان کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ ملک کا سرمایہ دار طبقہ حسبِ معمول اس جنگ میں مذہبی پیشوائیت کے ساتھ ہے کیونکہ مذہبی پیشوائیت ان کے مفاد کی پوری پوری نگہداشت کرتی ہے۔ مثلاً یہاں جب یہ تجویز سامنے آئی کہ اللہ کی زمین جاگیرداروں اور زمینداروں کے قبضہ سے نکال کر، غریب کاشت کاروں کو دے دی جائے اور اس نہج کا قانون پاس کر دیا جائے کہ کسی شخص کے قبضہ میں اتنے ایکڑ سے زیادہ اراضی نہیں رہنے پائے گی تو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے یہ فتوے صادر فرمایا گیا کہ ایسا کرنا خلافِ شریعت ہے۔

> اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ

سے کوئی حد نہیں لگائی .... روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء
مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت
پر کوئی حد نہیں .... وہ جس طرح ہم سے یہ نہیں کہتا کہ
تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا
صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی
فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو. اس طرح وہ تم سے یہ بھی
نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو.

(مسئلہ ملکیت زمین، از سید ابوالاعلیٰ مودودی، صفحہ ۵۲ - ۴۲)

جب یہ سوال سامنے آیا کہ اتنے اتنے بڑے کارخانے سرمایہ داروں کی ذاتی ملکیت ہیں، انہیں ان کی ذاتی ملکیت سے نکال کر قوم کی مشترکہ تحویل میں دے دیا جائے تاکہ ان کی آمدنی قوم کے اجتماعی مفاد کے کام آئے تو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے فتویٰ صادر ہو گیا کہ

ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام
کے نقطۂ نظر کی ضد ہے.

(مسئلہ ملکیتِ زمین، صفحہ ۷۰)

نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ملک کی ساری دولت سمٹ کر چند گھرانوں میں محدود ہو گئی ہے اور غریب طبقہ دن بدن روٹی تک بھی محتاج ہوتا چلا جا رہا ہے. مذہبی پیشوائیت خوش ہے کہ ان کا جہادِ عظیم کامیاب ہو رہا ہے اور سرمایہ دار مطمئن کہ اسلام کی ڈھال ان کے لئے تیار کر دی گئی ہے جس کے پیچھے وہ 'جو جی میں آئے کر سکتے ہیں.

لیکن اس میں، عزیزانِ من! گھبرانے کی کوئی بات نہیں. جب ابلیس اپنے مشیروں کو یہ پروگرام دے رہا تھا تو آنسوئے افلاک سے یہ نشیدِ جلال بھی اس کے کانوں میں پہنچ رہی تھی کہ تم جو جی میں آئے کر دیکھو ــــ اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنٌ (۱۷/۶۴) میرے بندوں پر تیرا کوئی جادو نہیں چل سکے گا ــــ وہ بندے کہ

جن کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو!

وہ شمعِ قرآنی کو لے کر اٹھیں گے اور تمہارے مکر و دجل کی پھیلائی ہوئی تاریکیوں کے پردے چاک کر کے، ان کے پیچھے چھپے ہوئے ایک ایک چہرے کو بے نقاب کرتے جائیں گے۔ یہ کشمکش نئی نہیں ہے

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

اور تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں کہ جہاں اور جب بھی "چراغِ مصطفویؐ" کے علمبرداروں نے استقامت سے کام لے کر اپنی جدّوجہد جاری رکھی، "شرارِ بولہبی" خاکستر ہو کر رہ گیا۔ اور "فرعون، ہامان اور قارون" کا متحدہ محاذ بھی اسے بجھنے سے نہ بچا سکا ــــ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (۶/۴۵) اس طرح ہر ظلم کرنے والی جماعت کی جڑ کٹ گئی ــــ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ (۴۰/۷۸) ــــ اور قرآنی نظام کی مخالفت کرنے والی ہر قوت، خاکستر و نامراد رہ گئی۔ یہی پہلے ہوا ہے۔ یہی اب ہوگا۔ حقیقت ہے نہیں میرے تخیّل کی یہ خلّاقی!

اور یہ اس دن ہوگا جب مسلمانوں میں خدا کے عطا کردہ دین اور مذہبی پیشوائیت کے خود ساختہ مذہب میں فرق کرنے والی نگاہ پیدا ہو گئی اور اس قسم کی نگاہ قرآن کے علاوہ اور کہیں سے نہیں مل سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جو اقبالؒ نے کہا تھا کہ

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

لہٰذا، عزیزانِ من! ہمارے لئے اقبالؒ کا پیغام یہ ہے ــــ اور یہ پیغام اقبالؒ کا نہیں، درحقیقت قرآن کا پیغام ہے ــــ کہ اس خطۂ زمین، ارضِ پاکستان کی حفاظت کا پورا پورا سامان کیا جائے۔ کہ اگر یہ خطۂ زمین ہی (خدانخواستہ) باقی نہ رہا تو قرآنی نظام نافذ کس جگہ ہو سکے گا۔ ــــ اور جو تخریبی قوتیں اسلام کے نام پر ملک میں انتشار پیدا کرتی ہیں، ان کے فریب میں نہ آیا جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی ملک میں قرآنی پیغام کو عام کرتے جائیں۔ جب یہ پیغام فضا میں عام ہو گیا تو تخریبی قوتیں اس طرح کافور ہو جائیں گی جس طرح طلوعِ سحر سے

رات کی تاریکی کفن پوش ہو جاتی ہے۔ اگر آپ نے ایسا کر لیا، تو یقین جانئے کہ ؎

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش ۔۔۔ اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار ۔۔۔ نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ؁
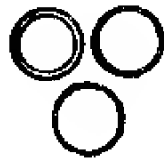
کیا اقبالؒ اشتراکی تھا؟

جولائی ۱۹۶۹ء

آج کل ہمارے ہاں، یہ موضوع بڑی شدت سے مرکزِ بحث و جدل بن رہا ہے کہ علامہ اقبالؒ اشتراکی تھے یا نہیں۔ ایک فریق انہیں، بدلائل و شواہد، اشتراکی ثابت کر رہا ہے اور دوسرا فریق انہیں انہی کے کلام اور تحریرات سے اشتراکیت کا دشمن بتا رہا ہے۔ اربابِ دانش مرحوم کو اس طرح رگید رہے ہیں اور عوام انگشت بدنداں ہیں کہ یہ ہمارا کس قسم کا حکیم الامت ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ

جنابِ شیخ کے نقشِ قدم یوں بھی ہیں اور یوں بھی

حضرت علامہ کا جو احترام ہمارے دل میں؛ اور ان کا جو مقام دنیائے علم و فکر میں ہے، اس کا تقاضا ہے کہ ہم حقیقتِ حال کو سامنے لا کر انہیں (کم از کم) اس الزام سے بچائیں کہ وہ اس قدر اہم موضوع پر ایسے متضاد خیالات کے حامل تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبالؒ چونکہ شاعر بھی تھے اس لئے ان کے کلام میں بعض مقامات پر تضاد بھی پایا جاتا ہے اور بعض نکات کے متعلق ہمیں ان کے فہم قرآن سے بھی اختلاف ہے۔ لیکن ہمارے مطالعۂ اقبال کی رُو سے، مسئلہ زیرِ نظر کے متعلق ان کے ہاں تضاد نہیں۔ اور وہ جس نتیجہ پر پہنچے ہیں، وہ ہمارے نزدیک قرآنی تعلیم کے مطابق ہے۔

واضح رہے کہ ہم اس موضوع پر اس لئے قلم نہیں اٹھا رہے کہ اگر ثابت ہوجائے کہ علامہ اقبالؒ اشتراکیت کے حامی اور مؤید تھے تو ہم کہہ دیں کہ اشتراکیت عین مطابق اسلام ہے اور اگر ایسا ثابت نہ ہو تو کہہ دیا جائے کہ اسلام اشتراکیت کے خلاف ہے۔ ہمارے نزدیک، کسی نظریہ یا مسلک کے اسلام کے مطابق یا مخالف ہونے کی سند اور حجت خدا کی کتاب زندہ قرآن حکیم ہے، نہ کہ کسی فرد کا قول یا خیال۔ حتیٰ کہ ہم کسی شخص کے فہمِ قرآن کو بھی قرآنی سند اور حجت کا مقام نہیں دے سکتے۔

ہم نے جب اس بحث پر غور کیا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس مجادلہ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جس طرح ہمارے ہاں "اسلام" کا کوئی متعین مفہوم نہیں — ہر فرد کا اسلام کا مفہوم الگ الگ ہے، حتیٰ کہ ایک ہی شخص کا، مختلف اوقات میں، اسلام کا مفہوم مختلف ہوتا ہے۔ کبھی "زمین پر بے حد و نہایت ذاتی ملکیت" عین اسلام ہے اور کبھی "دو سو ایکڑ رقبہ کی تحدید" عین دین۔ اسی طرح اشتراکیت کا بھی کوئی متعین مفہوم سامنے نہیں لایا جا رہا اور ارباب علم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ جب کسی اصطلاح کا مفہوم متعین نہ رہے تو اس کا نتیجہ الجھاؤ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کسی لفظ یا اصطلاح کا مفہوم متعین کیجئے۔ آدھا مسئلہ اسی سے حل ہوجائے گا۔ لہٰذا مسئلہ زیرِ نظر کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اشتراکیت کا مفہوم متعین کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ "اشتراکیت" سے ہماری مراد وہ سوشلزم ہے جس کا تصور مارکس نے دیا تھا۔

کارل مارکس محض ایک ماہرِ معاشیات نہیں تھا۔ اس کا شمار فلاسفرز کے زمرہ میں بھی ہوتا ہے۔ اس نے بنیادی طور پر ایک فلسفہ پیش کیا تھا اور پھر اس فلسفہ کی بنیادوں پر ایک معاشی نظام کا نقشہ دیا تھا جس کی ابتدائی شکل سوشلزم اور انتہائی کمیونزم ہے۔ لہٰذا، سوشلزم سے مراد ہے مارکس کا پیش کردہ فلسفہ حیات اور اس پر متفرع معاشی نظام۔ مارکس کے فلسفہ حیات کی رُو سے، انسان کی زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے اور اس سے متعلق مسائل مادی۔ اس تصورِ حیات کے مطابق، نہ خدا کا وجود باقی رہتا ہے نہ وحی کا۔ جب وحی کا وجود باقی نہ رہے تو نہ نبوت کا تصور باقی رہتا ہے، نہ اس کی وساطت سے عطا کردہ مستقل اقدار کا۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد حیاتِ اخروی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ہے (مسئلہ زیرِ نظر کی حد تک) مارکس کے فلسفہ حیات

کا ملخص.

جہاں تک معاشی نظام کا تعلق ہے، مارکس کے نظریہ کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) نظامِ سرمایہ داری کا دَور ختم ہو چکا ہے. اب اس کی جگہ ایسا نظام لے گا جو اس نظام (سرمایہ داری) کی ضد ہو گا.

(۲) اس (جدید) نظام میں ذرائع پیداوار، افراد کی ذاتی ملکیت کے بجائے محنت کشوں کی مشترکہ ملکیت (یا تحویل) میں رہیں گے.

(۳) فاضلہ دولت، جو نظامِ سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے کسی کے پاس نہیں رہے گی.

(۴) جب فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہے گی تو دولت کی بنیاد پر، دوسروں کی محنت کو غصب کر کے مزید دولت کمانے کا سوال باقی نہیں رہے گا. نہ ذاتی جائیدادیں کھڑی کی جا سکیں گی. نہ انفرادی کارخانے لگائے جا سکیں گے. نہ سودی کاروبار ہو سکے گا. نہ یہ صورت پیدا ہو سکے گی کہ

اُمتے بر اُمتے دیگر چرد
دانہ ایں می کارد آں حاصل بُرد

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے وہ مارکس کے پیش کردہ فلسفۂ حیات کا کبھی مؤید نہیں ہو سکتا. اسلام کا فلسفۂ حیات اور مارکسی فلسفۂ حیات ایک دوسرے کی ضد ہیں.

اب رہا معاشی نظام. سو اگر اسلام کا مفہوم غیر متعین رکھا جائے تو پھر مارکسی نظام، خلافِ اسلام بھی ہو سکتا ہے اور مطابقِ اسلام بھی. لیکن اگر اس کے مفہوم کے لئے قرآنِ کریم کو حرفِ آخر قرار دے لیا جائے تو اس کے اثبات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ قرآنِ کریم نظامِ سرمایہ داری کا سخت دشمن ہے اور اشتراکی نظام قرآن کے معاشی نظام کے مماثل[1] ہے.

آیئے، ہم دیکھیں کہ اقبالؒ اس باب میں کیا کہتا ہے.

---

[1] میں نے سوشلزم اور قرآن کے معاشی نظام کی تشریح اپنے اس خطاب میں کی تھی جو "اسلامی سوشلزم" کے عنوان سے طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اپریل ۱۹۷۲ء میں پیش کیا گیا تھا.

اقبالؒ کا قلبِ دردآگیں

اقبالؒ نے اپنے سینے میں ایک درد آگیں قلب پایا تھا جو مفلسوں اور ناداروں، محنت کشوں اور مزدوروں کی زبوں حالی پر خون کے آنسو بن کر اس کی چشمِ گریاں سے ٹپک پڑتا تھا۔ ان کی سب سے پہلی (نثر کی) کتاب "علم الاقتصاد" ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ وہ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخِ انسانی کے سیلِ رواں میں اصولِ مذہب بھی بے انتہا مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہوئی ہے کہ روزی کمانے کا دھندہ ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے سے اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی یا یوں کہو کہ ضروریاتِ زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قویٰ انسانی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلمِ اول یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدنِ انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے مگر مذہب اور زمانۂ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوتِ مدارج، بجائے اس کے کہ قیامِ تمدن کے لئے ایک ضروری جزو ہو، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔

یہ ۱۹۰۳ء کی بات ہے۔ غور کیجئے کہ اتنی سی عمر میں، اقبالؒ کے دل میں کس قسم کے سوالات اُبھر رہے تھے۔ یہ سوالات کہ (۱) آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے اور (۲) کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والا نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے؟ ـــــ ان سوالات میں "ہمیشہ کے لئے" کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ اقبالؒ کی باقی زندگی (منجملہ دیگر) انہی سوالات کے اطمینان بخش جواب کی تلاش میں گزری۔ ظاہر ہے کہ ان کا جواب ہمارے "مروجہ مذہب" کے معاشی نظام سے نہیں مل سکتا تھا کہ جس کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ نظمِ عالم کے لئے مفلسی ایک جزوِ لازم ہے۔ کیونکہ اگر مفلسی نہ رہے تو دولت مند لوگ صدقہ اور خیرات دے کر ثواب کیسے حاصل کر سکیں گے اور مفلسی سے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش نہیں ہونی چاہئیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہو گیا تو صدقہ و خیرات سے متعلق احکامِ شریعت معطل ہو کر رہ جائیں گے!

لیکن اقبالؒ نے ان سوالات کا جواب قرآنِ حکیم کے عالمگیر ابدی ضابطۂ حیات سے پا لیا

اقبالؒ اور نظامِ سرمایہ داری

اور انہی جوابات کو وہ امت اور عالمگیر انسانیت کے سامنے پیش کرتے رہے۔ سب سے پہلے انہیں قرآن کی دفتین سے یہ جواب ملا کہ مفلسی اور ناداری کا بنیادی سبب، نظامِ سرمایہ داری ہے اور جب تک اس نظام کی جڑیں نہیں کٹتیں، کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں خاموش نہیں ہو سکتیں۔ ان صداؤں کا علاج، محتاجوں اور مفلسوں کی جھولی میں، بھیک کے ٹکڑے ڈال دینے میں نہیں۔ ان کا علاج، اس نظام کے الٹ دینے میں ہے جو انہیں مفلس اور محتاج بناتا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر، اقبالؒ نے نظامِ سرمایہ داری کے خلاف جہاد کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے لیا۔ وہ اپنی مشہور نظم "خضرِ راہ" میں خضر سے سوال کرتے ہیں کہ

زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

اور خضر کی زبانی اس سوال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے　　خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات!
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر　　شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار　　انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے

اسی زمانہ میں، ان کا فارسی مجموعۂ کلام 'پیامِ مشرق' شائع ہوا. اس کے آخری باب "نقشِ فرنگ" کا بیشتر حصّہ، محنت اور سرمایہ کے اہم موضوع کے لئے وقف ہے. وہ اس میں "صحبتِ رفتگاں" کے عنوان کے تحت ٹالسٹائے کی زبان سے کہلواتے ہیں.

وارثے بیہوشی است، تاج، کلیسا، وطن
جانِ خدادادِ را خواجہ بجامے خرید!

اور کارل مارکس کے یہ الفاظ دہراتے ہیں کہ

رازدانِ جزو کل، از خویش نامحرم شد است　　آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شد است

ٹالسٹائے، ہیگل کے فلسفۂ اضداد کو "عقل و ورد" کی آفرینش کی تخلیق قرار دے کر اس پر ان الفاظ میں سخت تنقید کرتا ہے کہ اس کی رُو سے وہ

درسِ رضا می دہی بندۂ مزدور[1] را

ایرانی تحریکِ کمیونزم کا بانی 'مزدک'، دورِ حاضر کی اضطراب انگیزیوں کو دیکھ کر، پکار اٹھتا ہے کہ

ذاتہ ایراں زکشتِ زار و قیصر بردمید　　مرگِ نو می رقصد اندر قصرِ سلطان و امیر
مدّتے درآتشِ نمرود می سوزد خلیل　　تا تہی گردد حریش از خداوندانِ پیر

دَورِ پرویزی گذشت، اے کشتۂ پرویز خیز
نعمتِ گم گشتۂ خود را ز خسرو باز گیر

اس کے ساتھ ہی، مزدوروں کا نمائندہ 'کوہکن'، اس نفیرِ قیامت خیز کے ساتھ سامنے آتا ہے.

---

[1] انسانوں کا خود ساختہ مذہب، غریب کو تقدیرِ خداوندی پر شاکر رہنے کی تلقین سے درسِ رضا دیتا ہے.

نگارِ من کہ بسے سادہ وکم آمیز است ستیزہ کیش وستم کوش وفتنہ انگیز است
بروںِ او ہمہ بزم و درونِ او ہمہ رزم زبانِ اوز مسیح و دلش ز چنگیز است
اگرچہ تیشۂ من کوہ را ز پا آورد ہنوز گردشِ گردوں بکامِ پرویز است
زخاک تا بہ فلک ہرچہ ہست رہ پیماست
قدم کشائے کہ رفتارِ کارواں تیز است

اس کے بعد ہمارے سامنے فرانسیسی فلاسفر آگسٹس کومٹ اور مردِ مزدور کا مکالمہ آتا ہے۔ کومٹ، فلسفۂ مادیت کا علمبردار تھا اور طبقات کی تفریق کو عین مطابقِ فطرت قرار دیتا تھا۔ اس کے فلسفہ کے جواب میں، مردِ مزدور کہتا ہے۔

فریبی بحکمت مرا اے کلیم کہ نتواں شکست ایں طلسمِ قدیم
مسِ خام را از زر اندودۂ مرا خوئے تسلیم فرمودۂ
بہ کوہکن وادی اے نکتہ سنج بہ پرویز پرکار و نابردہ رنج؟
جہاں راست بہروزی از دستِ مزد ندانی کہ ایں ہیچ کاراست وُزد
پئے جرمِ او پوزش آوردۂ؟
بایں عقل و دانش فسوں خوردۂ؟

ازاں بعد، سرمایہ دار اور مزدور کا قسمت نامہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس تقسیم کی رُو سے سرمایہ دار مزدور سے کہتا ہے کہ میاں، اس حقیقت کو فراموش نہ کرو کہ

غوغائے کارخانۂ آہنگری ز من گلبانگِ ارغنونِ کلیسا ازانِ تو
نخلے کہ شہ خراج بروے نہد ز من باغِ بہشت و سدرہ وطوبیٰ ازانِ تو
تلخابۂ کہ دردِ سر آرد ازانِ من صہبائے پاکِ آدم و حوّا ازانِ تو
ایں خاک و آنچہ در شکمِ او ازانِ من
وز خاک تا بہ عرشِ معلّےٰ ازانِ تو

اور پھر، مزدور کی یہ دلخراش صدائے دردناک ہمارے کانوں میں آتی ہے۔

زمزدِ بندۂ کرپاس پوش و محنت کش نصیبِ خواجۂ ناکردہ کار رختِ حریر

زخوئے فشانیٔ من لعلِ خاتمِ والی ز اشکِ کودکِ من گوہرِ ستامِ امیر
زخونِ من چو زلو فربہی کلیسا را بزورِ بازوئے من دستِ سلطنت ہمہ گیر
خرابہ رشکِ گلستاں زگریۂ سحرم
شبابِ لالہ و گل از طراوتِ جگرم

اور اس کا ردِّ عمل —

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز مئے کہ شیشہ گداز د بہ ساغر اندازیم
مغان و دیر مغاں را نظامِ تازہ دہیم بناتے میکدہائے کہن بر اندازیم
ز رہزنانِ چمن انتقامِ لالہ کشیم بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم
بطوفِ شمع چو پروانہ زیستن تا کے
ز خویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تا کے

یہی حشر بداماں پیغامِ انقلاب ہے جسے "زبورِ عجم" میں ان الفاظ میں وجۂ تزلزلِ قصرِ سرمایہ داری بنایا گیا ہے۔

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاں خراب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

"بالِ جبریل" میں فرشتوں کا گیت، اسی رُوحِ انقلاب کا طنزیہ نشتر ہے۔ وہ خدائے کائنات کو مخاطب کر کے شکوہ سنج ہیں کہ

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی!
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی!

اور یہی وہ "عرش کے کنگورے ہلا دینے والا" احتجاج ہے جس کے جواب میں خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملتا ہے کہ

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے — بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

یہی بات ضربِ کلیم میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے کہ

اے شیخ امیروں کو مسجد سے نکلوا دے — ہے ان کی نمازوں سے محراب ترش ابرو

اس لئے کہ

کثرتِ نعمت گداز از دل برد — ناز می آرد نیاز از دل برد
سالہا اندر جہاں گردیدہ ام — نم بچشم منعماں کم دیدہ ام (جاوید نامہ)

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا کسی اشتراکی (ہی نے نہیں بلکہ کسی کمیونسٹ) نے اس سے زیادہ تند و تیز الفاظ میں، نظامِ سرمایہ داری کو الٹنے کے لئے دعوتِ انقلاب دی ہے؟ بالِ جبریل میں لینن خدا کے حضور یہ شکایت کرتا دکھائی دیتا ہے کہ

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں — ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

اور اس کا جواب، چار ہی قدم آگے چل کر، ہمیں اقبالؒ کے الفاظ میں یہ ملتا ہے کہ

گیا دورِ سرمایہ داری گیا — تماشہ دکھا کر مداری گیا

جاوید نامہ میں، مسلمان کی تباہی و بربادی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر — سود خوار و والی و ملا و پیر

دوسری جگہ ہے۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری — اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

ملا و پیر، غریبوں اور ناداروں کو جس اسلام کا سبق پڑھاتے ہیں، اقبالؒ اسے ابلیس کا پیدا کردہ فریب قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ارمغانِ حجاز میں، ابلیس کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا — میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

اور دورِ حاضر کے علم و فلسفہ اور تجارت و سیاست کو ملوکیت کی دسیسہ کاریوں کی تخلیق۔

یہ علم یہ حکمت یہ سیاست یہ تجارت
جو کچھ ہے وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد		(ارمغانِ حجاز)

اقبالؒ اس طرح نظامِ سرمایہ داری کے بُتِ سامری کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے آگے بڑھتے ہیں

مثبت نظامِ معیشت

اور قرآنی نظامِ معیشت کی بنیادی شقوں کو سامنے لاتے ہیں۔ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ ذرائع پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت میں رہنے چاہئیں۔ اقبالؒ کے نزدیک یہ نظریہ قرآنی نظریۂ معیشت کی یکسر نقیض ہے اور ابلیسانہ فکر کی ایجاد۔ ذرائع پیداوار میں بنیادی حیثیت زمین (ارض) کو حاصل ہے۔ اس باب میں اقبالؒ کا نظریہ اس قدر واضح ہے کہ اس میں دو آراء ہو نہیں سکتیں۔ جاوید نامہ میں انہوں نے "محکماتِ عالمِ قرآنی" کے جو تین ستون بیان کئے ہیں، ان میں ایک ستون یہ ہے کہ

ارض ملکِ خدا است

اس عنوان کے تابع وہ لکھتے ہیں:۔

حق زمیں را جُز متاعِ ما نہ گفت		ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دِہ خدایا! نکتہ از من پذیر		رزق و گور از وے بگیر اُو را مگیر

باطنِ "الارض للہ" ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

ہم نہیں سمجھتے کہ اقبالؒ، اس مسئلہ کے متعلق، اس سے واضح تر الفاظ میں، اور کیا کہہ سکتا تھا۔ آپ نے غور نہیں فرمایا کہ وہ مسئلہ ملکیتِ زمین کو، کفر و ایمان، کی بنیاد قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ زمین کو افراد کی ذاتی ملکیت قرار دینا کفر ہے۔

آگے چل کر کہتے ہیں۔

رزقِ خود را از زمیں بُردن رواست		ایں "متاعِ" بندہ و ملکِ خدا است

اور اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

ایکہ می گوئی متاعِ ما زِ ماست مردِ ناداں ایں ہمہ ملکِ خداست
ارضِ حق را ارضِ خود دانی ، بگو چیست شرحِ آیۂ لَا تُفْسِدُوْا!
ابنِ آدم دل بابلیسی نہاد من ز ابلیسی ندیدم جز فساد

بردۂ چیزے کہ از آنِ تو نیست
داغم از کارے کہ شایانِ تو نیست

اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ

ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ تاز کارِ خویش بکشائی گرہ

"ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" (ارمغانِ حجاز) میں، ابلیس کی زبان سے کہلوایا گیا ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

"بالِ جبریل" میں اس اجمال کی تفصیل حسبِ ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ نظم کا عنوان ہے۔

اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ

وہ زمیندار کو (جو اپنے آپ کو زمین کا مالک سمجھتا ہے) مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

دِہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں میری نہیں

جب یہ زمین تیرے آبا کی نہیں تھی تو اسے وراثت میں پاکر مالک بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جب یہ نہ تیری ہے نہ میری تو اسے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کیسے کیا جاسکتا ہے؟ یہ خدا کی ہے اور قرآن کی رُو سے جس چیز کو خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے، اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ تمام انسانوں کے فائدے کے لئے کھلی رہے گی۔ کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں جا سکے گی۔ جیسے اس نے جب کعبہ کے متعلق کہا کہ وہ میرا گھر (بیتی) ہے تو اس کے ساتھ ہی کہہ دیا گیا کہ اسے لناس بنایا

گیا ہے یعنی تمام نوعِ انسانی کے فائدے کے لئے. اس لئے وہ سواء ن العاکف و الباد. یعنی وہاں کے رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں' سب کے لئے یکساں طور پر کھلا یہی حیثیت زمین کی ہے' وہ نوعِ انسان کے لئے متاع (سامانِ زیست حاصل کرنے کا ذریعہ) ہے' کسی کی ذاتی جائیداد نہیں.

فاضلہ دولت جیسا کہ شروع میں لکھا جاچکا ہے' نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) ہے. اس سلسلہ میں قرآنِ کریم کا فیصلہ صاف اور واضح ہے. سورۂ بقرہ میں ہے. یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ. اے رسول! تجھ سے یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دولت رفاہِ عامہ کے لئے دے دیں. قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) ان سے کہہ دو کہ تمہاری ضروریات سے زاید جس قدر ہے' سب کی سب. اس فیصلہ نے فاضلہ دولت کا تصور ہی ختم کردیا. قرآنِ کریم کے اسی فیصلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے' اقبالؒ' جاوید نامہ میں کہتے ہیں کہ قرآن نے

با مسلماں گفت جاں برکف بنہ ہرچہ از حاجت فزوں داری بدہ

جب روس میں اشتراکیت کا انقلاب برپا ہوا تو اقبالؒ کی نگہِ ژرف بیں دُور رس نے اس میں فطرت کے اس اشارہ کو مضمر دیکھا کہ وہ دَور قریب آرہا ہے جب قرآن کا معاشی نظام وجۂ شادابیٔ عالم بن جائے گا. ضربِ کلیم کی یہ نظم (جس کا عنوان اشتراکیت ہے) اسی حقیقت کی پردہ کشائی کرتی ہے.

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

جو حرفِ قُلِ العَفو میں پوشیدہ ہے ابتک
اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

جب قرآن کی یہ مضمر حقیقت نمودار ہوگی تو اس وقت اس دنیا کا نقشہ کیا ہوگا' اسے اقبالؒ نے

جاوید نامہ میں، فلکِ مریخ پر، شہر مرغدین (دین کا گلستان) کے رنگ میں پیش کیا ہے اس میں

سخت کش دہقاں چراغش روشن است ۔۔۔ از نہاب دِہ خدایاں ایمن است
کِشت و کارش بے نزاعِ آبجوست ۔۔۔ حاصلش بے شرکتِ غیرے از اوست

اور

نے بہ بازاراں زِ بیکاراں خروش ۔۔۔ نے صداہائے گدایاں دردِ گوش

اقبالؒ اپنی ۱۹۰۳ء کی آرزو کو (جس کا ذکر شروع میں کیا جاچکا ہے) قرآنی نظام کی اس آئیڈیل دنیا میں پورا ہوتے دیکھتا ہے جہاں کیفیت یہ ہے کہ

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

اسی کو وہ دین کا ماحصل قرار دیتا ہے جب کہتا ہے کہ

کس نگردد در جہاں محتاجِ کس ۔۔۔ نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

اقبالؒ نے معاشی نظام کے متعلق جو کچھ کہا ہے، وہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ اس پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس میں اور اشتراکی نظام میں کس قدر مماثلت ہے۔ اقبالؒ کو یقین تھا کہ جس معاشی نظام کو اس نے قرآن سے سمجھا ہے وہ عہدِ رسالتمآبؐ میں عملاً متشکل ہوگیا تھا اور چونکہ وہ نظام، اشتراکیت کے مماثل تھا، اس لئے ابوجہل کو یہ مغالطہ لگ رہا تھا کہ

ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است
خوب می دانم کہ سلماں مزدکی است

۲۔ اِشتراکیت کی مخالفت

یہاں تک ہم نے دیکھ لیا ہے کہ اقبالؒ، اشتراکی نظامِ معیشت کا حامی تھا کیونکہ وہ نظام قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے۔ لیکن اقبالؒ اشتراکیت کے فلسفۂ حیات کا تو حامی نہیں

ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وہ فلسفہ، قرآن کے فلسفۂ زندگی کی یکسر نقیض ہے۔ لہٰذا اس فلسفۂ حیات کی تردید اور مخالفت کی اور سخت مخالفت۔ اس فلسفہ کی بنیاد "انکار" پر ہے، جسے اقبالؒ لَا سے تعبیر کرتا ہے۔ —خدا کا انکار، وحی کا انکار، مستقل اقدار کا انکار، اُخروی حیات کا انکار— اقبالؒ نے اس فلسفہ پر تنقید کی اور کہا کہ اس پر متفرع نظامِ زندگی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتا۔ وہ اپنی مثنوی —پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق— میں روس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ
لا سلاطیں، لا کلیسا، لا الٰہ!

لا سلاطیں اور لا کلیسا تک تو بات درست ہے کہ یہ نظامِ سرمایہ داری کے کل پُرزے ہیں لیکن لَا الٰہ کے بعد الّا اللہ نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کہ

درمقامِ لَا نیاساید حیات سُوئے اِلَّا می خرامد کائنات
لَا و اِلَّا برگ و سازِ امتاں نفیٔ بے اثبات مرگِ امتاں

وہ جاوید نامہ میں ملّتِ روسیہ کو حسبِ ذیل پیغام دیتے ہیں:۔

تو کہ طرح دیگرے انداختی دل ز دستورِ کہن پرداختی
کردۂ کارِ خداونداں تمام بگذر از لَا جانبِ اِلَّا خرام
درگذر از لَا اگر جویندۂ تا رہِ اثبات گیری زندۂ

ایکہ می خواہی نظامِ عالمے
جستۂ اُورا اساسِ محکمے

یہ اساسِ محکم اُسے کہاں سے ملے گی؟ —کہتے ہیں۔

داستانِ کہنہ شستی باب باب فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ اقبالؒ، اشتراکیت کے معاشی نظام کی حمایت تو کرتا ہے لیکن اشتراکیت کے فلسفۂ حیات کا سخت مخالف ہے۔ خود کارل مارکس کی یہی دو حیثیتیں ہیں جنہیں وہ بڑے حسین اور بلیغ انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ اس کے متعلق کہتا ہے۔

صاحبِ سرمایہ[1] از نسلِ خلیل یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل

یعنی وہ پیامبرِ انقلاب تو ہے لیکن وحی کی راہ نمائی سے محروم ہے۔ اس کا انقلابی پروگرام (جو نظامِ سرمایہ داری کو مٹا کر اس کی جگہ اشتراکی نظام قائم کرنے کا مدعی ہے جو قرآنی نظام کے مماثل ہے) برحق ہے۔ لیکن اس کا فلسفۂ زندگی یکسر باطل ہے۔

زانکہ حق در باطلِ اُو مضمر است قلبِ اُو مومن دماغش کافر است

کس قدر برجستہ اور بلیغ ہے یہ تجزیہ! اس کا قلب دردآگیں، مفلسوں، محتاجوں، مزدوروں، محنت کشوں کے مصائب سے وقفِ اضطراب ہے اور ان کی مشکلات کے حل کے لئے کوئی انسانیت ساز نظام تجویز کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اس کا قلب مومن ہے۔ لیکن اس کا فلسفہ یکسر باطل ہے اس لئے دماغش کافر است ـــ اس مقام پر مارکس کو "پیغمبرِ بے جبرئیل" کہا گیا ہے۔ ارمغانِ حجاز میں مشیرِ ابلیس کی زبان سے اس کے متعلق کہلوایا ہے کہ

وہ کلیمِ بے تجلّی وہ مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

یعنی ایک عظیم داعیٔ انقلاب، جو وحی کی روشنی سے محروم ہے، مارکس (یا اشتراکیت) کی اس محرومی اور بے بصری پر اقبالؒ کا دل کڑھتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وحی کی اساس محکم نہ ہونے کی وجہ سے اس قدر عظیم انقلابِ انسانیت، ناکام رہ جائے گا۔ وہ ہزار جان سے چاہتا ہے کہ اس انقلاب کے داعی، اپنے فلسفۂ حیات کے لئے قرآن سے رہنمائی حاصل کریں تاکہ یہ معاشی انقلاب ابدر کنار ہوجائے۔ اس امتزاج سے یہ عین مطابقِ اسلام ہوجائے گا۔ جب اقبالؒ نے سرفرانسس ینگ ہسبنڈ کو (۱۹۳۱ء میں) لکھا تھا کہ

بالشوزم + خدا = اسلام

اس سے اس کا مقصد یہی تھا کہ اشتراکیت کے معاشی نظام کو اگر قرآن کے فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر استوار کرلیا جائے تو یہ اسلام کے مماثل ہوجائے گا اور اسی میں نوعِ انسانی کی نجات کا راز وابستہ ہے۔ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیَانِ!

---

[1] کارل مارکس کی کتاب کا نام ہے۔

انہوں نے اس سے بھی بہت پہلے، اپنے ایک مراسلہ میں اپنے مسلک کی وضاحت کر دی تھی. بات یوں ہوئی کہ جب انہوں نے (بانگِ درا اور پیامِ مشرق میں) اشتراکیت کے معاشی نظام کی تائید میں لکھا تو ایک صاحب شمس الدین حسن نے (جو کمیونزم کے بہت بڑے حامی (اور ہفتہ دار اخبار انقلاب اور خاور کے ایڈیٹر رہ چکے تھے)' روزنامہ زمیندار (لاہور) کی اشاعت بابت ۲۲ جون ۱۹۲۳ء میں ایک مضمون میں لکھا کہ :۔

> بالشویک خیالات کا حامی ہونا جرم ہے تو پھر ہمارے ملک کا سب سے بڑا شاعر 'اقبال' قانون کی زد سے کس طرح بچ سکتا ہے. بالشوزم کارل مارکس کے فلسفۂ سیاسیات کا لبِ لباب ہے اور اسی کو عام فہم زبان میں سوشلزم اور کمیونزم کہا جاتا ہے. اقبال کی نظم۔ خضرِ راہ ___ اور ان کے مجموعۂ کلام 'پیامِ مشرق' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلّغ اعلیٰ ہیں۔

اس کے جواب میں حضرت علامہ کا '۲۴ جون ۱۹۲۳ء کے زمیندار میں خط شائع ہوا جس میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ

> (۱) میرے افکار کو بالشوزم سے منسوب کرنا غلط ہے. بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرۂ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے.
>
> (۲) میں مسلمان ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین حل قرآن مجید نے تجویز کیا ہے .
>
> (۳) روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردِّ عمل ہے لیکن مغرب کی سرمایہ داری اور روس کا بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں. اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے[1]

اس کے بعد انہوں نے ۱۹۳۶ء میں، خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط میں لکھا :۔

---

[1] بحوالہ ہفتہ وار چٹان، لاہور، بابت ۱۸ مارچ ۱۹۶۷ء۔

سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے خلاف ہیں اور اسے افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخِ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا...... جو روحانیت میرے نزدیک مغضوب ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے' اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔ (مکاتیبِ اقبالؒ)

اس سے سوشلزم اور اسلام کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سوشلزم کا فلسفۂ حیات ماننے والا' مسلمان نہیں ہو سکتا۔

انہوں نے اپنی وفات سے ایک سال پہلے قائداعظمؒ کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ:۔

شریعتِ اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم عام معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے..... اسلام کے لئے سوشل ڈیماکریسی کی کسی موزوں شکل میں ترویج' جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

ان حقائق سے واضح ہے کہ علامہ اقبالؒ سوشلزم کے فلسفۂ حیات کو اسلام کی نقیض قرار دیتے اور اس کے شدید مخالف تھے اور وہ قرآن کے معاشی نظام کو (جو سوشلزم کے معاشی نظام کے مماثل ہے) نوعِ انسانی کی مشکلات کا حل قرار دیتے تھے۔

اقبالؒ اور دو قومی نظریہ

یومِ اقبالؒ ۲۱ اپریل ۱۹۷۳ء کی تقریر

کاروانِ انسانیت کی داستان بھی عجیب و غریب ہے۔ اس میں سے لاکھوں انسان روزانہ کہیں گم ہوجاتے ہیں اور لاکھوں نئے افراد کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ افراد کی آمدورفت کا یہ سلسلہ پہلے دن سے جاری ہے اور آخری دن تک جاری رہے گا۔ ان آنے جانے والوں کی گمنامی کا یہ عالم ہے کہ ان کی داستانِ حیات تو ایک طرف، زمانے کی ریگِ رواں پران کے نقوشِ قدم تک بھی نہیں ملتے۔ لیکن اسی گمنام ہجوم اور بے نام و نشان انبوہ میں کبھی کبھار ایسے افراد بھی آجاتے ہیں جو زندہ و پائندہ روشنی کے میناروں کی طرح چمکتے اور کاروانِ انسانیت کے لئے نشاناتِ راہ اور سراغِ منزل بنتے ہیں۔ تاریخِ انسانیت درحقیقت انہی قندیلوں کی تابندہ شعاعوں سے عبارت ہے۔ اسی قسم کے افراد تعمیرِ انسانیت کے معمار اور تحسینِ کائنات کے نقش گر ہوتے ہیں۔ یہی وہ سیرت سازِ اقوامِ ملل ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ

فطرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

انہی زندۂ جاوید ہستیوں میں اس مردِ خود آگاہ و خدامست کا شمار ہوتا ہے جس کی یاد تازہ کرنے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوتے ہیں۔ وہ یگانۂ روزگار جس کے متعلق خود اس نے کہا تھا کہ

عمر ہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

صدفِ زمانہ ہزاروں سال تغیراتِ حوادث کی موجوں کے تھپیڑے کھاتی ہے تب جا کر اس قسم کے گوہرِ یک دانہ کی نمود ہوتی ہے۔

نقیبِ قرآن

عزیزانِ من! مشرق نے علامہ اقبالؒ کو ایک شاعر کی حیثیت سے جانا (اسی لئے انہیں زیادہ سے زیادہ "شاعرِ مشرق" کے لقب سے نوازا گیا) مغرب نے انہیں ایک فلاسفر کی حیثیت سے پہچانا اور دنیا کے ممتاز مفکرین کی صف میں انہیں جگہ دی۔ اس میں شبہ نہیں کہ شعر و فکر کی دنیا میں بھی ان کا مقام بہت بلند ہے لیکن میرے نزدیک ان کا صحیح مقام کچھ اور ہے اور وہ مقام ہے پیغامبرِ قرآن ہونے کا (پیغمبر نہیں پیغام بر یا نقیب)۔ میرے دل میں حضرت علامہ کی جو عظمت و عقیدت ہے وہ ان کے اسی مقام کی بنا پر ہے۔ خدا کی یہ کتابِ عظیم ہمارے ہاں صدیوں سے مقدس غلافوں میں لپٹی زینتِ دہ طاقِ نسیاں ہو رہی تھی۔ اقبالؒ نے اسے ان غلافوں سے نکالا اور اس کے پیغامِ حیات بخش کو اس انداز سے عام کیا کہ اس کے غلغلوں سے فضا گونج اٹھی۔ اس نے خوابیدہ ملّتِ اسلامیہ کو جھنجھوڑا اور کہا کہ:-

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است
رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

اس نے کہا کہ کس قدر مقامِ تاسف ہے کہ

بندۂ مومن ز قرآں برنخورد
در ایاغِ اُو نہ مے دیدم نہ دُرد

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست
خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

اس نے اس انقلاب آفریں ضابطۂ حیات کا تعارف ان الفاظ میں کرایا کہ

چیست قرآں خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

یعنی:-

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

ایک طرف قرآن نے ملوکیت اور نظامِ سرمایہ داری کا خاتمہ کر دیا اور دوسری طرف اس نے مذہبی پیشوائیت کو حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دیا۔

نقشِ قرآں تا درایں عالم نشست — نقشہائے کاہن و پاپا شکست

اس نے قرآن کے اس پیغام کو عام کیا کہ

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

اس نے کہا کہ ان خود ساختہ "نمائندگانِ خداوندی" کی حالت یہ ہے کہ :-

حق رابسجودے، صنماں را بطوافے

یہ طواف بتوں کا کرتے ہیں اور خدا کو اپنے سجدوں سے دھوکا دیتے ہیں۔ اس لئے ؎

بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

قرآن انسانی زندگی کے ہر گوشے کے لئے رہنمائی دیتا ہے اس لئے پیغامِ اقبالؒ کے بھی متعدد پہلو ہیں۔ میرے لئے یہ مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے کہ میں ایک نشست میں تمام گوشوں کا احاطہ کر سکوں۔ ایک نشست میں ان میں سے کسی ایک گوشے ہی کی وضاحت کی جا سکتی ہے۔ میں نے آج کی تقریب کے لئے ایک ایسے گوشے کا انتخاب کیا ہے جس نے پاکستان کی اجتماعی زندگی میں انتہائی اہمیت اختیار کر رکھی ہے اور جس پر میرے نزدیک، اس مملکت کی موت و حیات کا انحصار ہے۔ یہ موضوع ہے — دو قومی نظریہ — بظاہر ایسا نظر آئے گا کہ یہ مسئلہ ہنگامی سیاست سے متعلق ہے جس کا فیصلہ ہمیں اپنی سیاسی مصلحتوں کے مطابق کر لینا چاہیئے۔ لیکن جیسا کہ آپ دیکھیں گے کہ اس مسئلہ کا تعلق ہماری ہنگامی سے نہیں۔ یہ قرآن کی پیش کردہ ابدی حقیقت ہے اور دین کا اصل الاصول۔ علامہ اقبالؒ نے اسے اسی حیثیت سے پیش کیا اور اسی کی بنیادوں پر اس مملکت کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس طرح کسی عمارت کے استحکام کا انحصار اس کی بنیاد پر ہوتا ہے اسی طرح مملکتِ پاکستان کی سالمیت کا دارومدار اسی نظریہ پر ہے اور اس کی یہی اہمیت ہے جس کے پیشِ نظر میں نے اسے اپنے خطاب کا موضوع قرار دیا ہے۔

عزیزانِ من! اگر کوئی یہ کہے کہ ایک فقرہ میں بتائیے کہ اسلام کا مقصود و منتہیٰ اور دین کی غایت الغایات کیا ہے تو اسے پورے حتم و یقین کے ساتھ، متعین طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کا مقصود اور اس کے عملی نظام (دین) کی غایت یہ ہے کہ نوعِ انسان کے اختلافات و افتراقات کو ختم کر کے اُسے آسمانی اقدار کی بنیادوں پر ایک عالمگیر برادری بنا دیا جائے۔ انسانوں نے جب اپنی تمدنی زندگی کا آغاز کیا، تو قرآنِ کریم نے اپنے مخصوص انداز میں اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ كَانَ

دین کی غایت

النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) اس وقت تمام انسان ایک برادری (امتِ واحدہ) کی شکل میں رہتے تھے۔ ان میں نہ باہمی اختلاف تھا نہ افتراق۔ نہ تزاحم تھا نہ تصادم۔ رزق کے سرچشمے ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلے تھے۔ ان میں "میری اور تیری" کی کوئی تمیز نہ تھی اس لئے جس کو جہاں بھوک لگے وہیں سے پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا تھا (۲/۳۵)۔ اس طرزِ زندگی میں "نہ کسی کو بھوک کا خوف ستاتا تھا نہ پیاس کا، نہ کپڑے کی فکر وجہ پریشانی ہوتی تھی نہ مکان کی" (۱۱۸ ـ ۲۰/۱۲۱)۔ ان سے کہا گیا تھا کہ تم اسی طرح ایک برادری بن کر رہنا۔ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (۲/۳۵) باہمی مشاجرت اختیار نہ کر لینا۔ مشاجرت کے معنی ہیں شجر کی طرح ہو جانا کہ جس کی اصل ایک ہونے کے باوجود شاخیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ لیکن انسانوں نے اس سے اعراض برتا۔ فَاخْتَلَفُوْا (۱۰/۱۹) اور آپس میں اختلاف پیدا کر لیا۔ یہ ابتدائی اختلاف کیا تھا؟ یہ کہ وہ نسل کی بنیاد پر قبیلوں میں بٹ گئے اور بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶) اس طرح ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ اس سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہو گئیں جسے قرآن نے فساد کہہ کر پکارا ہے اور باہمی خونریزیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا (۲/۳۰)؛ (۲۷ـ۳۰/۵)۔ ان اختلافات کا مٹانا اور فساد انگیزیوں اور خونریزیوں کے بنیادی سبب کا ختم کرنا انسانوں کے اپنے بس کی بات نہ تھی۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ انسان اپنے معاشرہ کو اقدارِ خداوندی کے مطابق متشکل کرے۔ اسی لئے کہا کہ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ اس مقصد کے لئے خدا نے انبیاء کرامؑ کو بھیجنا شروع کیا جو لوگوں کو متنبہ کرتے تھے کہ اگر تم اسی طرح خاندانوں اور قبیلوں اور فرقوں میں بٹے رہے تو تباہ ہو جاؤ گے اور اگر تم اقدارِ خداوندی کے مطابق امتِ واحدہ بن گئے تو اس کا نتیجہ زندگی کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں ہوگا۔ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا

اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (۲/۲۱۳) اس مقصد کے لئے ان انبیاء میں سے ہر ایک کو الکتاب (ضابطۂ ہدایات و قوانین) بھی دیا تاکہ وہ اس کے ذریعے لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کر کے انہیں ایک امت کے قالب میں ڈھال دیں۔

یہ تھا عزیزانِ من! انبیاءؑ کے بھیجنے اور ان کے ساتھ کتابیں نازل کرنے کا مقصد یعنی ان اختلافات کو مٹا کر جن کی وجہ سے نوعِ انسان مختلف خاندانوں، قبیلوں اور قوموں میں بٹ گئی تھی اور اس لئے باہمی خونریزیوں اور فساد انگیزیوں کا حشر بپا ہو رہا تھا، اسے امتِ واحدہ (ایک عالمگیر برادری) بنا دیا جائے۔ جو لوگ انبیاء کرامؑ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اپنے نسلی، قبائلی اور قومی امتیازات کو مٹا کر وحی کی رہنمائی کے مطابق امتِ واحدہ کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو جاتے وہ ایک مرکز پر جمع ہو جاتے۔ جو اس دعوت کی مخالفت کر کے اپنے امتیازات کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف قبائل اور اقوام کی گروہ بندیوں کو قائم رکھنا چاہتے وہ ان کے برعکس دوسرا گروہ بن جاتے۔ اول الذکر کو امتِ مسلمہ یا جماعتِ مومنین کہا جاتا۔ یعنی امتِ واحدہ کے نظریہ کو تسلیم کرنے اور اس کی صداقت پر ایمان لانے والے۔ اور دوسری جماعت کو کفار کہا جاتا۔ یعنی اس نظریۂ زندگی سے انکار کر کے نسلی اور قومی امتیازات کو برقرار رکھنے پر اصرار کرنے والے۔ اس طرح پوری نوعِ انسانی دو گروہوں میں بٹ جاتی۔ اسے برادرانِ عزیز! دو قومی نظریہ کہتے ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ یہ نظریہ نہ تو تحریکِ پاکستان کے دوران وضع کیا گیا تھا اور نہ ہی اسے حصولِ مملکتِ پاکستان کے لئے سیاسی حربہ کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ یہ اسلام کی غایت اور دین کا اساسی اصول تھا جو اس دن وجود میں آگیا تھا جب خدا کی طرف سے سلسلۂ وحی کا آغاز ہوا تھا۔ قرآنِ کریم میں اس سلسلۂ زریں کی داستان کا آغاز حضرت نوحؑ سے ہوتا ہے۔ انہوں نے اس دعوت کو پیش کیا تو ان کی قوم کے کچھ افراد اس پر لبیک کہہ کر ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور باقی قوم نے اس نظریہ کی مخالفت کی۔ اس طرح ایک قوم کے بجائے دو قومیں وجود میں آگئیں۔ ان دونو قوموں کی نسل ایک تھی، زبان ایک تھی، قبیلہ ایک تھا، وطن ایک تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک قوم

---

۱ جو لوگ کہتے ہیں کہ نبی بغیر کتاب کے بھی آسکتا ہے وہ قرآنِ کریم کی اس واضح آیت کی تکذیب کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ تمام انبیاءؑ کو کتابیں دی گئی تھیں۔

نہیں رہی تھی۔ قومیں بن گئی تھیں۔ ان کے دو قومیں بن جانے کی بنیاد کیا تھی؟ بس ایک نظریہ کا اختلاف۔ اسے کہا جاتا ہے دین یا ایمان کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل۔ ان دو گروہوں میں یہ خلیج اتنی گہری اور ناقابلِ عبور تھی کہ جب حضرت نوحؑ نے نسلی رشتہ کی بنیاد پر کہا کہ ان کا بیٹا ان کے اہل میں سے ہے تو خدا نے یہ کہہ کر ان کی غلط فہمی کو دُور کر دیا کہ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ (۱۱/۴۶) وہ تیرے اہل میں سے نہیں کیونکہ وہ اس نظریہ پر ایمان نہیں لایا جسے تم نے پیش کیا ہے۔ یعنی نظریہ کے اختلاف سے۔ وطنی اور قبائلی تعلق تو ایک طرف، خاندانی اور نسلی رشتہ بھی باقی نہیں رہتا۔ باپ اور بیٹے کا رشتہ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

قرآنِ کریم نے حضرت نوحؑ کے بعد مختلف اقوام اور ان کی طرف بھیجے گئے انبیاء کرامؑ کا ذکر کیا ہے اور وضاحت سے بتایا ہے کہ انہوں نے اس دو قومی نظریہ پر کس طرح عمل کیا اور اس کے نتیجہ میں ایک ہی وطن میں نسل، قبیلہ، زبان، رنگ اور خون کے اشتراک کے باوجود نظریہ کے اختلاف کی بنیاد پر دو قومیں وجود میں آتی رہیں۔ ان کا پیش کردہ معیار جس سے اپنے اور بیگانے کی تخصیص ہوتی تھی یہ تھا کہ

فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ (۱۴/۳۶)

جو میرے مسلک کا اتباع کرتا ہے وہ میرا ہے (جو اس کے خلاف چلتا ہے میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں)۔

یہ سلسلۂ رشد و ہدایت اسی طرح جاری رہا، تا آنکہ آج سے چودہ سو سال پہلے، سرزمینِ عرب میں اس نبیٔ آخر الزماںؐ کا ظہور ہوا جس پر دین کی تکمیل ہو گئی اور سلسلۂ نبوت کا اختتام۔ خدا کے اس آخری

حضور خاتم النبیینؐ کے دور میں

رسولؐ نے دو قومی نظریہ پر اس طرح عمل کر کے دکھایا کہ اس کا مفہوم سمجھنے میں نہ کسی قسم کا شک و شبہ رہا نہ کوئی ابہام و التباس۔ اس نظریہ کی دو شقیں تھیں۔ ایک یہ کہ ایک ہی ملک میں بسنے والے، ایک ہی زبان بولنے والے، ایک ہی نسل سے متعلق افراد اگر اس نظریہ کی صداقت پر ایمان نہیں رکھتے تو وہ اس قوم کے افراد نہیں بن سکتے جو اس کی صداقت پر ایمان رکھتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، مسلم اور غیر مسلم مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے خواہ وہ ایک ہی وطن کے باشندے اور ایک ہی نسل کے افراد کیوں نہ ہوں اور

دوسری شق یہ تھی کہ ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر جو قوم (امت) متشکل ہو گی اس میں زبان، رنگ، نسل، وطن کی کوئی تخصیص باقی نہیں رہے گی۔ وہ سب ایک قوم کے افراد اور ایک تسبیح کے دانے ہوں گے۔ شق اوّل کا عملی مظاہرہ اس طرح ہوا کہ رنگ، نسل، وطن کا اشتراک تو ایک طرف حضورؐ کا حقیقی چچا ابولہب جس نے اس نظریہ کو تسلیم نہیں کیا تھا اس قوم کا فرد تسلیم نہیں کیا گیا جو ایمان کے اشتراک کی بنا پر وجود میں آئی تھی اور حضورؐ کے دوسرے چچا عباسؓ اور داماد ابوالعاص بھی اس وقت تک اس جدید قوم میں شمار نہیں کئے گئے جب تک وہ ایمان نہیں لے آتے۔ جہاں تک دوسری شق کا تعلق تھا حبش کا بلالؓ اور روم کا صہیبؓ، فارس کا سلمانؓ اور عرب کا ابوبکر (رضی اللہ عنہم اجمعین) وطن، زبان، رنگ، نسل کے اختلافات کے باوجود ایک امت کے افراد قرار پا گئے اور ان میں ایسی وحدت اور یگانگت پیدا ہو گئی کہ اس کے بعد وطن، زبان، رنگ، نسل کی سابقہ نسبتوں کا تصور تک بھی ان کے ذہن میں نہ آیا۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ خدا کی توحید پر ایمان کا عملی مفہوم امت کی وحدت ہے اور اس وحدت میں کسی قسم کی تفریق شرک ہے۔ قرآنِ کریم نے جو کہا ہے کہ:

وَ لَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَ كَانُوا شِيَعًا ۝ (۳۰/۳۲-۳۱)

مسلمانو دیکھنا! کہیں توحید پرست ہونے کے بعد پھر سے مشرک نہ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیا اور قوم مختلف گروہوں میں بٹ گئی۔

تو اس تفرقہ سے مراد صرف مذہبی فرقہ پرستی نہیں، اس سے مراد ہے ہر قسم کی تفریق خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو یا سیاسی پارٹیوں کی صورت میں۔ وہ ذاتوں اور برادریوں کے رنگ میں ہو اور خواہ "چار قومیتوں" کے پیکر میں جن کا آجکل نعرہ لگایا جاتا ہے۔ یہ تمام اختلافات شرک ہیں۔ اور چونکہ امت کی تشکیل رسول کی نسبت سے ہوتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (۶/۱۵۹) جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیں اور اسی طرح امت واحدہ رہنے کے بجائے

مختلف گروہوں میں بٹ جائیں، اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس باب میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ کسی جنگ میں دو (مسلمان) سپاہیوں میں کسی بات پر باہمی جھگڑا ہو گیا تو ان میں سے ایک نے سابقہ عادت کی بنا پر، غیر شعوری طور پر اپنے قبیلہ کو مدد کے لئے پکارا اور دوسرے نے اپنے قبیلہ کو۔ حضورؐ کے گوش مبارک تک یہ آواز پہنچی تو آپ فوراً خیمہ سے باہر تشریف لائے اور سخت برافروختگی کے عالم میں فرمایا کہ "تم لوگ ایمان لانے کے بعد پھر عہدِ جاہلیہ کی طرف پلٹ رہے ہو۔ یاد رکھو! یہ اسلام نہیں"۔ اسلام وہ تھا جس کا اعلان حضورؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں، جو عالمگیر انسانیت کا منشورِ عظمیٰ ہے، ان الفاظ میں فرمایا تھا کہ:۔

> عہدِ جاہلیہ کے تمام باطل نظریات میرے پاؤں تلے ہیں۔ یاد رکھو! تم سب ایک امت ہو۔ تمہارا ربّ ایک ہے۔ اصل کے اعتبار سے تم سب ایک ہو۔ اس لئے کالے کو گورے پر یا گورے کو کالے پر، عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر کسی قسم کی کوئی فضیلت نہیں بجز تقویٰ کے۔

یوں دین کی تکمیل ہو گئی۔ حضورؐ کے بعد کچھ عرصہ تک امت، امتِ واحدہ ہی رہی۔ اس میں کسی قسم کا کوئی تفرقہ پیدا نہ ہوا۔ لیکن اس کے بعد یہ گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی

حضورؐ کے بعد

اور سب سے پہلے اسی قبائلی تفریق نے سر نکالا جسے حضورؐ نے اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔ پہلے مملکت خلافتِ راشدہ تھی۔ اس کے بعد یہ بنو امیہ، بنی عباس، بنو فاطمہ کی قرار پا گئی۔ جب سلطنت اور حکومت کی نسبت قبائل کی طرف ہوئی تو مسلمان بھی امتِ واحدہ نہ رہے۔ مذہب کی دنیا میں یہ جس طرح فرقوں میں بٹی، اس سے قطع نظر، یہ قومی اعتبار سے ترکوں، مغلوں، عربوں، افغانوں، ایرانیوں میں بٹ گئی۔ پھر ان میں ذاتوں اور برادریوں کی تفریق در آئی۔ اب مسلمان اسلام کی طرف نسبت سے امتِ مسلمہ بننے کے بجائے سید، پٹھان، قریش، راجپوت، جاٹ، اعوان، ارائیں کی نسبتوں سے الگ الگ برادریوں میں تقسیم ہو گئے۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کے پیشِ نظر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

> یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
> تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

اس طرح صدرِ اوّل کے بعد، یہ امت، امتِ واحدہ نہ رہی۔ مختلف گروہوں اور قوموں میں بٹ گئی یہ چیز یقیناً موجبِ صد انتشار و تشتت تھی۔ لیکن اس کے باوجود، ایک بات باعثِ اطمینان بھی تھی۔ اور وہ یہ کہ اس دوران میں دو قومی نظریہ کی دوسری شق بہرحال قائم رہی۔ یعنی مسلمان، غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک قوم کبھی نہ بنے۔ یہ کسر مغرب کے نظریۂ قومیت نے پوری کردی۔ اس نظریہ کی

نیشنلزم کی لعنت

رُو سے، ایک ملک میں بسنے والے تمام افراد، بلا لحاظ مذہب و ملت، ایک قوم کے افراد قرار پا گئے۔ اس نظریہ کو نیشنلزم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ مغلوں کی حکومت کے زمانے تک، اس نظریہ نے ہندوستان میں بار نہیں پایا تھا۔ اس وقت تک، مسلمان، غیر مسلموں سے الگ ایک متعین اور منفرد قوم کے افراد تھے۔ انگریزوں نے اس نظریہ کو یہاں بھی عام کیا اور بیسویں صدی کے آغاز میں اس کا چرچا ہر جگہ ہونے لگا۔ یہیں سے ہمارے سامنے وہ اقبالؒ آتا ہے جس کی یاد منانے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوتے ہیں۔

اقبالؒ کی پیدائش، تعلیم و تربیت اسی (غیر منقسم) ہندوستان میں ہوئی تھی جہاں کی فضا

اقبالؒ کا ذہنی انقلاب

نیشنلزم کے پراپیگنڈے سے معمور تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک ہونہار طالب علم کا اس فضا سے متاثر ہو جانا فطری امر تھا۔ وہ انہی خیالات کو اپنے ذہن میں لئے مزید تعلیم کے حصول کے لئے ۱۹۰۵ء میں یورپ گیا اور تین سال تک وہاں رہا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب اقوامِ یورپ میں نیشنلزم کی مدح و ستائش کے غلغلے بلند ہو رہے تھے۔ دانایانِ مغرب اس نظامِ نو کو نوعِ انسان کی مشکلات کا مداوا قرار دے رہے تھے۔ چاروں طرف سے اس کی بارگاہ میں تبریک ذہنیت کے تحائف پیش کئے جا رہے تھے۔ ان حالات میں، ایک ایسے نوجوان طالب علم کو جو پہلے ہی سے نیشنلزم سے متاثر ذہن لے کر یورپ گیا ہو، متشدد نیشنلسٹ ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن مؤرخ کی نگاہ یہ دیکھ کر محوِ حیرت رہ جاتی ہے کہ اس طالب علم کے قلب و نگاہ میں ایک عجیب انقلاب رونما ہوا۔ وہ گیا تھا تو یہ کہتے ہوئے کہ

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اور واپس آیا تو یہ گاتا ہوا کہ

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

وہ گیا تھا تو یہ گنگناتا ہوا کہ

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے!

اور واپس آیا تو یہ الاپتا ہوا کہ

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اسکا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

وہ گیا تھا تو یہ سندیش دیتا ہوا کہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اور آیا تو یہ اعلان کرتا ہوا کہ

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے!

اقبالؒ کے قلب و دماغ میں اس قسم کا انقلاب کس طرح آیا تھا' اس کی وضاحت انہوں نے ۱۹۳۸ء میں (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ نظریۂ وطنیت کے موضوع پر بحث و تمحیص کے سلسلہ میں کی تھی۔ (اس معرکہ کی تفصیل ذرا آگے چل کر سامنے آتی ہے)۔ انہوں نے کہا تھا کہ وطن سے محبت اور اس کی خیر سگالی کا جذبہ ایک فطری امر ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن

زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں "وطن" کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں' بلکہ "وطن" ایک اصول ہے ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے۔ چونکہ اسلام بھی ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے اس لئے "وطن" کو جب ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے (اور یہ وجہ ہے کہ میں اس نظریۂ قومیت کی مخالفت کرتا ہوں)۔

چونکہ وطنیت یا قومیت کا یہ نظریہ' اسلام کے نظریۂ قومیت کے خلاف تھا' اس لئے اقبالؒ نے

اقبالؒ کا جہاد

اسے اپنی زندگی کا مشن قرار دیا کہ اس کے خلاف شد و مد سے جہاد کیا جائے۔ بانگِ درا میں وطنیت کے عنوان سے جو نظم زیبِ دہِ اوراق ہے

اور جسے اقبالؒ نے یورپ سے واپسی کے بعد لکھا تھا' اس میں انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں بتایا ہے کہ یہ نظریہ کس طرح اسلام کا نقیض اور نوعِ انسان کے حق میں زہرِ قاتل ہے. اس نظم کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اسے تماماً آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے. وہ کہتے ہیں.

اس دَور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مُسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی دے تو بھی نبوت کی صداقت کی گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوتؐ میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اِس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اِس سے

اقبالؒ مسلسل اپنی اس پکار کو دہراتا رہا اور قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو (بالخصوص) اس نظریۂ قومیت کی تباہ کاریوں اور فتنہ سامانیوں سے آگاہ کرتا چلا گیا. کبھی وہ ان سے ' رمز و ایما کے انداز سے کہتا کہ

باوطن وابستہ تقدیرِ اُمم بر نسب بنیادِ تعمیرِ اُمم

ملّتِ مارا اساسِ دیگر است　　ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است

اور کبھی اس اجمال کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کرتا..... کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر　　خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار　　قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اقبالؒ کا یہ پیغام، ہندی مسلمانوں تک محدود نہیں تھا. جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے اسلام کا اصولِ قومیت یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان خواہ وہ کسی خطۂ زمین میں بستے ہوں ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم کے افراد ہیں. محض ایک قوم کے افراد نہیں، ایک دوسرے کے بھائی — إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (۴۹/۱۰) — قرآن کا ارشاد ہے. اس اخوت کو اس نے کتاب اللہ سے وابستگی کا لازمی نتیجہ اور خدا کی خصوصی نعمت قرار دیا ہے جب کہا ہے کہ۔ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (۳/۱۰۲) خدا نے تمہیں اپنی نعمت کی رُو سے بھائی بھائی بنا دیا! اس اخوت کی بنا پر یہ امت کسی ایک خطۂ زمین میں محدود و محصور نہیں تھی. مسلمان جہاں بھی تھا، دنیا کے کسی خطے میں بھی سکونت پذیر تھا، دنیا کے باقی مسلمانوں کا بھائی اور امتِ مسلمہ کا فرد تھا. تمام دنیا کے مسلمان ایک قوم کے اجزاء تھے. بنا بریں، جس طرح نسلی وابستگی کی بنا پر مسلمانو کی الگ الگ قومیت کا تصور خلافِ اسلام ہے، اسی طرح جغرافیائی حدود (یعنی وطن کی نسبت) کی بنا پر ان کی جداگانہ قومیتوں کا نظریہ بھی دین کی نقیض ہے. اقبالؒ نے جو اسلام کی اس عالمگیر

عالمگیر اُمت

دعوت کا گہرا احساس رکھتا تھا، اپنے اس پیغام کو ہندوستان کی چار دیواری سے آگے لے جا کر، پورے کے پورے عالمِ اسلام تک پھیلایا.

اس نے ۱۹۲۲ء میں جب پہلی جنگِ عظیم کے بعد، تمام مسلم ممالک کی بالعموم اور ترکی کی بالخصوص، حالت بڑی سقیم ہو رہی تھی، جملہ عالمِ اسلام کو مخاطب کر کے کہا کہ یاد رکھو! ہماری نکبت و زبوں حالی کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ:-

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے — نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا — تُرکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اُڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر

اور اس سے اگلے سال (۱۹۲۳ء میں) انہوں نے اپنی مشہور نظم، طلوعِ اسلام میں انہی اقوام کو مخاطب کر کے کہا کہ

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو — اخوّت کا بیاں ہو جا، محبّت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

اس سلسلہ میں، مَیں عزیزانِ من! آپ کی توجہ ایک عظیم حقیقت کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں ہم میں سے کون ہے جسے اس کا علم و احساس، بلکہ شکایت نہیں کہ دوسرے ملکوں کی مسلمان سلطنتوں نے ہم ہندو پاک کے مسلمانوں کے مصائب و آلام میں بالعموم اس ہمدردی اور یگانگت کا ثبوت کبھی نہیں دیا جس کی ان سے بجا طور پر توقع کی جاتی ہے. لیکن اس کے باوجود ہماری کیفیت یہ ہے کہ اگر افریقہ میں کسی حبشی مسلمان کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو ہماری آنکھ کے آبگینے سے آنسو چھلک پڑتے ہیں. آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں، اس حکیم الامت نے اسلام کی عالمگیر اخوّت کا وہ پیغام دیا ہے جو نسل، رنگ، وطن کی حدود و ثغود سے ماوراء ہے اور جو ہماری ملّت کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے. اس لئے مسلمانانِ عالم پر کہیں مصیبت آئے، غیر شعوری طور پر ہمارے قلوب وقفِ اضطراب اور ہماری آنکھیں خوننابہ فشاں ہو جاتی ہیں. ۱۹۱۲ء کے جنگِ طرابلس میں ایک عرب لڑکی، فاطمہ بنت عبداللہ غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہو گئی تو اس کی یاد میں اقبالؒ نے جو نظم خونچکاں لکھی، اس کے سننے سے آج بھی حسّاس قلوب سینوں میں تڑپ اٹھتے ہیں. اس میں انہوں نے کہا تھا کہ:

ہمارا احساسِ اخوّت

فاطمہ! تو آبروئے امتِ مرحوم ہے — ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی — غازیانِ دین کی سقائی تری قسمت میں تھی

اس کے بعد اقبالؒ نے یہ نہیں کہا کہ ایسی بچی عربی نسل یا طرابلسی قوم کے لئے باعثِ فخر ہے۔ کہا یہ کہ فاطمہ خود ہماری بچی تھی۔ وہ صدفِ امتِ مسلمہ کا گوہرِ تابدار تھی۔ اس لئے اس کا یہ کارنامہ ساری امت کے لئے باعثِ صد شرف و عزت ہے۔

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی — ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی
اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں — بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

اور شاہی مسجد (لاہور) کے صحن میں وہ قیامت بھی تو جنگِ طرابلس ہی کے شہیدوں کی یاد میں برپا ہوئی تھی جس کے تصور سے آج بھی جگر کے ٹکڑے ہوجاتے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شہدائے طرابلس کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے شاہی مسجد میں ایک اجتماعِ عظیم منعقد ہوا جس میں علامہ اقبالؒ سے نظم کی فرمائش کی گئی۔ وہ ان شہداء کے غم سے نڈھال تھے۔ افتاں و خیزاں سٹیج پر آئے اور اپنے مخصوص محاکاتی انداز میں حضور رسالتمآب میں اپنی حاضری کا نقشہ اس طرح کھینچا کہ جب میں خدمتِ بابرکت میں پہنچا تو حضورؐ نے فرمایا کہ

نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بو آیا — ہمارے واسطہ کیا تحفہ لے کے تو آیا

تو میں نے (اقبالؒ نے) بصد احترام عرض کیا کہ!

حضورؐ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی — تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں — وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی

لہٰذا، ان حالات میں، میں ایسا تحفہ کہاں سے لاتا جو حضورؐ کے شایانِ شان ہوتا۔

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں — جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اس پر مجمع کا کیا حال ہوا ہوگا، آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اور ۱۹۲۲ء میں جب یونانیوں نے ترکوں کو شکست دی ہے تو اسلامیہ کالج (لاہور) کے

میدان میں اقبالؒ نے جس درد و کرب سے اپنی نظم — خضرِ راہ — پڑھی تھی اس کی یاد آج بھی خون کے آنسو رُلاتی ہے۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ　　خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہوگئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ　　جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبورِ نیاز

اور انتہائی مایوسی کی اس تاریک فضا میں، اس امیدوں کے شہزادے نے آخر میں یہ پیغام دیا کہ

مسلم استی! سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد دار

ایسا نظر آتا ہے کہ یہ پیغامِ حیات بخش دیتے وقت اس دیدہ ور کی نگہ دُور رس نے اُس انقلاب کو بے نقاب دیکھ لیا تھا جو اُس وقت ضمیرِ کائنات میں پہلو بدل رہا تھا اور جس کی رُو سے، دوسرے ہی سال، ترکوں نے یونانیوں کو شکستِ فاش دے کر اپنے لئے حیاتِ نو کا سامان پیدا کر لیا تھا۔ ترکوں کی اس محیّر العقول کامیابی پر اقبالؒ، طرب و نشاط کی ہزار جنتیں اپنے جلو میں لے کر رقصاں و فرحاں جس طرح اسٹیج پر آیا اور جوشِ مسرت میں جس ولولہ اور طنطنہ سے اپنی نظم، طلوعِ اسلام پڑھی اس کی یاد کبھی دلوں سے محو نہیں ہو سکتی۔ آتے ہی کہا کہ

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی　　افق سے آفتاب اُبھرا گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مُردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا　　سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

اور

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے　　کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

یورپ کی مخالفت

جب تک اقبالؒ نے اسلام کے معیارِ قومیّت کے پیغام کو ہندی مسلمانوں تک محدود رکھا۔ اس کے خلاف کوئی ایسا ردِ عمل نہ ہوا۔ اسے محض ایک شاعر کا خواب سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ اس لئے کہ اُس زمانے میں یہاں کی سیاسی فضا پر اس کا کچھ اثر نہیں تھا۔ لیکن جب اس نے اس پیغام کو دیگر مسلم ممالک تک پہنچایا تو مغربی سیاست کے مہرہ بازوں کے دل میں اس سے طرح طرح کے خطرات نمودار ہوتے۔ ان

خطرات کی وضاحت علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں کی تھی:-

> مجھے یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں "افرنگی نظریۂ وطنیت" کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگِ عظیم میں کامیاب بھی ہوگئی۔
>
> (بیان: مولانا حسین احمد کے جواب میں)

یہ تھی مغربی اقوام کی وہ سازش جس کے لئے مہرہ بازانِ افرنگ، پیغامِ اقبالؒ میں خطرہ محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے مفکرین نے گوسفندانہ ہمدردی کے لباس میں، اُسے یہ طعن دیا کہ وہ اپنے عالمگیر انسانیت کے پیغام سے ہٹ کر، اس قسم کی "فرقہ وارانہ" تنگنائے کی طرف کیسے چلا گیا؟ پروفیسر نکلسن کے نام علامہ اقبالؒ کا خط اس سازش کی غمازی کرتا ہے جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ:-

> اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا، جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں ہے، نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ رینان کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ درحقیقت اسلام بلکہ کائناتِ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسان سے محبت رکھتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف عَلمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدودِ ملک پر ہے، دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے اور مسلمان، عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کرکے اس عقیدہ کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدردِ نوعِ انسان کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا مناسب

سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فریضہ سارے بنی آدم کی نشوونما و ارتقاء ہے۔

یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے محبت ہے لیکن مسٹر نکلسن کا یہ خیال درست نہیں کہ میں نے محض اس کی محبت کے پیشِ نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے حقیقت یہ ہے کہ عملی حیثیت سے میرے لئے اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے.....

(فوز و فلاحِ انسانیت کے پروگرام کو عمل میں لانے کے لئے ضروری ہے کہ اس نظریہ کو پہلے ایک ایسی سوسائٹی تک محدود کر دیا جائے جو ایک مستقل عقیدہ اور معیّن راہِ عمل رکھتی ہو لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔

جس عملی ضرورت کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے اپنے عالمگیر پیغام کو ابتداءً مسلمانوں تک محدود رکھنا ضرور سمجھا۔ اسی قسم کے تقاضا نے انہیں

ہندوستان میں سیاسی تغیّرات

اس پر مجبور کیا کہ وہ اس دائرے کو پہلے مسلمانانِ ہند تک محدود کر دیں۔ اس کی وجہ اُس زمانے میں ہندوستان میں سیاسی تغیرات کی نمود تھی۔ انگریز کے اپنے حالات اسے مجبور کر رہے تھے کہ مملکتِ ہند میں زیادہ سے زیادہ اختیارات اہلِ ہند کی طرف منتقل کر دے۔ ہندو نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور وطنیت کی بنا پر نظریۂ قومیت کو عام کرنا شروع کر دیا۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ:

(۱) ہندوستان کی جغرافیائی حدود میں بسنے والے تمام لوگ، بلحاظ مذہب و ملت ایک قوم کے افراد ہیں۔

(۲) حکومت کے اختیارات اس قوم کی طرف منتقل ہوں گے۔

(۳) یہاں جمہوری نظام رائج کیا جائے گا جس میں مملکت سے متعلق تمام فیصلے اکثریت کی آراء سے ہوتے ہیں۔

(۴) اور یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اکثریت ہندو کی تھی اور ہندو ہی کی رہنی تھی۔

(۵) اس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندو اکثریت کے محکوم رہیں۔
یہ تھا یہاں کے بدلتے ہوئے حالات کا فوری تقاضا جس کی وجہ سے علامہ اقبالؒ کو اپنی تمام تر توجہ مسلمانانِ ہند پر مرکوز کر دینی پڑی اور انہوں نے نہایت شد و مد سے اس حقیقت کو عام کرنا شروع کر دیا کہ وطنیت کے معیار کے مطابق قومیت کی تشکیل اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف ہے ہندوستان میں بسنے والے تمام مسلمان، دین کے اشتراک کی بنا پر ایک منفرد اور مستقل بالذات قوم ہیں اور یہاں کے غیر مسلم ان سے الگ دوسری قوم کے افراد۔

آپ نے دیکھا برادرانِ عزیز! کہ دو قومی نظریہ نہ تو کسی ہنگامی سیاسی تقاضا کی پیداوار تھا اور نہ ہی اسے مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے لئے حربہ کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ دو قومی نظریہ اس دن وجود میں آیا تھا جس دن خدا نے پہلی وحی عالمِ انسانیت کی طرف بھیجی تھی۔ یہ دینِ خداوندی کا اساسی اصول ہے اور توحید اور شرک میں خطِ امتیاز۔ اشتراکِ دین کے سوا کوئی بھی معیارِ قومیت ہو وہ اسلام کے خلاف ہے۔ اقبالؒ نے اس نظریہ قومیت کی نشر و اشاعت، یورپ سے واپسی کے بعد شروع کر دی تھی۔ وہ ساری عمر اس پیغام کو عام کرتے رہے۔ ان کے اس پیغام کے

ہندو کی طرف سے مخالفت

مخاطب کسی خاص خطے کے مسلمان نہیں تھے، ساری دنیا کے مسلمان تھے۔ لیکن جب اقبالؒ نے دیکھا کہ ہندوستان کے سیاسی تغیرات اس تیزی سے رونما ہو رہے ہیں کہ اگر یہاں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے نظریہ کو خصوصیت کے ساتھ عام نہ کیا گیا تو نیشنلزم کی رو سے یہاں مسلمانوں کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ تو انہوں نے اس خطۂ زمین کو اپنے پیغام کا اولیں مخاطب قرار دے دیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ اگر ہم یہاں اس نظریہ کو عمل میں لانے کے قابل ہو گئے تو یہ چیز باقی ممالکِ اسلامیہ کے لئے نظیر بن جائے گی اور اس طرح یہاں کی مسلم قوم، عالمگیر امتِ مسلمہ کی تشکیل کے لیے ذرّہ اولین (FIRST CRYSTAL) کا کام دے گی۔

جب ہندو نے دیکھا کہ اقبالؒ کا پیغام کس طرح ان کے اس خواب کو جس کی رو سے وہ مسلمانانِ ہند کو ابدی طور پر اپنا محکوم رکھنا چاہتا تھا، خوابِ پریشاں بنا دے گا تو اس نے اس کی مخالفت کی اور سخت مخالفت۔ اقوامِ مغرب، مسلمانانِ عالم کے امتِ واحدہ بن جانے میں اپنے

استعمار کے لئے خطرہ محسوس کرتی تھیں اس لئے انہوں نے اسے مذہبی جنون کہہ کر اس کی مذمت اور مخالفت کی۔ ہندو نے مسلمانانِ ہند کے ایک الگ اور منفرد قوم کی حیثیت اختیار کر لینے میں، اپنے سیاسی تغلب کے منصوبے بکھرتے دیکھے، اس لئے اس نے بھی اس کی مخالفت کی۔ یہ ہے ہندوستان میں نیشنلزم اور دو قومی نظریہ کی کشمکش کی تمہید۔ یاد رہے کہ ہندو کے نزدیک تو دو قومی نظریہ کی مخالفت یکسر سیاسی نوعیت کی تھی، لیکن مسلمانوں کی طرف سے اس نظریہ پر اصرار ان کے دین کا تقاضا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس دینی تقاضا کے پورا ہونے سے انہیں سیاسی مفاد بھی حاصل ہو جاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں، ملت کے سیاسی مفادات اتباعِ دین کا فطری نتیجہ ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کی دنیا ان کے دین سے الگ نہیں ہوتی۔

آیئے، اب دیکھیں کہ ہندوستان میں نیشنلزم اور دو قومی نظریہ کی یہ جنگ کیسے لڑی گئی!

یہ حقیقت بڑی جگر پاش اور اس کا تذکرہ بڑا جاں سوز ہے کہ مخالفین نے جب کبھی اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا تہیہ کیا تو اس مقصد کے لئے انہیں خود مسلمانوں میں سے آلۂ کار مل گئے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، دو قومی نظریہ اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے تھا اور ہندو کی طرف سے اس کی مخالفت سیاسی وجوہ پر تھی۔ لیکن اسے خود ہندی مسلمانوں میں ایسے لوگ مل گئے جو اس نظریہ کی مخالفت میں ہندوؤں سے بھی آگے بڑھ گئے۔ ان میں بعض لوگ تو محض سیاسی حیثیت کے حامل تھے اور سیکولر حکومت کے قائل۔

نیشنلسٹ مسلمان

ان کی طرف سے اس نظریہ کی مخالفت قابلِ فہم تھی اگرچہ یہ امر موجبِ تاسف تھا کہ مسلمان ہوتے ہوئے اس کی مخالفت کرتے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ المناک اور زہرہ گداز یہ سانحہ تھا کہ ان مخالفین کی قیادت مذہبی پیشواؤں یعنی نیشنلسٹ علماء کی طرف سے ہو رہی تھی۔ ہندو مطمئن تھا کہ مسلمان اپنے جس دعویٰ کو مذہب کی بنیادوں پر پیش کر رہے ہیں اس کی مخالفت خود انہی کے مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہو رہی ہے۔ یہ مخالفت اپنے انتہائی نکتہ پر اس وقت پہنچی جب شروع ۱۹۳۸ء میں، (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) نے دہلی کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں"۔ ہندوستان کے سب سے بڑے

معرکۂ دین و وطن

دار العلوم، دیوبند، کے شیخ الحدیث کی طرف سے اس قسم کا اعلان، کوئی ایسا حادثہ نہیں تھا جسے آسانی سے برداشت کیا جا سکتا. علامہ اقبالؒ اس زمانے میں، یوں کہیئے کہ مرض الموت میں مبتلا تھے. جب انہوں نے اس نعرۂ جاہلیہ کو سُنا تو ان کے دلِ صدچاک سے ایک آہ اُبھری جو ان الفاظ کی شکل میں فضا کو چیرتی ہوئی آں سوئے افلاک تک جا پہنچی کہ :-

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمد این چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باُو نرسیدی تمام بولہبی است

ان اشعار میں "مصطفیٰ برساں خویش را" کے الفاظ گہرے غور و فکر کے متقاضی اور ایک عظیم حقیقت کے عکاس ہیں. دین خدا کی طرف سے ملتا ہے لیکن اُمت کی تشکیل اس رسول کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جو اس دین کو انسانوں تک پہنچاتا اور اس کے مطابق ایک معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے. اسی نسبت سے، اسلام کے پیرو، امتِ محمدیہ کہلاتے ہیں. اگر قومیت کی اساس وطن یا نسل قرار پا جائے تو رسول سے نسبت ختم ہو جاتی ہے اور جب رسول سے نسبت منقطع ہو جائے تو پھر اسلام بھی باقی نہیں رہتا. جیسا کہ میں شروع میں کہہ چکا ہوں، اس حقیقت پر قرآن کی وہ آیۂ جلیلہ شاہد ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ وَ کَانُوۡا شِیَعًا لَّسۡتَ مِنۡہُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ ؕ (۶/۱۵۹) جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور اس طرح الگ الگ گروہ، پارٹیاں قومیں بن جائیں، اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں. یعنی اگر قومیت کی اساس، رسول اللہؐ کی طرف نسبت کے بجائے کوئی اور قرار دے لی جائے تو ایسے لوگوں کا رسول سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے. اسی بنا پر، علامہ اقبالؒ نے کہا کہ وطن کو قومیت کی اساس قرار دینے سے، رسول اللہ سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے. اگر تم مسلمان رہنا چاہتے ہو تو اپنی قومیت کی نسبت، وطن کے بجائے حضور نبی اکرمؐ کی طرف کرو ـــ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ـــ اگر باُو نرسیدی ـــ اگر تم نے اپنی نسبت حضورؐ کی طرف نہ کی تو ـــ تمام بولہبی است ـــ پھر دین باقی نہیں رہتا. بولہبی رہ جاتی ہے جس میں قومیت کی نسبت وطن یا نسل کی طرف جاتی ہے.

علامہ اقبالؒ کی یہ تنبیہہ اس قدر واضح تھی کہ اس کے بعد مولانا مدنی اور ان کے ساتھ دیگر نیشنلسٹ علماء کو نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہیئے تھا بلکہ نیشنلزم کا مسلک بھی ترک کر دینا چاہیئے تھا۔ لیکن اس کے بجائے، مولانا مدنی نے اپنے دعوے کی مدافعت میں لمبا چوڑا بیان داغ دیا۔ اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے وہ بیان شائع کیا جو "معرکۂ دین و وطن" کے نام سے مشہور ہے اور جو اسلامی قومیت کے مسئلہ پر ناقابل تردید حقائق کی تابندہ دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ مرور زمانہ سے یہ دستاویز (بالعموم) نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے اور پاکستان میں وطنیت کی تحریک پھر سے باندازِ نو ابھاری جا رہی ہے اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کے اہم حصے سامعین کے گوش گذار کر دیئے جائیں۔ ان حقائق کی اہمیت کے پیشِ نظر ان اقتباسات کی طوالت کے لئے مجھے معذرت خواہ ہونے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ علامہ اقبالؒ نے سب سے پہلے یہ کہا کہ:

> مولانا حسین احمد صاحب سے بہتر اس بات کو کون جانتا ہے کہ اسلام، ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو، نامعقول و مردود ہے۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا:-

> کون نہیں جانتا کہ حضرت ابراہیمؑ سب سے پہلے پیغمبر تھے[1] جن کی وحی میں قوموں، نسلوں اور وطنوں کو بالائے طاق رکھا گیا۔ نوعِ آدم کی صرف ایک تقسیم کی گئی۔ یعنی موحد اور مشرک۔ اس وقت سے صرف دو ہی ملتیں دنیا میں ہیں تیسری کوئی ملت نہیں۔ کعبۃ اللہ کے محافظ آج دعوتِ ابراہیمی اور دعوتِ اسماعیلی سے غافل ہو گئے۔ قوم اور

---

[1] "سب سے پہلے پیغمبر" صرف اس اعتبار سے کہ آپ نے تعمیر کعبہ سے امتِ مسلمہ کے لئے ایک محسوس مرکز کی بنا رکھی؛ ورنہ دو قومیتوں کی بنیاد تو خدا کی طرف سے اولین وحی نے رکھ دی تھی جو حضرت ابراہیمؑ سے بہت پہلے کی بات ہے۔

قومیت کی ردا اوڑھنے والوں کو اس ملت کے بانیوں کی وہ دعا یاد نہ آئی جو اللہ کے گھر کی بنیاد رکھتے وقت ان دونوں پیغمبروں نے کی تھی۔ وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ص (۱۲۷- ۱۲۸/ ۲) کیا خدا کی بارگاہ سے امتِ مسلمہ کا نام رکھوانے کے بعد بھی یہ گنجائش تھی کہ آپ کی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی حصہ کسی عربی، ایرانی، افغانی، انگریزی، مصری یا ہندی قومیت میں جذب ہو سکتا۔ امتِ مسلمہ کے مقابل میں تو صرف ایک ہی ملت ہے اور وہ الکفر ملّة واحدة کی ہے۔

اس اصولی حقیقت کی وضاحت کے بعد کہا۔

اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابلِ قدر تھا تو رسولؐ اللہ کے بعض اقارب ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپؐ سے پرخاش کیوں ہوئی۔ کیوں نہ رسولؐ اللہ نے اسلام کو محض ایک ہمہ گیر ملت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت، ابوجہل اور ابولہب کو اپنا لئے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے۔ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیتِ وطنی قائم رکھی ..... محمدؐ (فداہ ابی و امی) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے ایک قوم تھی اور آزاد تھی۔ لیکن جب محمدؐ کی امت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسولؐ اللہ کی متابعت میں آ گئے وہ خواہ اِن کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے، وہ سب امتِ مسلمہ یا ملتِ محمدیہؐ بن گئے۔ پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے۔ اب "ملک و نسب" ان کا گرفتار ہو گیا۔

کسے کو پنجہ زد ملک و نسب را نہ داند نکتۂ دینِ عرب را
اگر قوم از وطن بودے محمدؐ نہ دادے دعوتِ دیں بولہب را

حضورؐ رسالتمآبؐ کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ بولہب یا ابوجہل یا کفارِ مکہ

سے یہ فرماتے کہ تم اپنی بُت پرستی پر قائم رہو، ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جا سکتی ہے. لیکن اگر حضورؐ (نعوذ باللہ) یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی، نبیؐ آخر الزمانؐ کی راہ نہ ہوتی.

آپ نے غور فرمایا برادرانِ گرامی قدر! علامہ اقبالؒ نے اپنے اس بیان میں اسلامی نظریۂ قومیت کو کس طرح اُبھار اور نکھار کر بیان کر دیا ہے. لیکن ابھی اس نظریہ کا ایک رُخ باقی ہے. جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، دین تو خدا کی طرف سے ملتا ہے لیکن امت کی تشکیل اس نبی کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جس کی وساطت سے وہ دین ہم تک پہنچتا ہے. میں اس حقیقت کو اس سے پہلے بھی متعدد بار واضح کر چکا ہوں لیکن موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے آج پھر دہرا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ امت کی یہ تشکیل اس رسول کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جسے سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی تسلیم کیا جائے. مثلاً ایک عیسائی حضرت عیسیٰؑ اور ان سے پہلے کے جملہ انبیائے بنی اسرائیل پر ایمان رکھتا ہے. لیکن چونکہ وہ حضرت عیسیٰؑ کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھتا ہے. یعنی نبوت کو حضرت عیسیٰؑ کی ذات پر ختم قرار دیتا ہے، اس لئے وہ امتِ حضرت عیسیٰؑ کا فرد (یا عیسائی) کہلاتا ہے لیکن جونہی وہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ایک اور نبی (یعنی محمدؐ رسول اللہ) پر ایمان لے آتا ہے، وہ امتِ عیسوی سے کٹ کر ایک نئی امت یعنی امتِ محمدیہؐ کا فرد بن جاتا ہے. اسی اصول کی رو سے، اگر کوئی شخص محمدؐ رسول اللہ کے بعد کسی اور نبی پر ایمان لے آتا ہے تو وہ امتِ محمدیہؐ سے کٹ کر ایک نئی امت کا فرد قرار پا جاتا ہے. علامہ اقبالؒ نے اپنے بیان میں اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ جس طرح رسولؐ اللہ کے بعد کسی کو نبی تسلیم کرنے والے کا رشتہ امتِ محمدیہؐ سے کٹ جاتا ہے اسی طرح نسل یا وطن کو قومیت کی اساس قرار دینے سے بھی امتِ محمدیہؐ کے ساتھ رشتہ باقی نہیں رہتا. انہوں نے کہا کہ:-

حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریۂ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں انکارِ خاتمیت''

> کا نظریہ وطنیت کے حامی بالفاظِ دیگر یہ کہتے ہیں کہ امتِ مسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ وقت کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی اس حیثیت کے علاوہ جس کو قانونِ الٰہی ابدالآباد تک متعین و متشکل کر چکا ہے کوئی اور حیثیت بھی اختیار کر لے۔ جس طرح قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوتِ محمدیہ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار ہے۔ بعینہٖ اسی طرح وطنیت کا نظریہ بھی امتِ مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کامل ہونے سے انکار کی راہ کھولتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ علامہ اقبالؒ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ وطن یا نسل کی بنیادوں پر قومیت کا تصور، ذاتِ رسالتمآبؐ سے اپنا رشتہ منقطع کر کے، ایک جدید امت یا نئے دین کو وجود میں لانے کے مرادف بن جاتا ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے اپنے اس بیان میں متنبہ کیا تھا کہ

> اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن، بہ حیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں بروقت مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اوّل تو لادینی ہوگی اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے لاپرواہی۔

آنے والا مؤرخ جب اس دور کی تاریخ پر نگاہ ڈالے گا تو وہ یہ دیکھ کر یقیناً محوِ حیرت رہ جائے گا کہ علامہ اقبالؒ نے جو کہا تھا کہ وطنیت کی اساس پر قومیت کا تصور، اسلام کی اصولی تعلیم کے خلاف ہے تو اس حقیقت کو نہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث، مولانا حسین احمد مدنی سمجھے اور نہ ہی دیگر نیشنلسٹ علماء (جن میں مولانا ابوالکلام آزاد، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید اور علمائے مجلس احرار جیسے نامور مذہبی رہنما سب شامل تھے) لیکن اسے سمجھا تو ہندو راہنماؤں نے سمجھا۔ چنانچہ

ہندو لیڈروں کا اعتراف

جس زمانہ میں متحدہ قومیت کا مسئلہ بحث و نزاع کا مرکز بن رہا تھا، لالہ لاجپت رائے نے (جو اسی لاہور کے رہنے والے بڑے متشدد ہندو تھے) مسٹر سی۔ آر۔ داس کو ایک خط میں لکھا (جو اخبار مرہٹہ کی ۲ / فروری ۱۹۴۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا) کہ:-

ایک اور چیز جو کچھ عرصہ سے میرے لئے بے حد وجہ اضطراب ہو رہی ہے' ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اس پر دعوتِ غور و فکر دوں۔ گذشتہ چھ ماہ میں نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ اسلامی تاریخ اور اسلامی قوانین کے مطالعہ میں صرف کیا ہے اور اس سے جس نتیجہ پر میں پہنچا ہوں' وہ یہ ہے کہ یہ چیز (یعنی ہندو مسلم اتحاد) ایک امرِ محال اور نا قابلِ عمل شے ہے...... میں تہ دل سے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کا قائل ہوں، اس کے لئے میں مسلمان راہنماؤں پر اعتماد کرنے کو بھی تیار ہوں۔ لیکن قرآن و حدیث کے احکام کو ہم کیا کریں گے؟ مسلمان راہنما ان پر تو خطِ تنسیخ نہیں کھینچ سکتے۔

لیکن مسلمانوں کے مذہبی راہ نماؤں نے سینہ تان کر کہا کہ قرآن و حدیث کے احکام پر خطِ تنسیخ کیوں نہیں کھینچا جا سکتا؟ ہم ہزار برس سے یہی کچھ کرتے چلے آئے ہیں' اب بھی یہی کریں گے۔

لالہ لاجپت رائے کے اسی خیال کی تائید میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے رکن' مسٹر این. سی. دت نے اپنی کھلی چٹھی میں (جو اخبار مدینہ کی یکم فروری ۱۹۴۰ئہ کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی) لکھا کہ

ان حالات میں میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم قضیہ کا حل یہی ہو گا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ لیا جائے اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے متعلق ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے۔

بہر حال' میں یہ کہہ رہا تھا کہ علامہ اقبالؒ اپنی زندگی کے آخری سانس تک' مسئلہ قومیت کی' اسلامی نقطۂ نگاہ سے' وضاحت کرتے رہے اور اسی کی بنیاد پر انہوں نے مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا تصور پیش کیا۔ وہ ملّتِ اسلامیہ کو یہ پیغام دیتے دیتے عالمِ جاوداں کی طرف سدھار گئے اور اس شمع کو ایسے ہاتھوں میں دے گئے جن کی امانت و دیانت پر انہیں پورا پورا اعتماد تھا۔ یہ ہاتھ تھے' اللہ کے بندے' محمد علی جناحؒ کے جنہیں ملّتِ اسلامیہ نے قائد اعظمؒ کے برجستہ' موزوں ترین اور ان کے شایانِ شان لقب سے پکارا۔ رحمہما اللہ تعالیٰ!

میں نے شروع میں کہا ہے کہ اقبالؒ' ہندوستان سے گیا تو "میرا وطن' میرا وطن" کہتے ہوئے

اور انگلستان سے واپس آیا تو اس نظریۂ وطنیت کو انسانیت اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن اور ابلیس کی اختراع قرار دیتے ہوئے۔ اقبالؒ کی زندگی میں یہ انقلاب بڑا تحیر انگیز ہے۔ لیکن اس سے کہیں

جناحؒ کی زندگی کا عظیم انقلاب

زیادہ حیرت افزا اور تعجب انگیز ہے وہ انقلاب جو محمد علی جناحؒ کی زندگی میں رونما ہوا۔ وہ نہ صرف یہ کہ عقیدۂ وطنیت پر نظری طور پر اعتقاد رکھتے تھے۔ بلکہ عملاً بھی ان کا شمار کانگریس کے بلند ترین رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ بمبئی کا "جناح کانگرس ہال" آج بھی ان کے عقیدۂ وطنیت کی یاد تازہ کراتا ہے۔ حیرت ہے کہ اقبالؒ کی نگہ دور رس نے کیسے بھانپ لیا کہ مسلمانوں کے لئے دو قومی نظریہ کی بنا پر ایک جداگانہ مملکت کا حصول اس شخص کے ہاتھوں ممکن ہوگا جو اس قدر کٹر وطن پرست اور صفِ اوّل کا کانگرسی تھا۔ اسے کہتے ہیں دیدہ وری اور مومنانہ فراست! قائداعظمؒ کے سوانح حیات کا مرتب ہکٹر بولیتھو (HECTOR BOLITHO) اس حقیقت کی پردہ کشائی کرتا ہے کہ "اپنے قیام انگلستان کے دوران، مسٹر جناحؒ نے اقبالؒ سے کئی ملاقاتیں کیں۔ وہ نہایت اچھے دوست تھے لیکن اس کے باوجود جناحؒ نے اقبالؒ کے دلائل کو فوری طور پر تسلیم نہ کیا۔ اس میں قریب دس سال کا عرصہ لگ گیا۔" (ص ۹۹)۔ معلوم نہیں، اقبالؒ نے کس کس طریق سے جناحؒ کو (CONVERT) کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ ان کی کوششیں جلد نتیجہ خیز نہ ہوئیں۔ لیکن انہوں نے دامنِ امید کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں جناحؒ کی ذات پر کس قدر بھروسہ اور اپنی مساعی کے بار آور ہونے پر کس قدر یقینِ محکم تھا۔ برسوں کی کوششوں کے بعد، انہوں نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو جناحؒ کو وہ خط لکھا جو ان کے ترکش کا آخری تیر تھا۔ وہ تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھا۔ اس خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ

> میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف انسان ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا آپ پر گراں نہیں گزرتا ہوگا۔ (میرے اس اصرار و تکرار کی وجہ یہ ہے) کہ میری نگاہوں میں اس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں

لے اس سے غالباً یہ مراد ہے کہ اقبالؒ نے مسلمانوں کی الگ مملکت کا جو تصور ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا اسے قائداعظمؒ نے ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان کی شکل میں متعین کر دیا۔

جس کے ساتھ ملّتِ اسلامیہ کو اپنی یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس
طوفان میں جو یہاں آنے والا ہے، اس کی کشتی کو ثابت و سالم، بہ امن و عافیت،
ساحلِ مراد تک لے جائیں گے۔ (ص ۱۱۵)

یہ تیر، اقبالؒ کے قلب سے نکلا اور سیدھا جناحؒ کے دل میں پیر گیا۔ اور پھر اقبالؒ اپنے پیغام کی شمع جناحؒ کے ہاتھوں میں دے کر نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ یہ کہتا ہوا دنیا سے رخصت ہو گیا کہ

پس از من شعرِ من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

میرے نزدیک، نیشنلسٹ جناحؒ میں یہ نظری تغیّر پیدا کرنا، اقبالؒ کا اتنا بڑا احسان ہے جس سے ملّتِ اسلامیہ کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

قائدِاعظمؒ نے اس جنگ کو دس سال تک جاری رکھا اور بالآخر نہ صرف ہندوؤں سے بلکہ ساری دنیا سے اس حقیقت کو منوالیا کہ مسلمان، دین کے اشتراک کی بنا پر ایک جداگانہ قوم ہیں اور ایک الگ آزاد مملکت کے مستحق۔ چونکہ آج کی نشست میں میرا موضوع علامہ اقبالؒ اور دو قومی نظریہ ہے۔ اس لئے میں اس وقت اس جنگ کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا جو قائدِاعظمؒ نے دس سال تک لڑی۔ اس کی تفاصیل میں گذشتہ پچیس سال سے بیان کرتا چلا آرہا ہوں اور آئندہ بھی بتوفیقِ ایزدی مناسب مواقع پر بیان کرتا رہوں گا کہ یہ جنگ درحقیقت دین و وطن کی آویزش اور کفر و اسلام کا معرکہ تھا جسے بیان کرنا میری زندگی کا مشن ہے۔

قائدِاعظمؒ نے دس سال تک یہ جنگ لڑی اور بالآخر پاکستان وجود میں آگیا۔ یہاں سے پھر ایک ایسی داستان کا آغاز ہوتا ہے جو سابقہ داستان سے بھی زیادہ حیرت افروز، عبرت انگیز اور اس کے ساتھ ہی جگر سوز اور دلدوز ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، دو قومی نظریہ کی دو شقیں تھیں۔ ایک یہ کہ غیر مسلم اور مسلم مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے اور دوسری شق یہ کہ تمام مسلمان، دین کے اشتراک کی بنا پر امّتِ واحدہ (ایک قوم) ہیں۔ نسل، وطن، زبان، ثقافت وغیرہ کے اختلاف سے یہ مختلف قومیتوں اور گروہوں میں نہیں بٹ سکتے۔ قائدِاعظمؒ کی وفات ۱۹۴۸ء میں ہو گئی اور اس کے بعد جب مملکتِ پاکستان کے لئے آئین

مرتب کرنے کا مرحلہ پیش آیا تو دنیا یہ دیکھ کر محوِ حیرت رہ گئی کہ اس میں پہلی شق کو مسترد کر دیا گیا ہے۔ یعنی پاکستان کی حدود میں بسنے والے تمام باشندوں۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں۔ کو ایک قوم قرار

حصولِ پاکستان کے بعد

دے دیا گیا ہے۔ یہ چیز نہ صرف یہ کہ اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف تھی، بلکہ اس دعوے کے بھی خلاف جس کی بنا پر ہم نے ایک الگ مملکت حاصل کی تھی۔ اس سے ہم نے وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دے دیا اور اس طرح پاکستان کی وجہ جواز کی خود ہی نفی کر دی۔ یہاں پچیس سال سے آئین سازی کی مہم جاری ہے مسلسل مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ مطالبہ کرنے والوں میں سے آجتک کسی نے یہ نہیں کہا کہ وطنیت کی بنیاد پر تشکیلِ قومیت، اسلام کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتی ہے۔ یہ اس لئے کہ ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت بالعموم ان علماء (یا ان کے شاگردوں) پر مشتمل ہے جنہوں نے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ یہ لوگ، وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دے کر نہ صرف یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تحریکِ پاکستان کے دوران ان کا (یا ان کے اساتذہ کا) مؤقف صحیح تھا بلکہ حصولِ پاکستان سے انہیں جو شکستِ پندار ہوئی تھی اس کا انتقام بھی لینا چاہتے ہیں۔ پاکستان میں متحدہ قومیت کی تشکیل سے سب سے زیادہ نقصان مشرقی پاکستان میں ہوا۔ ایک تو اس لئے کہ وہاں غیر مسلموں (ہندوؤں) کی آبادی کثیر تھی اور دوسرے اس لئے کہ وہاں غیر مسلم بڑی مؤثر حیثیت رکھتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ وہاں کی اقتصادیات اور سیاست ان کے ہاتھ میں تھی، مسلمان بچوں کی تعلیم کے نگران بھی وہی تھے۔ تعلیم کی بات چلی ہے تو اس سے ایک اہم نکتہ سامنے آگیا۔ وطن یا نسل کو بنائے قومیت قرار دینے سے، قوم کی تشکیل کے لئے کسی قسم کی جدّوجہد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر بچہ پیدائشی طور پر اس قوم کا فرد ہوتا ہے لیکن کسی نظریہ کی بنا پر قوم کی تشکیل کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ قوم کے بچوں کو اس نظریہ کی تعلیم دی جائے۔ ہم نے نہ صرف یہ کہ تعلیم کے اس اہم مقصد سے اغماض برتا بلکہ اپنی نژادِ نَو کی تعلیم ان لوگوں کے ہاتھ میں دیدی جو اس نظریہ کے مخالف تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری نئی نسل وہ ذہنیت لے کر ابھری جس کی ترجمانی ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایک طالب علم، عزیز الرحمٰن نے اپنے اس خط میں کی تھی جو ۱۹۶۹ء میں وہاں کے اخبار آنت میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے کہا تھا کہ ہم سے جو کہا جاتا رہا کہ مسلمان، مذہب کی بنا پر ہندوؤں سے الگ قوم ہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ:-

> ہم شری چیتنا، خودی رام، سبھاش بوس، بیجائے سنگھ جیسے اپنے قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے اور ان کی جگہ خالدؓ، طارقؒ، موسیٰ اور علیؓ جیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے لگ گئے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدا ۔۔ یعنی اللہ ۔۔ کو اپنا معبود تصور کر لیا۔ ہم اپنے بچوں کے نام اپنی زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں رکھنے میں خوشی محسوس کرنے لگے۔ ہم نور اللہ اور خلیل اللہ جیسے ناموں پر ریجھ گئے اور ناگنی، کھاگنی جیسے سیدھے سادے ناموں کو تیاگ دیا۔

اس کے بعد اس نے لکھا تھا کہ

> اب ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا ہے اس سے اسلامی قومیت کے بند ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔ مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں انہوں نے بھی یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد ہیں اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ہم تحقیقاتی کمیشن بٹھا رہے ہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اس حصہ پاکستان کی علیحدگی کے اسباب کیا تھے۔ کوئی اس کی وجہ اقتصادی استحصال قرار دیتا ہے کوئی سیاسی غلطیاں۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ لیکن کسی کی نگاہ اس حقیقت تک نہیں پہنچتی کہ اس کا بنیادی سبب ہمارا یہ غلط اقدام اور غلط تعلیم ہے جس کی رُو سے ہم نے وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دے لیا ہے۔ جب آپ وطن کو معیارِ قومیت قرار دے لیں گے تو جس علاقے کے لوگ چاہیں گے اپنے علاقہ کو اپنا وطن قرار دے کر اپنے آپ کو جداگانہ قوم قرار دے لیں گے اور جب وہ ایک الگ قوم بن جائیں گے تو اس کے بعد ان کی جداگانہ مملکت کا دعویٰ اور مطالبہ جائز قرار پا جائے گا۔ ہم مشرقی پاکستان کی

مغربی پاکستان میں وطنیت کا تصور

علیحدگی کو رو رہے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ مغربی پاکستان بھی اسی راستے پر چلا جا رہا ہے جس پر مشرقی پاکستان چل رہا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۹۶۸ء میں کراچی کی "عوامی ادبی انجمن"

کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا تھا جس میں منجملہ دیگر "دانشورانِ قوم" جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کے دستخط ثبت تھے۔ اس پمفلٹ میں کہا گیا تھا:

> ہمارے نزدیک، جمہوری آزادی میں قوموں کی ترقی کا مسئلہ بھی شامل ہے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں، جو مختلف قوموں کا وطن ہے، وہ حالات پیدا کئے جائیں کہ سب قومیں ان کی زبانیں اور تہذیبیں کسی ایک قوم کے اثر و تسلط سے آزاد ہو کر خود مختارانہ ترقی کر سکیں..... ہمارے نزدیک پاکستان کی تمام قومیں مساوی حقوق کی مالک ہیں۔

یہ پہلی چنگاری تھی جو مغربی پاکستان کے نیستانِ ملّت میں پھینکی گئی۔ اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے یہ آگ اس تیزی سے بھڑکی کہ اب اس حصۂ پاکستان کا بھی کوئی گوشہ اس کی زد سے محفوظ نہیں رہا چونکہ جداگانہ قوموں کے لفظ سے یہاں کے عوام بدکتے تھے اس لئے محض بغرض تلبیس "قوموں" کی جگہ "قومیتوں" کی اصطلاح وضع اور اختیار کی گئی ہے۔ یہ محض لفظی فریب ہے ورنہ قومیت سے درحقیقت ان کی مراد قوم ہی ہے۔ مغربی پاکستان میں وطن سے مراد صوبہ لیا جا رہا ہے اور چونکہ یہاں چار صوبے ہیں

عام پراپیگنڈا

اس لئے چار قومیتوں کا تصور عام کیا جا رہا ہے۔ قوم ہو یا قومیتیں اور پانچ ہوں یا چار مقصد اسلامی معیارِ قومیت کے بجائے وطنی معیارِ قومیت کا نظریہ عام کرنا اور اس طرح مغربی پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے، بالآخر اس کے جداگانہ وجود کو ختم کرنا ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد (ہندوستان کی وزیر اعظم) مسز اندرا گاندھی نے اپنی فتح کا جشن مناتے ہوئے کہا تھا کہ

> یہ کامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہماری حکومت کی کامیابی۔ یہ کامیابی ہے حق پر مبنی نظریہ کی، اس نظریہ پر جو باطل پر مبنی تھا اور جس پر مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی بنیاد رکھی تھی۔

اس نے اُدھر یہ کہا اور اِدھر سرحد کے رہنما خان عبدالولی صاحب نے اعلان فرمایا کہ

> دو قومی نظریہ ختم ہو چکا ہے۔ اسلام کی باتیں ڈیڑھ ہزار سال پرانی اور فرسودہ ہیں پچیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریہ پاکستان غلط تھا۔

(نوائے وقت، ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

بیٹے نے یہ کہا اور ان کے والد بزرگوار (خان عبد الغفار خان) نے ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے، مسٹر دلیپ کمار مکرجی کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ

> چند سال پہلے کا پاکستان اب مر چکا ہے۔ مغربی پاکستان میں چار قومیتوں کے درمیان رشتہ کے لئے اسلام کافی نہیں رہے گا۔ اس کے لئے سیکولر بنیادوں پر رشتے کی تعمیر کرنی ہوگی۔

انہوں نے یہ بات آج نہیں کہی۔ وہ پہلے دن سے نیشنلسٹ ہیں اور ہندوؤں سے بھی زیادہ متشدد نیشنلسٹ۔ وہ اپنے اس عقیدہ کا برابر پرچار کرتے رہتے ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں جب وہ کابل سے بھارت گئے ہیں تو انہوں نے وہاں کہا تھا کہ

> میں نے دو قومی نظریہ کبھی تسلیم نہیں کیا۔ نہ ہی میں کبھی ایسا کروں گا۔ مذہب قومیت کا معیار کس طرح ہو سکتا ہے؟ میں افغانستان کے باشندوں کو بھی کہتا رہا ہوں اور دوسرے لوگوں کو بھی کہ اسلام دنیا میں انسان کے بعد آیا ہے جب اسلام یا کوئی اور مذہب دنیا میں نہیں آیا تھا اس وقت بھی تو یہاں انسان بستے تھے۔ ان کی کوئی نہ کوئی قومیت تو تھی ہی۔ لہذا میں اسے کس طرح تسلیم کرلوں کہ قومیت کا معیار مذہب ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اکثر مشکلات کا سبب یہ ہے کہ ہم مذہب کو قومیت کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔

(اسٹیٹسمین، ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۹ء بحوالہ پاکستان ٹائمز ۱۹ [۳])

چار قومیتوں کا نظریہ نیشنل عوامی پارٹی کے منشور میں داخل ہے اور اس کے راہنما اٹھتے بیٹھتے اس کا پرچار کرتے رہتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں (گذشتہ مارچ) میں مسٹر غوث بخش بزنجو نے، مرکزی اسمبلی کے ایوان میں اس نظریہ کو دہرایا تھا۔ یہ آواز، اب نیشنل عوامی پارٹی یا اس کے ہمنواؤں تک محدود نہیں رہی، ہماری نئی نسل کے ہر نوجوان کے لب پر عام ہو رہی ہے جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے پاکستان میں مذہبی پیشوائیت کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جنہوں نے خود (یا ان کے اساتذہ اور مقتداؤں نے) تحریکِ پاکستان کے دوران، دو قومی نظریہ کی مخالفت کی تھی۔ اس لئے جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہاں نظریۂ وطنیت عام ہو رہا ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں کہ آخر الامر جیت انہی کی ہوئی۔ جماعتِ اسلامی

کا دعویٰ ہے کہ دو قومی نظریہ کے سب سے پہلے داعی ان کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے لیکن مودودی صاحب کی کیفیت یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ انہوں نے کبھی اس کا مطالبہ نہیں کیا کہ یہاں دو قومی نظریہ کو عملی شکل دی جائے بلکہ انہوں نے ۱۹۶۳ء میں انتخابات کے سلسلہ میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ

> اگر کنونشن مسلم لیگ کسی فرشتے کو بھی امیدوار کھڑا کرے گی تو جماعت اسلامی اس کی حمایت نہیں کرے گی. کیونکہ ہمیں اس کے اصولوں سے اتفاق نہیں اس کے برعکس اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اُسے میری تائید حاصل ہوگی. اس لئے کہ اس نے یہ اصول تو تسلیم کر لیا کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریئے کے مطابق ہونا چاہیئے۔ (امروز ۶۳/۶/۲۰)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مغربی پاکستان کے مختلف حصّوں میں بسنے والے لوگوں کا کلچر مختلف ہے اس لئے ان کی قومیتیں مختلف ہیں. کلچر کا لفظ ایسا ہے جو آج تک شرمندۂ معنی نہیں ہوا. کلچر کے مدعیوں سے پوچھئے کہ اس کا مفہوم کیا ہے. آپ دیکھیں گے کہ وہ اس کے جواب میں متعین طور پر کچھ نہیں بتا سکیں گے. بات سمٹ سمٹا کر خوراک، لباس، تراش خراش، وضع قطع، طرزِ بود و باند یا فنونِ لطیفہ پر آ جائے گی. ان "دانش وروں" کو کون بتائے کہ جو اسلام، وطن، نسل یا زبان کے اختلاف کو بھی جداگانہ قومیت کا معیار قرار نہیں دیتا کیا وہ وضع قطع، تراش خراش یا شعر و نغمہ کے اختلاف کو معیارِ قومیت تسلیم کر لے گا؟ قرآنِ کریم، اختلافِ رنگ اور زبان (الوان والسنہ) کو بیشک تسلیم کرتا ہے لیکن وہ انہیں معیارِ قومیت قرار نہیں دیتا. اس نے جو اُمّتِ واحدہ متشکل کی تھی اس میں عرب، ایران، شام، عراق، روم، مصر، شمالی افریقہ، حبش وغیرہ کے باشندے سب شامل تھے جن میں اسلام لانے سے پہلے کوئی چیز بھی مشترک نہیں تھی اسلام نے ایمان کو قدرِ مشترک قرار دیا تو ان اختلافات کے باوجود وہ سب ایک اُمّت کے افراد بن گئے حالانکہ اس وقت بھی ان کا طرزِ بود و باند (بقول ان حضرات کے، ان کا کلچر) الگ الگ تھا. اسلام طرزِ بود و باند کو نہ چنداں اہمیت دیتا ہے، نہ ہی اس سے تعرض کرتا ہے. مختلف ملکوں کے مسلمان اپنا طرزِ بود و باند الگ الگ رکھ سکتے ہیں لیکن اس اختلاف سے وہ الگ الگ قومیتوں میں نہیں بٹ جاتے. اگر کلچر نامی کوئی شے ہے تو وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا ایک ہے. اس سے مراد اندازِ بود و باند نہیں بلکہ وہ ذہنیت اور نفسیاتی کیفیت مراد ہے جو مستقل اقدار پر ایمان لانے سے پیدا ہوتی ہے. اس

ذہنیت کے مظاہر اور ان اقدار کو بروئے کار لانے کے طریق الگ الگ ہو سکتے ہیں، لیکن اس کا ان کے ملّتِ واحدہ ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

لیکن ہمارے ان دانش وروں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ یہ غیر ملکی سیاحوں کو "پاکستانی کلچر" دکھانے کے لئے موہنجوڈاڑو لے جاتے ہیں اور اتنا بھی نہیں سوچتے کہ جو کلچر وہاں کے کھنڈرات میں مدفون ہے وہ پاکستان کے وجود میں آنے سے ہزاروں سال پہلے کا ہے۔ نیز یہ بھی محض اتفاق ہے کہ وہ علاقہ تقسیمِ ہند کے وقت حدودِ پاکستان میں شامل ہوگیا۔ اگر تقسیم کی لکیر ذرا ادھر کھینچ جاتی تو وہ بھارتی کلچر کا مظہر قرار پا جاتا۔[1]

دو قومی نظریہ کے مدّعی

یہ تو ان لوگوں کی کیفیت ہے جو دو قومی نظریہ کی مخالفت کرتے ہیں لیکن جو اس نظریہ کی تائید اور مدافعت کرتے ہیں، بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو وہ بھی اس نظریے کے بنیادی اصول کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ محض اپنے سیاسی حریفوں کی مخالفت کے لئے ایسا کہہ دیتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ دو قومی نظریہ کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اسلام میں معیارِ قومیت وطن کا اشتراک نہیں، دین کا اشتراک ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک وطن میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم قرار نہیں پا سکتے۔ چار قومیتوں کے مدّعی وطن کو معیارِ قومیت قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مختلف صوبے مختلف وطن ہیں اس لئے ہر صوبے کے باشندے، بلا امتیازِ مذہب، الگ قوم ہیں۔ دو قومی نظریہ کے مدّعی کہتے ہیں کہ پاکستان (یا اب مغربی پاکستان) ایک وطن ہے اور اس میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم ہیں۔ فرمائیے کہ اصل کے اعتبار سے ان دونوں گروہوں میں فرق کیا ہے۔ وطن کو بطور معیارِ قومیت دونوں تسلیم کرتے ہیں۔ فرق صرف وطن کی حدود میں ہے۔ ایک گروہ صوبوں کی حدود کو وطن قرار دیتا ہے۔ دوسرا گروہ پورے مغربی پاکستان کو وطن کہتا ہے۔ اسلام کو معیارِ قومیت نہ یہ تسلیم کرتے ہیں نہ وہ۔ یاد رکھئے کہ جب تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا جاتا کہ مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد نہیں ہو سکتے خواہ وہ ایک وطن ہی میں کیوں نہ رہتے ہوں، اس وقت تک دو قومی نظریہ کا دعوےٰ حقیقت نہیں بن سکتا۔ دو قومی نظریہ کے حامیوں

---

[1] سندھ کا ایک خطّہ جہاں سے ہزاروں سال پہلے کے آثارِ قدیمہ برآمد ہوتے ہیں۔

سے آپ پوچھئے کہ آپ جن دو قوموں کے مدعی ہیں، فرمائیے کہ پاکستان میں وہ قومیں کون کون سی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔

کہا جائے گا کہ مغربی پاکستان میں غیر مسلموں کی تعداد بہت کم ہے اس لئے ان کا یہاں کے مسلمانوں کا ہم قوم قرار پا جانا ہماری سیاست کو متاثر نہیں کر سکتا۔ لیکن سوال سیاست کا نہیں، دین کے اصول کا ہے۔ غیر مسلم خواہ ایک ہی کیوں نہ ہو، اگر اسے اور مسلمانوں کو ایک قوم تسلیم کر لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے ایمان کے اشتراک کو نہیں بلکہ وطن کے اشتراک کو معیارِ قومیت تسلیم کر لیا۔ یہاں کے غیر مسلموں اور مسلموں کو ایک قوم قرار دے دینا، اس متحدہ قومیت کو وجود میں لے آنا ہے جس کی ہم نے تحریکِ پاکستان کے دوران اس شدت سے مخالفت کی اور جو اسلام کے نظریۂ قومیت کی حریف ہے۔ لہٰذا جب تک یہاں غیر مسلموں کو آئینی طور پر مسلمانوں سے الگ قوم قرار نہیں دیا جاتا، دو قومی نظریہ کا دعویٰ کوئی معنی نہیں رکھ سکتا۔

مسٹر نرادسی چوہدری کا اعتراف

میں نے پہلے کہا ہے کہ جس زمانے میں، غیر منقسم ہندوستان میں، ہمارے "علماء کرام" کی طرف سے دو قومی نظریہ کی مخالفت کی جا رہی تھی، ہندو راہنما مثل لالہ لاجپت رائے اور این۔ سی۔ دت یہ کہہ رہے تھے کہ متحدہ قومیت کا تصور، قرآن اور حدیث کے خلاف ہے۔ یہ چیز اُس زمانے تک محدود نہیں رہی۔ آج جبکہ پاکستان میں دو قومی نظریہ کی اس قدر (بالواسطہ یا بلاواسطہ) مخالفت ہو رہی ہے، ہندوستان میں ایسے ہندو موجود ہیں جو وہاں اس نظریہ کی تائید کر رہے ہیں۔ مسٹر نراد۔ سی چوہدری، وہاں کا بین الاقوامی شہرت کا حامل قلمکار ہے۔ اس نے ہندوستان میں، ہندو مسلم فسادات کی بڑھتی ہوئی لہر سے متاثر ہو کر ۱۹۶۸ء میں ایک مقالہ شائع کیا تھا جس نے وہاں کی فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ اس میں اس نے کہا تھا کہ

> میں یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب دوبارہ کھل کر، پورے شد و مد سے مجھے یہ کہہ لینے دیجئے کہ جب تک ہندوستان کی حکومت اور ہندوستان کے ہندو یہ رٹ لگاتے رہیں گے کہ یہاں کے مسلمان ایک متحدہ قومیت کا جزو ہیں اُس

وقت تک (ہندو مسلم فسادات کے) مسئلہ کو سلجھایا ہی نہیں جاسکتا.........
امر واقعہ یہی ہے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ معاشرے ہیں جو دو الگ الگ تہذیبوں کی نمائندگی کرتے ہیں. ان کے اندر یہ اختلاف ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا.....
...اگر میری یہ بات مان لی جائے تو پھر اگلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ اسے تسلیم کرلیا جائے کہ ہندو اور مسلم دو الگ الگ قومیں ہیں.

(طلوعِ اسلام. بابت جون ۱۹۶۹ء)

یہی بات مسٹر چوہدری نے اس سے پہلے اپنی شہرۂ آفاق کتاب (THE CONTINENT OF CIRCLE) میں بھی کہی تھی جو ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی تھی. غور کیجئے کہ ہندوستان کا ہندو تو یہ کہہ رہا ہے کہ ہندوستان کی سیکولر حکومت کے تحت رہنے والے ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور پاکستان کو اسلامی مملکت قرار دینے کے مدّعی، ایک طرف یہاں کے مسلموں اور غیر مسلموں کو ایک قوم تسلیم کر رہے ہیں اور دوسری طرف خود مسلمانوں کو بھی علاقائی تفریق کے اعتبار سے، چار قوموں میں تقسیم کر رہے ہیں.

بسوخت عقل زِ حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

آئینِ پاکستان میں، خدا خدا کر کے ختمِ نبوّت کے عقیدہ کو مسلمان ہونے کی شرط قرار دے دیا گیا. اس کے لئے اس آئین کے مرتبین مستحقِ مبارک باد ہیں. لیکن یاد رکھئے بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی.

۱. جب تک ہمارے آئین میں یہ شق نہ رکھی جائے کہ مسلم اور غیر مسلم ایک قوم نہیں قرار دیئے جاسکتے، نہ یہ مملکت اسلامی ہو سکتی ہے نہ ہمارا آئین اسلامی.
۲. جب تک ہمارے آئین میں یہ شق نہیں رکھی جاتی کہ مسلمانوں میں متعدد قومیتوں کا نظریہ اسلام کی ضد اور مملکت کے خلاف بغاوت کے مترادف ہے، نہ ملّتِ واحدہ وجود میں آسکتی ہے نہ پاکستان محفوظ رہ سکتا ہے.
۳. جب تک دو قومی نظریہ کو ہمارے نصابِ تعلیم میں داخل نہیں کیا جاتا، پاکستان کا مستقبل مستحکم نہیں رہ سکتا. اور
۴. جب تک آپ قرآنی نظریۂ پاکستان کو اپنی تقریروں اور تحریروں کا مرکزی موضوع قرار نہیں

دیتے۔ نہ اقبالؒ کی یاد میں اجتماعات منعقد کرنے سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے، نہ قائد اعظمؒ کے یوم منانے سے کوئی فائدہ۔ اقبالؒ نے کہا تھا کہ اگر وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دے لیا گیا تو اس کا نتیجہ لادینی ہوگا۔ اور قائد اعظمؒ نے فرمایا تھا کہ اگر ہم نے دو قومی نظریہ کی بنا پر پاکستان حاصل نہ کیا تو برصغیر میں مسلمان باقی رہیں گے، نہ اسلام۔ اور آپ مجھے اپنی زندگی کے اس ڈھلتے ہوئے دور میں اس جگر شگاف اور جاں سوز حقیقت کو زبان تک لانے کی اجازت دیجئے کہ ہم نے نظریۂ پاکستان اور اس کے عملی تضمنات کو نظر انداز کر دیا جو درحقیقت قرآن ہی کے نظریۂ حیات کا دوسرا نام ہے تو اوّل تو یہ مملکت ہی باقی نہیں رہ سکے گی کیونکہ اس کی وجہ جواز ہی ختم ہو جائے گی۔ اور اگر یہ باقی بھی رہی تو یہ اسلام کی نشاطِ ثانیہ کا گہوارہ نہیں بن سکے گی جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ اس سے اسلام کا کچھ نہیں بگڑے گا کہ وہ اپنے ظہور (غلبہ) کے لئے کوئی اور خطۂ زمین تلاش کر لے گا۔ لیکن ہمارا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ یہی وہ المیہ تھا جس کے پیشِ نظر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

حق اگر از پیشِ ما بردارَش ۔۔۔ پیشِ قومے دیگرے بگزاردش
ترسم از روزے کہ محرومش کنند ۔۔۔ آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند!

وَيٰلَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَنْسِيًّا۔

والسّلام

اقبالؒ کا مردِ مومن

یومِ اقبالؒ، اپریل ۱۹۴۴ء کا خطاب

عزیزانِ گرامی قدر۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔

ہم آج ایک ایسی واجب الاحترام ہستی کا یومِ وفات منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں جو ملتِ اسلامیہ کا بالعموم اور ہم اہلِ پاکستان کا بالخصوص عظیم محسن ہے۔ پوری ملت کا اس لئے کہ اس نے خدا کی اس کتابِ جلیل کو جسے ہم نے صدیوں سے نقش ونگارِ طاقِ نسیاں بنا کر رکھ چھوڑا تھا اور جس کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں رہ گیا تھا کہ از یسین او آساں بمیری — پھر سے کتابِ زندہ کی صورت میں پیش کیا اور اہلِ پاکستان کا اس لئے کہ اس نے اس بے مقصد مصروفِ دشت پیمائی اور صحرا نوردی قوم کے سامنے زندگی کا ایک بلند نصب العین رکھا۔ یعنی ایک ایسی آزاد مملکت کا تصور جس میں اسلام پھر سے ایک عملی نظام کی حیثیت سے کارفرما ہو سکے۔ علامہ اقبالؒ کے یہ بہت بڑے احسانات ہیں جن سے ہم عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ان کے احسانات کا یہی احساس ہے جس کی بنا پر میں ۱۹۳۸ء سے آج تک ان کے زندگی بخش پیغام کی یاد تازہ کراتے چلا آرہا ہوں اور یہی آج کے اجتماع سے بھی مقصود ہے۔ "پیغامِ اقبالؒ اور قرآن کریم" میرا مخصوص موضوع ہوتا ہے۔ اس موضوع کے متنوع گوشے ہیں جنہیں بہ تمام وکمال کسی ایک نشست میں پیش کرنا ناممکن ہے۔ ایک نشست میں ان میں سے کوئی ایک گوشہ ہی سامنے لایا جا سکتا ہے۔ میں آج جس گوشہ کو نمایاں کرنا چاہتا ہوں اس کا عنوان ہے "اقبالؒ کا مردِ مومن"۔ اس

موضوع تک پہنچنے کے لئے ایک تمہید ناگزیر ہے ۔ ایسے ہی ناگزیر جیسے فصل بونے کے لئے زمین کا ہموار اور نرم کرنا ناگزیر ہوتا ہے کہ "تمہید" کے بنیادی معنی یہی ہیں۔ اور اقبالؒ تو خود اس دنیا کی زندگی کو مزرعِ آخرت کی تمہید قرار دیتا ہے جب کہتا ہے کہ

زمین خاکِ درِ میخانۂ ما — فلک یک گردشِ پیمانۂ ما
حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است — جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

اور ہمارے موضوع کی تمہید یا دیباچہ یہ ہے:۔

تمہید

قرآنِ کریم، داستانِ حیات کو بڑے عجوبانہ لیکن اس کے ساتھ ہی نہایت حکیمانہ انداز سے بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی، ناقابلِ نمو، جامد مادہ (INORGANIC MATTER) میں محوِ خواب تھی کہ پانی کے چھینٹے نے اس کی آنکھ کھول دی۔ یوں پانی اور مٹی کے امتزاج سے اوّلین جرثومۂ حیات وجود میں آیا۔ یہ جرثومہ جوشِ نمو سے دو حصّوں میں بٹ گیا جس سے نر و مادہ کا امتیاز عمل میں آگیا اور ان کے اختلاط سے کاروانِ حیات، شاخ در شاخ مختلف سمتوں میں بڑھتا، پھولتا، پھلتا، رواں دواں پھیلتا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ تاآنکہ وہ کروڑوں سال کی منزلیں طے کرتا اور پہلو بدلتا پیکرِ حیوانی میں نمودار ہو گیا اور جب اس نے ایک ارتقائی جست اور آگے لگائی تو زندگی نے لباسِ بشریت اختیار کر لیا۔[۱]

یورپ کے سائنس دان اپنی صدیوں کی تحقیق و کاوش کے بعد اُس نتیجہ پر پہنچے ہیں جسے قرآن نے چودہ سو سال پہلے ان اشارات میں بیان کر دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد حکمائے مغرب کے نظریہ اور قرآنی حقائق میں ایسا ناقابلِ مفاہمت اختلاف سامنے آتا ہے جسے کفر اور ایمان کے افتراق سے تعبیر کیا جائے گا۔ مغربی محققین کا نظریہ یہ ہے کہ انسانی اور حیوانی زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ بجز اس کے کہ انسانی شعور کی سطح ذرا زیادہ بلند ہے۔ دونوں فطرت کے طبعی قوانین کے تابع زندگی بسر کرتے

---

[۱] میں نے اس مقام پر محض اشارات سے کام لیا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی میری کتاب "ابلیس و آدم" میں ملے گی۔

کھاتے پیتے، افزائشِ نسل کرتے اور بالآخر مر جاتے ہیں. موت کے ہاتھوں جس طرح دیگر حیوانات کا خاتمہ ہو جاتا ہے اسی طرح انسانی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے. بالفاظِ دیگر، انسانی پیکر، ارتقاء کے سلسلۂ دراز کی آخری کڑی ہے. اس کے بعد فنا ہے. قرآنِ کریم اس تصورِ حیات کو کفر یعنی حقیقت سے انکار قرار دیتا ہے جب کہتا ہے کہ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲) حقیقت سے انکار کرنے والے (یعنی کفار) حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں. یعنی کھاتے پیتے اور بالآخر مر جاتے ہیں. وہ کہتا ہے کہ ذرا سوچو تو سہی کہ فطرت کا وہ تخلیقی پروگرام جس کی ابتداء اس قدر معجزانہ انداز سے ہوئی، پھر کاروانِ حیات جس انداز سے مختلف وادیوں میں سے گزرا. اس لئے جس طرح انواع و اقسام کے کروڑوں پیکر اختیار کئے. اپنی خاصیتیں بدلیں، نوعیتیں تبدیل کیں. اس میں ایسے ساحرانہ تغیرات نمودار ہوئے کہ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ عروسِ حیات جو بہ ہزار عشوہ و رعنائی پیکرِ انسانی میں کھڑے مسکرا رہی ہے، وہی ہے جس کا آغاز ایک جرثومۂ حیات سے ہوا تھا. ذرا سوچو کہ یہ تمام محیّر العقول پروگرام ـ یہ حیرت بدوش زندگی. یہ سرتاسر طلسماتی منزلیں. اس تمام نظامِ ارتقاء کا ماحصل یہی تھا کہ موت کی ایک ٹھوکر اس کارگہِ نمود و وجود کو مٹی کے گھروندے کی طرح پامال کر کے رکھ دے؟ سوچو کہ یہ تصور کس قدر بے معنی اور یہ نظریہ کیسا بعید از قیاس ہے. العبث خاک ساختن می نزد خدائے را

قرآن نے کہا کہ پیکرِ بشریت سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی نہیں. یہ ایک جدید سلسلۂ ارتقاء کی اوّلین کڑی ہے. یہاں سے کاروانِ حیات ایک نئی منزل میں داخل ہوتا ہے. انسانی زندگی اس کے طبعی جسم ہی سے عبارت نہیں. اس میں ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات، نفس یا خودی کہہ کر پکارا جاتا ہے. اس سے پہلے مقصود صرف طبعی جسم کی نشو و نما تھا لیکن اب مطلوب انسانی ذات کی نشو و نما ہے. انسانی جسم کی نشو و نما دیگر حیوانات کی طرح طبعی قوانین کی رُو سے ہوتی ہے. لیکن انسانی ذات کی نشو و نما ان غیر متبدل اقدار کی رُو سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعے ملتی رہی ہیں اور جو اب قرآن کے اندر محفوظ ہیں. انسانی جسم کی نشو و نما کیسے ہی لطیف و نفیس انداز سے کیوں نہ ہو وہ انسانی جسم ہی رہتا ہے. ارتقاء کی اگلی منزل میں نہیں پہنچتا. لیکن جب انسانی ذات کی نشو و نما سے انسان، سلسلۂ ارتقاء کی اگلی اور بلند منزل میں پہنچ جاتا ہے، پھر موت سے اس کا جسم تو پیوندِ خاک ہو کر ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کی ذات کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا. وہ زندگی کی مزید ارتقائی

منازل طے کرنے کے لئے آگے بڑھ جاتی ہے۔ جس انسان میں اس کی ذات کی نشوونما شروع ہو جائے اُسے قرآن کی اصطلاح میں مومن کہا جاتا ہے۔ دین (یعنی اسلامی نظامِ حیات) کا مقصد انسان کو مومن بنانا ہے۔ قرآنِ کریم وہ ضابطۂ زندگی یا پروگرام عطا کرتا ہے جس کی رُو سے ایک انسان، مردِ مومن بن سکتا ہے۔ اس پروگرام کی رُو سے، حسنات وہ اعمال ہیں جن سے انسانی ذات کی نشوونما اور تعمیر ہوتی ہے اور سیئات وہ کام جن سے اس کی تخریب ہوتی ہے۔ یہی خیر و شر کا نقطۂ امتیاز اور نیکی اور بدی کا معیار و مقیاس ہے۔

آگے بڑھنے سے پیشتر اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ مغرب کے تصورِ حیات اور قرآنی تصور کا فرق محض نظری (THEORETICAL) یا سائنسی تحقیق کے نتائج کا فرق نہیں۔ یہ ایسا بنیادی فرق ہے جس سے انسانی زندگی کا ہر شعبہ — معاشرتی، معاشی، سیاسی، تمدنی وغیرہ اساسی طور پر متاثر ہوتا ہے اسی وجہ سے قرآن نے اُسے کفر اور ایمان کے فرق سے تعبیر کیا ہے۔ مغربی نظریہ کی رُو سے انسانی زندگی محض طبعی زندگی ہے جو دیگر حیوانات کی طرح طبعی قوانینِ فطرت کے تابع رہتی ہے۔ اس زندگی میں طبعی قوانین سے ماورا۔ یا بلند کوئی اور قانون نہیں۔ یہ جو آپ اقوامِ مغرب کے ہاں ہر جگہ "جنگل کا قانون" کارفرما دیکھتے ہیں تو یہ اسی نظریانہ زندگی کا عملی اور فطری نتیجہ ہے۔ اسی کو سیکولرازم یا لادینیت کہا جاتا ہے اور جس جہنم میں آج ساری دنیا ماخوذ ہے وہ اسی نظریہ کے برگ و بار ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد ‏ ‏ ‏ ‏ زیرِ گردوں رسمِ لادینی نہاد
در نگاہش آدمی آب و گل است ‏ ‏ ‏ ‏ کاروانِ زندگی بے منزل است

(پس چہ باید کرد۔ صفحہ ۵۶)

آپ نے دیکھا کہ سائنس کا ایک غلط نظریہ کس طرح انسانی زندگی کے ہر شعبے کو زیر و زبر کر دیتا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآن کی رُو سے دین اور دنیا میں کوئی مغائرت یا ثنویت نہیں تو اس سے یہی مراد ہے۔ جب تک انسانی زندگی کے متعلق اقوامِ مغرب کا زاویۂ نگاہ نہیں بدلتا، وہاں کے سیاسی، معاشی، معاشرتی نظام میں کوئی صالح تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس غلط نظریۂ حیات کے تخریبی نتائج نے جو قیامت برپا کر رکھی ہے اس سے متاثر ہو کر اب یورپ کے مفکر رفتہ رفتہ اس طرف آ رہے ہیں کہ

انسانی زندگی محض حیوانی زندگی نہیں۔ اس سے آگے کچھ اور ہے اور اب مزید ارتقاء طبعی جسم کا نہیں بلکہ اس کی انسانی مضمرات کا ہوگا۔ روس کا مشہور مفکر اوسپنسکی اپنی مشہور کتاب (IN SEARCH OF THE MIRACULOUS). میں لکھتا ہے۔

> اب انسانی ارتقاء کا مفہوم ہے ان ذہنی اور ممکنات کا نشوونما پانا جو از خود نشوونما نہیں پاسکتیں یعنی جن میں میکانکی طور پر بالیدگی پیدا نہیں ہو سکتی صرف اس نہج کی نشوونما صرف اس انداز کی بالیدگی انسان کا حقیقی ارتقاء کہلا سکتی ہے۔ اس کے سوا کسی اور چیز کو انسانی ارتقاء نہیں کہا جا سکتا۔

برگساں اس سلسلہ میں لکھتا ہے کہ اب ارتقائی منازل سے مقصود یہ ہے کہ "انسان ان حدود سے آگے بڑھ جائے جو مادی فطرت نے نوعِ انسان پر عاید کر رکھی ہیں"

اور پروفیسر آرتھر تھامس اپنی کتاب (GOSPEL OF EVOLUTION) کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتا ہے کہ:-

> ہم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ ہکسلے نے یہ غلط کہا تھا کہ کائناتی تجربہ کا اخلاقی مقاصد سے کچھ تعلق نہیں۔ اس کے برعکس ہم پروفیسر (FATRICK GEEDS), سے متفق ہیں کہ فطرت درحقیقت اخلاقی عمل ہی کی مادی شکل کا نام ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ حقیقت ارتقائی کتابِ مقدس کا نہایت اہم جزو ہے۔ حیوانات سے ہمارا تعلق اب ہمیں ملائکہ کی طرف لئے جا رہا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ حضرات اب خالص مادی نظریۂ ارتقاء کو باطل قرار دے کر کس طرح انسانی ارتقاءً کی طرف آرہے ہیں لیکن چونکہ قرآن کی شمعِ تابندہ ان کے سامنے نہیں اس لئے مزید ارتقائی منازل کے راستے اور ان کے طے کرنے کا پروگرام، ہنوز نکھر اور ابھر کر ان کے سامنے نہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ بھی ہو جائے گا کہ اس کے سوا انسان کے لئے کوئی چارۂ کار نہیں۔

مستقل اقدار

میں نے پہلے کہا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر

کرنے سے ہوتی ہے۔ ان اقدار کی اصل و حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن کریم نے ذاتِ خداوندی کا تعارف اس کی صفات کی رُو سے کرایا ہے جنہیں الاسمار الحسنیٰ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان صفات یا اسمار کی رُو سے ذاتِ خداوندی کے مختلف گوشوں کی جھلک سامنے آتی ہے۔ انسانی دنیا میں انہی کو مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ تو ایسی صفات ہیں جو ذاتِ خداوندی سے مختص ہیں، مثلاً ھو الاوّل و الاٰخر۔ ھو الظاھر و الباطن۔ یعنی اس کا زمان اور مکان کی حدود سے ماورا ہونا۔ یا فاطر السمٰوٰت و الارض۔ کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا۔ اس قسم کی صفات کے سوا، باقی صفات ایسی ہیں جنہیں انسان علیٰ حدِ بشریت، اپنی ذات میں منعکس کر سکتا ہے۔ انہی کو مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ قرآن نے انہیں صبغۃ اللّٰہ (۲/۱۳۸) یا اللہ کا رنگ کہہ کر پکارا ہے۔ جوں جوں انسان ان صفات کو اپنی ذات میں منعکس کئے جاتا ہے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ قرآن میں بیان کردہ صفاتِ خداوندی پر نگاہ ڈالئے، یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ ان میں سے بیشتر صفات ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ مثلاً خدا غفور الرّحیم بھی ہے اور شدید العقاب بھی۔ وہ عفوٌ کریم بھی ہے اور جبار و متکبر بھی۔ ان صفات میں باہمدگر تضاد نہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ مختلف خصوصیات کا مجموعہ ہے جن میں سے ہر خصوصیت (صفت) کا ظہور اس کے مناسب موقعہ پر ہوتا ہے۔ وہ ظالم کے لئے نہایت سخت گیر ہے اور مظلوم کے لئے رحیم و کریم۔ وہ قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے والے کو سرفرازی اور سربلندی عطا کرتا ہے اور ان کے سرکشی برتنے والے کی نخوت و تکبر کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ سوال ان صفات ہی کا نہیں، اس کے ساتھ سوال یہ بھی ہے کہ کس موقعہ پر خدا کی کس صفت کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ بات قرآنِ کریم کے گہرے مطالعہ سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔

ہمارے ہاں جب مومنین کی خصوصیات کا ذکر ہوتا ہے تو اس کے لئے عام طور پر چند اخلاقی خوبیاں گنا دی جاتی ہیں (مثلاً) وہ جھوٹ نہیں بولتے، بددیانتی نہیں کرتے وغیرہ۔ یہ ٹھیک ہے۔ مومنین ان خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن جس باب میں مومن، دوسرے "نیک لوگوں" سے منفرد ہوتے ہیں وہ اور ہے۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ خارجی دنیا میں ظہور میں آئے تو اس وقت جس صفتِ خداوندی کو ظہور میں آنا ہو، مومن کی طرف سے اسی صفت کا ظہور ہو یعنی

ہر واقعہ پر اس کا ردِ عمل وہی ہو جو اس کے خدا کا "ردِ عمل" ہو۔ گرفت کے موقعہ پر گرفت۔ رحم کے موقعہ پر رحم۔ سرسام زدگان کی فصد کھولنے کے لئے نوک نشتر اور زخموں کے اندمال کے لئے مرہم کا پھایا۔

اس تمہید سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ قرآنِ کریم نے ذاتِ خداوندی کی صفات اور مختلف مواقع پر ان کے ظہور کی جو تفاصیل بیان کی ہیں وہ حدودِ بشریت کے اندر درحقیقت مومن کی خصوصیات کا تذکرہ ہے۔ بالفاظِ دیگر قرآنِ کریم کی ساری تعلیم کا منتہیٰ و مقصود یہ بتانا ہے کہ ایک انسان کس طرح مومن بنتا ہے اور مومن کی زندگی سے کس کس قسم کی خصوصیات کی نمود ہوتی ہے۔ میں نے "نمود" کا لفظ ارادۃً استعمال کیا ہے۔ بتانا اس سے یہ مقصود ہے کہ ایک مومن (مثلاً) جب عدل کرتا ہے تو وہ محنت و کاوش سے (WITH EFFORT) ایسا نہیں کرتا۔ عدل اس کی ذات کی خصوصیت ہے جو مناسب موقعہ پر خود بخود نمودار ہو جاتی ہے۔ جس طرح روشنی اور حرارت سورج کی ذاتی خصوصیت ہے جس کا انعکاس خود بخود ہوتا رہتا ہے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ مومن جس وقت سخت گیر ہوتا ہے اس وقت اس میں رحیمی اور کریمی کی صفت موجود نہیں ہوتی۔ مومن کی ذات میں یہ تمام صفات ہر وقت موجود رہتی ہیں اور مناسب مواقع پر خود بخود ظہور میں آتی رہتی ہیں۔ یوں کہیئے کہ مومن مختلف صفات کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ اس کی ذات ہمہ گیر ہوتی ہے جس میں یہ تمام صفات یوں سموئی ہوئی ہوتی ہیں جس طرح پھول میں خوشبو، رنگینی، لطافت، نزاکت اور طبّی خواص جیسا کہ میں نے کہا ہے قرآنِ مجید درحقیقت مومنین کی اپنی صفات و محاسن کا تذکرۂ جمیلہ ہے اس کا ارشاد ہے کہ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۲۱/۱۰) ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب نازل کی ہے جس میں خود تمہارا ذکر ہے۔ اس حقیقت کو عقل و بصیرت کی رو سے سمجھو۔ دیکھئے اس عظیم حقیقت کو اقبالؒ کس حسین انداز میں بیان کرتا ہے جب کہتا ہے کہ

محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی، قرآں بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

اور جس طرح قرآنِ کریم مختلف طرق و اسالیب سے مومنین کی خصوصیاتِ کبریٰ کا تذکرہ کرتا ہے اسی طرح اقبالؒ بھی گوناگوں انداز سے مومن کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے۔

یہاں یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ ارتقاء کے اس عظیم نظام سے مقصد افرادِ انسانیہ کی ذات کی نشوونما ہی ہے یا یہ نظامِ کائنات کے خدائی پروگرام میں بھی کوئی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ یہ درحقیقت خدائی پروگرام کی تکمیل کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ وہ ان افراد (مومنین) کو حزب اللہ (۵/۵۶) کہہ کر پکارتا ہے یعنی خدا کی پارٹی۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے قرآن نے ان دو لفظوں میں اپنے مخصوص معجزانہ انداز میں بیان کر دیا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ انسانی دنیا میں خدا نے جس قدر ذمہ داریاں اپنے اوپر لے رکھی ہیں، وہ خدا کی اس پارٹی (جماعتِ مومنین) کے ہاتھوں سرانجام پاتی ہیں۔ مثلاً مدینہ میں اس جماعت کی اپنی مملکت قائم ہوئی لیکن مکہ میں ابھی ایسے مسلمان تھے جو گھر کر رہ گئے تھے اور مخالفین انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے۔ یہ لوگ اپنی انتہائی مظلومیت کی حالت میں خدا کو مدد کے لئے پکارتے تھے۔ خدا قادرِ مطلق ہے۔ اس کے لئے کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ وہ ان ستم زدگان کی براہِ راست مدد کر کے انہیں وہاں سے نکال لیتا۔ لیکن اس نے خود ایسا نہیں کیا۔ اس نے اپنی پارٹی (یعنی مدینہ کے مسلمانوں) سے کہا کہ

> (اے ہماری پارٹی کے لوگو!) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ظالمینِ مکہ کے خلاف جنگ کے لئے نہیں نکلتے؟ تم سنتے نہیں کہ وہاں کے مظلوم مرد، عورتیں، بچے کس طرح بلک بلک کر ہمیں پکار رہے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں اس بستی سے جس کے باشندوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے بحفاظت نکال لینے کا سامان پیدا کر دے۔ تو ہمارے لئے کوئی مددگار بھیج۔ تو کسی کو ہمارا پشت پناہ بنا۔ (۴/۷۵)۔

آپ نے غور فرمایا کہ وہ لوگ خدا کو مدد کے لئے پکار رہے تھے اور خدا "حزب اللہ" یعنی اپنی پارٹی سے کہہ رہا تھا کہ تم سنتے نہیں ہو کہ وہ لوگ ہمیں کس طرح پکار رہے ہیں۔ تم ان کی مدد کے لئے کیوں نہیں اٹھتے! یہ ان کی مدد کے لئے اٹھے اور ان کے دشمنوں کو میدانِ جنگ میں فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ اس جنگ کا ذکر کرتے ہوئے خدا نے بعد میں کہا کہ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ۔ وہاں ان مخالفین کو تم قتل نہیں کر رہے تھے، ہم قتل کر رہے تھے۔ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸/۱۷) تم تیر نہیں چلا رہے تھے، ہم چلا رہے تھے۔ اور یہ اس لئے تھا

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا (۹/۴۰)۔ کہ مخالفینِ حق و صداقت کے پروگرام کو شکست ہو اور خدا کا پروگرام غالب آئے اور اس کے لئے کہا کہ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (۴۷/۷) اگر تم خدا کی مدد کے لئے اٹھو گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا کہ درحقیقت خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے مصروفِ تگ و تاز ہوتے ہو۔

یہ ہے عزیزانِ من! جماعتِ مومنین کا مقام اور یہ ہے وہ دلکش و بصیرت افروز انداز جس سے خدا ان کا تذکرہ کر رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بار بار کہا ہے کہ ان کا پیغام، قرآن کے پیغام ہی کی تشریح و تبیین ہے۔ اس لئے ان کا کلام، بنیادی طور پر، مردِ مومن کی خصوصیات، مقام، فریضۂ حیات اور مطمعِ زندگی کا تابندہ و درخشندہ آئینہ ہے۔ آئیے اس آئینہ میں مردِ مومن کی چند ایک جھلکیاں دیکھیں۔

بندۂ مولا صفات

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مومن وہ ہے جس کی ذات میں، صفاتِ خداوندی علیٰ حدِ بشریت جھلمل جھلمل کر رہی ہوں اور کائنات کے خدائی پروگرام اس کے ہاتھوں تکمیل تک پہنچیں۔ دیکھئے حضرت علامہ ان حقائق کو اپنی نظم مسجدِ قرطبہ میں کس وجد آفریں انداز سے بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دلنواز

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو! — رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز

نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقیں — اور یہ عالم تمام، وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

آپ اس مصرعہ میں "عقل کی منزل" اور "عشق کا حاصل" کی اصطلاحات پر غور فرمائیے اور پھر

قرآنِ کریم کی اس آیۂ جلیلہ کو سامنے لایئے جس میں کہا گیا ہے کہ

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا .... (۳/۱۹۱ — ۱۹۰)

یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں ان کے لئے کائنات کی تخلیق اور رات دن کی گردش میں قوانینِ خداوندی کی محکمیت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں اُن صاحبانِ علم و بصیرت کے لیے جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے، بیٹھے، لیٹے، قوانینِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے اور کائنات کے تخلیقی پروگرام پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور اپنی تحقیقات کے بعد علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارگہ ہستی کو نہ تو بے کار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لئے۔

لہٰذا، مردِ مومن، علم و ایقان، فکر و ایمان، عقل و عشق، خبر و نظر کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اس کی ذات متضاد صفات کا مجموعہ ہوتی ہے جن میں سے ہر صفت اپنے اپنے وقت پر اُبھر سامنے آجاتی ہے اور یوں دنیا اس طلسم کدۂ رنگا رنگ (KALEIDOSCOPE) کے مختلف پہلوؤں کو دیکھ کر محوِ حیرت رہ جاتی اور وجد و کیف کے عالم میں بیساختہ پکار اٹھتی ہے کہ

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

قدرت کے مقاصد کا عیار اسکے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

اللہ کی بُرہان

ان ابیات میں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ مومن کے متعلق کہا گیا ہے کہ گفتار میں، کردار میں اللہ کی بُرہان۔ تو اس سے مراد کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر مخلوق اپنے خالق کے جوہرِ تخلیق کی زندہ شہادت ہوتی ہے۔ مونا لیزا کے سحر آفریں تبسم کا خدنگِ بے کمان، لیونارڈو کے عظیم فنکار ہونے کی دلیل اور شہادت ہے۔ خدا نے اپنی مخلوق میں سے انسان کے متعلق کہا ہے کہ اُسے احسنِ تقویم میں پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی حسین ترین ہیئتِ ترکیبی لئے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اس ہیئتِ ترکیبی سے مراد انسانی جسم کی رعنائی اور زیبائی نہیں۔ کیونکہ اس کے بعد ہے۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۹۵/۶-۵) انسان کے اندر حسین ترین مخلوق ہونے کے ممکنات پوشیدہ ہیں۔ لیکن چونکہ اسے اس امر کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان ممکنات کو جس قالب میں چاہے ڈھال لے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے بے باک جذبات کی رَو میں بہہ کر پست ترین درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ اپنی ذات کے ارتقائی مدارج پر یقین سکتے ہوئے خدا کے تجویز کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں وہ پستی کے گڑھے میں گرنے کے بجائے انسانی ہیئت کے بلند ترین اور حسین ترین مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ انہی کو مومن کہا جاتا ہے۔ لہذا مومن کی ہر نقل و حرکت خدا کے احسن الخالقین ہونے کی شہادت ہوتی ہے۔ اس کے کردار کو دیکھ کر ہر شخص بلا ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ جس ہستی کا تخلیقی شاہکار ایسا ہے اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ اس لئے مومن —— گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان بن جاتا ہے۔

تقدیرِ یزداں

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے۔ یہ بھی ایک عظیم حقیقت کا اظہار ہے۔ مطلب اس سے یہ ہے کہ اگر کسی نے یہ معلوم کرنا ہو کہ فلاں معاملہ میں خدا کی مشیت اس کا ارادہ کیا ہے۔ وہ کیا کرنا چاہتا ہے تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ معلوم کرے کہ اس باب

میں مردِ مومن کا فیصلہ اور ارادہ کیا ہے۔ اس موقعہ پر جو فیصلہ مردِ مومن کا ہو، سمجھ لیجئے کہ وہی خدا کی مشیّت ہے۔ خدا ایسا ہی کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے کہ مومنین کے متعلق بتایا یہ گیا ہے کہ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ط (۷۶/۳۰) وہ وہی چاہتے ہیں جو خدا چاہتا ہے۔ ان کی مشیّت، مشیّتِ خداوندی کی مظہر ہوتی ہے اور ان کا چاہنا خود خدا کا چاہنا۔ اس حقیقت کو حضرت علامہؒ نے اپنے شعر میں باندازِ نو بیان کیا ہے۔ جسے دہرایا تو اکثر جاتا ہے لیکن سمجھا بہت کم۔ یعنی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خودی کی بلندی کے معنی یہ ہیں کہ انسانی ذات، صفاتِ خداوندی کی آئینہ دار بن جائے۔ جب ایسا ہو جائے تو پھر مومن کا ارادہ وہی ہوتا ہے جو خدا کا ارادہ ہو۔ اس کا فیصلہ وہی ہوتا ہے جو خدا کا فیصلہ ہو۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود بندۂ مومن قضائے حق شود

اس طرح مومن کے ارادے اور فیصلے، خدا کے مقاصد کے پہچاننے اور ماپنے کا مقیاس بن جاتے ہیں۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ بدر کے میدان میں جماعتِ مومنین کی مقاتلانہ تگ و تاز کے متعلق خدا نے کہا تھا کہ تم تلواریں نہیں مار رہے تھے، ہم مار رہے تھے۔ تم تیر نہیں چلا رہے تھے ہم چلا رہے تھے۔ اس طرح خدا کی مرضی تمہارے ہاتھوں سے پوری ہو رہی تھی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علامہؒ جاوید نامہ میں کہتے ہیں:-

عزمِ اُو خلّاقِ تقدیرِ حق است
روزِ ہیجا تیرِ او، تیرِ حق است

یہ اندازِ گفتگو فلسفیانہ سا ہے۔ اس کو ذرا شوخ انداز میں یوں کہتے ہیں کہ

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیرِ مسلماں مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

تقدیر کے ہاتھوں رونے والے مسلمان کو وہ جھنجھوڑ کر کہتے ہیں کہ

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

جب مومن اس طرح خود "تقدیرِ یزداں" بن جاتا ہے تو پھر وہ زمانے کی تقدیروں کو بدل دیتا ہے۔ تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیتا ہے۔ اقوامِ عالم کی بساط اُلٹ دیتا ہے۔ رنگِ کائنات تبدیل کردیتا ہے۔ یہ کچھ بن جاتا ہے مردِ مومن، جب اپنے ارادوں کو خدا کے ارادوں کے تابع کردیتا ہے۔

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اسکے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یہ ہے مطلب حضرت علامہؒ کے یہ کہنے کا کہ ـــــ قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے ـــــ یہ تو رہا اس دنیا کا معاملہ۔ اور اگر کوئی یہ دیکھنا چاہے کہ اس کے اعمال اسے جنت کا مستحق بنادیں گے یا نہیں تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ مومن کے اعمال نامہ کو سامنے رکھ کر دیکھ لے کہ اس کے اعمال اس پیمانے پر پورے اُترتے ہیں یا نہیں۔ اس لئے کہ مومن کی خصوصیت یہ ہے کہ

دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

عقل و جذبات

اب آگے بڑھیے۔ عقل اور جذبات کو دو متضاد عناصر خیال کیا جاتا ہے جن میں ہمیشہ باہمی کشمکش رہتی ہے اور جب جذبات عقل پر غالب آجاتے ہیں تو انسان تباہ ہوجاتا ہے۔ رہبانیت (یعنی تصوّف) میں اس کا علاج یہ بتایا جاتا ہے کہ جذبات کو فنا کردیا جائے۔ بظاہر یہ بات کچھ ناقابلِ قبول سی نظر آئے گی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ تصوف کا یہ مسلک خود شدّتِ جذبات کا پیدا کردہ ہے۔ جذبات کو اس قدر قابلِ نفرت سمجھنا کہ انہیں فنا کردینا ہی مقصودِ حیات قرار دے لیا جائے عقل کا فیصلہ قرار نہیں پاسکتا۔ عقل اسے بخوبی جانتی ہے کہ اگر انسان میں جذبات نہ ہوں تو اس کا (عقل کا) کوئی فیصلہ بروئے کار آہی نہ سکے۔ عقل کے فیصلے عملی پیکر اختیار ہی جذبات کی قوت سے کرتے ہیں۔ لہٰذا، عقل کا کب یہ تقاضا ہوسکتا ہے کہ وہ ایسے کارآمد عنصر کو اپنے ہاتھوں فنا کر کے خود عضوِ معطل بن کر رہ جائے۔ ترکِ جذبات کے معنی ہیں ترکِ آرزو، ترکِ مقاصد، اور یہ خالص جذباتی چیز ہے اس کے علاوہ ایک اور حقیقت بھی قابلِ غور ہے۔ انسانی جذبات بھی

اسی خدا کے پیدا کردہ ہیں جس خدا نے انسان کو عقل عطا کی ہے۔ لہٰذا خدا کی پیدا کردہ اتنی بڑی خصوصیت اور صلاحیت کو شر، فلہٰذا، قابلِ نفرت اور لائقِ ترک قرار دینا خدا کے عظیم تخلیقی پروگرام کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ خدا سے جنگ کرنا خدا کے مقربین کا شیوہ نہیں ہوسکتا اور آخری بات یہ کہ جذبات ایسی قوت نہیں جسے آپ فنا کرسکیں، انہیں آپ وقتی طور پر دبا تو سکتے ہیں، فنا نہیں کرسکتے۔ اور دبانے کی صورت میں بھی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ آپ ان کا ایک راستہ بند کرتے ہیں تو وہ اپنے لئے دس اور راستے تراش لیتے ہیں۔ نفسیات کی اصطلاح میں اسے بدنہادی (PERVERSION) کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے جذبات کو قابلِ نفرت فلہٰذا، فنا کردینے کے لائق قرار نہیں دیا۔ وہ انہیں بڑی اہمیت دیتا ہے اور ان کا اسی طرح احترام کرتا ہے جس طرح عقل کا۔ لیکن وہ کہنا یہ ہے کہ انسانی جذبات کو سرکش اور بے باک نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ انہیں ہمیشہ ــ ہدایت ــ یعنی اقدارِ خداوندی ــ کے تابع رکھنا چاہیئے۔ جب جذبات آسمانی ہدایت کے تابع رہیں گے تو ان کا نتیجہ تعمیر ہی تعمیر ہوگا۔ لیکن جب یہ اس سے سرکشی اختیار کرجائیں گے تو اس سے تباہی و بربادی، تخریب اور فساد پیدا ہوگا۔ اس کا ارشاد ہے کہ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (۲۸/۵۰) "اس سے زیادہ راہ گم کردہ کون ہوسکتا ہے جو ہدایتِ خداوندی سے بے نیاز ہوکر اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے۔" مومن میں عقل اور جذبات دونوں اپنی انتہائی شکل میں موجود ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ان دونوں کو ہدایتِ خداوندی کے تابع رکھتا ہے۔ اس پس منظر میں اس نظم کو سامنے لائیے جو ضربِ کلیم میں مدنیتِ اسلام کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے ۔۔۔ یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں
نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری ۔۔۔ نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں
حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی ۔۔۔ یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں!

اس سراپا مرصّع نظم کا ایک ایک شعر قرآن کی روشنی میں توضیح و تشریح کا متقاضی ہے۔

لیکن نقطۂ زیرِ نظر کی رعایت سے ہم سردست اس کے مطلع تک محدود رہتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ مومن کی زندگی ــــ یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں ــــ یعنی عقل جو اپنے انتہائے کمال تک پہنچی ہوئی ہو اور جذبات کی ایسی شدت جو سطح بیں لوگوں کی نگاہ میں دیوانگی نظر آئے۔ قرآنِ کریم نے عقل و جذبات کے اس امتزاج کو چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ وَ شَاوِرۡهُمۡ فِی الۡاَمۡرِ ۚ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰهِ ؕ (۳/۱۵۹) اے رسولؐ! تم مہماتِ امور میں اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کرو۔ اس کے بعد جب تم فیصلہ پر پہنچ جاؤ اور اپنے پروگرام کو بروئے کار لانے کا عزم کر لو، تو پھر قوانینِ خداوندی کی محکمیت پر یقینِ کامل رکھ کر میدان میں نکل آؤ اور تمام خطرات سے بیگانہ ہو کر جانبِ منزل بڑھتے چلے جاؤ ــــ یقیناً فتح و نصرت تمہارے قدم چومے گی۔

ظاہر ہے کہ مشورہ، نہایتِ اندیشہ، کمالِ عقل و فکر کا نام ہے جس میں جذبات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اگر مشورہ میں جذبات دخل انداز ہو جائیں تو انسان کبھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا وحیٔ خداوندی کی روشنی میں عقل و بصیرت کی رُو سے، پیشِ نظر معاملہ کا باہمی مشاورت سے فیصلہ کرو۔ اب اگلا قدم اس فیصلہ کو بروئے کار لانا ہے۔ اس کے لئے پہلی شرط عزمِ راسخ ہے اور دوسری چیز اپنے فیصلہ کے مبنی برحق ہونے پر یقینِ کامل۔ ان کا تعلق جذبات سے ہے۔ اُن مومنانہ جذبات سے جن کے حاملین کے متعلق کہا کہ اَلَّذِیۡنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَکُمۡ فَاخۡشَوۡهُمۡ فَزَادَهُمۡ اِیۡمَانًا ٭ۖ وَّ قَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَ نِعۡمَ الۡوَکِیۡلُ ﴿۱۷۳﴾ (۳/۱۷۳) وہ لوگ کہ جب ان سے دوسروں نے کہا کہ تمہارے مخالفین نے ہمارے خلاف ایک لشکرِ جرار جمع کر رکھا ہے۔ اس لئے ان سے ڈرو اور آگے نہ بڑھو۔ تو اس سے، بجائے اس کے کہ وہ خائف ہوں، ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے کہا کہ ہمیں ان کی پرواہ کیا ہے۔ ہمارا بھروسہ قوانینِ خداوندی کی محکمیت پر ہے اور یہ اتنی بڑی قوت ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی۔ یہ ہے مردانِ مومن کا عزم و توکّل جس کی رُو سے وہ دیوانہ وار آتشِ نمرود میں کُود جاتے اور مخالفت کی ہر قوت پر غالب آ جاتے ہیں۔ دیکھئے اقبالؒ اس حقیقت کو کیسے بصیرت افروز انداز میں بیان کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

امتاں را زندگی جذبِ دروں
کم نظر ایں جذب را گوید جنوں
ہیچ قومے زیرِ چرخِ لاجورد
بے جنونِ ذو فنون کارے نکرد!

مومن از عزم و توکل قاہر است
گر ندارد ایں دو جوہر کافر است

لیکن جذبات کی اس قدر اہمیت کے باوجود مومن کی زندگی میں یہ کس طرح اقدارِ خداوندی کے تابع رہتے ہیں، اسے قرآنِ کریم نے ایک آیت میں نہایت جامعیت سے واضح کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے ماں باپ، بیٹے بیٹیاں، بھائی برادر، تمہاری بیویاں یا دیگر رشتہ دار۔ وَ اَمْوَالُ ِۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا۔ تمہارا مال و دولت جسے تم نے محنتِ شاقہ سے حاصل کیا ہے وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا۔ تمہارا کاروبار جس کے مندا پڑ جانے سے تم خائف رہتے ہو۔ وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اور تمہارے یہ محلات جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو۔ غرضیکہ دنیا کی کوئی کشش و جاذبیت اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ تمہارے نزدیک، خدا، رسول اور اس کے راستے میں جہاد سے زیادہ محبوب ہو جائیں۔ فَتَرَبَّصُوْا تو انتظار کرو۔ حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (۹/۲۴) تا آنکہ قانونِ خداوندی اپنا فیصلہ صادر کر دے اور تم تباہ و برباد ہو جاؤ ـــــ یہ ہے قرآن کی رُو سے، اقدارِ خداوندی سے ٹکراؤ کی صورت میں انسانی جذبات کی حیثیت۔ اس قسم کے تصادم کے وقت مومن جذبات کا دامن جھٹک کر اقدارِ خداوندی کے تحفظ کے لئے دیوانہ وار آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسے پھر دہرا دیا جائے کہ مومن تمام معاملات کے فیصلے ہدایتِ خداوندی کی روشنی میں عقل و فکر اور غور و تدبر کی رُو سے کرتا ہے۔ اور جب کسی معاملہ میں فیصلہ کر کے اسے بروئے کار لانے کا عزم کر لیتا ہے تو پھر وقتی مصلحت کوشیوں سے بے نیاز ہو کر راستے کی تمام مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو دو لفظوں میں سمٹا دیا ہے جب کہا ہے کہ

فرزانہ بگفتارم، دیوانہ بہ کردارم

لیکن یہی جذبات جب اس کی راہ کے کانٹے بنتے نظر آئیں تو وہ یہ کہتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے کہ

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

عملِ تخلیق

اب ایک اور گوشے کی طرف آیئے۔ خدا کی ایک صفت فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ہے۔ یعنی کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا۔ یہ صفت خدا کے لئے مختص ہے اور انسانی ذات، خواہ وہ کتنی ہی نشوونما یافتہ کیوں نہ ہو جائے، اس صفت میں شریک نہیں ہو سکتی۔

حیوانی سطح پر افزائشِ نسل کا ذریعہ تولید ہے۔ یعنی جنسی اختلاط۔ خدا اس سے بلند و برتر ہے۔ اسی لئے اس نے اپنے متعلق کہا ہے کہ لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُوْلَدْ (۱۱۲/۳) اس کی ذات افزائش کے طریقِ تولید سے بلند و بالاتر ہے۔ لیکن انسانی نسل کی افزائش، طریقِ تولید کی رُو سے ہوتی ہے اس اعتبار سے حیوان اور انسان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

لیکن پیدائش کا ایک اور طریق ہے جسے عملِ تخلیق کہا جاتا ہے۔ تخلیق کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ جو عناصر موجود ہیں ان میں مختلف تراکیب سے امتزاج کے ذریعے نئی نئی چیزیں پیدا کرنا۔ خدا نے اپنے آپ کو اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ کہا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے علاوہ اور خالق ہو سکتے ہیں، اگرچہ ان کا عملِ تخلیق، خدا کے تخلیقی نوادر جیسا حسین نہیں ہو سکتا کیونکہ خدا احسن الخالقین ہے۔ اس سے تین نکات ہمارے سامنے آتے۔ (۱) فاطر صرف خدا ہو سکتا ہے کوئی اور نہیں۔ (۲) عملِ تولید حیوانی سطح پر طریقِ افزائش ہے اور (۳) مومن عملِ تخلیق میں خدا کا رفیق ہوتا ہے۔ تولید میں صرف تکرار ہوتی ہے۔ اس کی رُو سے ہر حیوان جس میں انسان بھی شامل ہے، صرف اپنے جیسا بچہ پیدا کر سکتا ہے۔ اس میں نُدرت نہیں ہوتی۔ ارتقا نہیں ہوتا۔ فکر کی دنیا میں اسے تقلید کہتے ہیں یعنی جو ہوتا چلا آ رہا ہے اسی طرح ہوتا چلا جائے۔ تخلیق کے لئے نئی فکر، نئے خیال، نئی آرزو، نئے نئے مقاصد کا دل میں اُبھرنا، نئی نئی تمناؤں کا بیدار ہونا شرطِ اولیں ہے۔ آپ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے جب تک آپ کے دل میں اس کے لئے ایک نیا خیال نہ اُبھرے۔ مومن کی زندگی تخلیقی کارناموں کا مظہر ہوتی ہے۔ تقلید و تکرار اس کا شیوہ نہیں ہوتا۔ اقبالؒ کے پیغام کا

نقطۂ ماسکہ تخلیقِ مقاصد اور بیداریٔ آرزو ہے۔ وہ اپنی سب سے پہلی تصنیف "اسرارِ خودی" کے ابتدائی باب میں کہتے ہیں کہ

زندگانی را بقا از مدّعا است کاروانش را درا از مدّعا است

اور

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

عملِ تخلیق کے لئے زندگی کے بلند مقاصد پر یقین ضروری شرط ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ:-

بے یقیں را لذّتِ تحقیق نیست
بے یقیں را لذّتِ تخلیق نیست

اقبالؒ کے نزدیک ایمان کا فطری نتیجہ تخلیقِ مقاصد ہے۔ وہ واشگاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ

ہر کہ او را لذّتِ تخلیق نیست نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

مومن کارگہ کائنات میں اپنے عملِ تخلیق میں نت نئے اضافے کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کو اقبالؒ مردِ حُر یا بندۂ آزاد کہتا ہے۔ اس کے برعکس غلام ہے جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

کیشِ اُو تقلید و کارش آذری است ندرت اندر مذہبِ اُو کافری ست

تازگی ہا وہم و شک افزائدش کہنہ و فرسودہ خوش می آیدش

حضرت علامہؒ فکر کی تازگی کی اہمیت کے متعلق کہتے ہیں کہ

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

اس کی تشریح (بالِ جبریل میں) ان الفاظ سے کرتے ہیں کہ:-

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملّت کا شباب

ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب

خدا نے اپنے عملِ تخلیق کے متعلق کہا تھا کہ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ (۳۵/۱) وہ اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق کائنات میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔ مومن بھی ندرتِ فکر و عمل سے نئی نئی ایجادات سے خدا کے تخلیقی پروگرام میں اس کا رفیق بن جاتا ہے۔ پولینڈ کا مفکر

باردیو اس سلسلہ میں کہتا ہے کہ "امرِ تخلیق صرف خدا کی طرف سے انسان کی طرف نہیں آتا بلکہ خدا بھی انسان سے تخلیقی جدتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ انسانی آزادی کے کارناموں کا منتظر رہتا ہے۔"

(THE DIVINE AND THE HUMAN).

نسل و رنگ

اب تولید و تخلیق کے فرق کا اگلا مرحلہ دیکھئے۔

جہاں تک انسان کی تمدنی زندگی کا تعلق ہے، تولید کی حیوانی سطح پر، افراد کا باہمی رشتہ خون اور نسل کے اشتراک کی بنا پر ہوتا ہے۔ ایک خاص نسل کے گھوڑے، خاص نسل کے بیل، خاص نسل کی بھیڑیں، الگ الگ نوع قرار پاتی ہیں۔ ان میں نسلی اشتراک کے سوا کوئی قدر مشترک نہیں ہوتی۔ جب انسان بھی حیوانی سطح پر زندگی بسر کرے تو وہ بھی خون اور نسل کے اشتراک سے مختلف قبیلوں اور قوموں میں بٹ جاتا ہے۔ لیکن جب وہ مومن کی سطح پر آجائے تو پھر ان میں وجہِ جامعیت خون اور نسل کا اشتراک نہیں رہتی۔ اقدار کا اشتراک وجہِ جامعیت یا معیارِ قومیت قرار پاتا ہے۔ اس کو دو قومی نظریہ کہتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو حیوانی سطح پر زندگی بسر کریں، ایک قوم کے افراد اور جو لوگ مومنانہ سطح پر زندگی بسر کریں، دوسری قوم کے ارکین۔ ماں باپ، زن و فرزند، اعزا و اقارب سے تعلقات معاشرتی زندگی کا تقاضا ہے۔ لیکن اگر اس تقاضا اور اقدارِ خداوندی میں ٹکراؤ ہو تو یہ تعلقات یا یوں کہیئے کہ خون اور نسل کا اشتراک کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ مومن ان رشتوں کو بلا تامّل توڑ کر ان لوگوں سے الگ ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے کہا ہے کہ یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِیْمَانِ ؕ اے جماعتِ مومنین! اگر تمہارے ماں باپ یا بھائی بند، ایمان کے مقابلہ میں کفر کو زیادہ پسند کرتے ہوں تو تم ان سے دوستداری کے تعلقات مت وابستہ رکھو۔ وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۹/۲۳) یاد رکھو! جو ایسا نہیں کرے گا اور ان سے بدستور دوستانہ تعلقات وابستہ رکھے گا تو اس کا شمار بھی ظالمین میں سے ہوگا۔ اسی بنا پر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

قومِ تو از رنگ و خوں بالاتر است قیمتِ یک اسودش صد احمر است
گر نسب را جزو ملت کردۂ رخنہ در کارِ اخوت کردۂ
(بے خودی)

یعنی نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گذر

میں چونکہ اس موضوع پر سالہا سال سے مسلسل اور متواتر لکھتا چلا آرہا ہوں اس لئے اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ان اشارات سے آپ نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہوگا کہ اسلام میں قومیت کا مسئلہ سیاسی یا تمدنی سوال نہیں۔ یہ کفر اور ایمان کا خطِ امتیاز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں یا انسانی سطح پر ــــ حیوانی سطح زندگی کو کفر کہا جاتا ہے اور اقدارِ خداوندی کے مطابق انسانی سطح زندگی کو ایمان۔ قرآن کے عباد اللہ اور اقبالؒ کے مردانِ مومن کا ایک امتیازی جوہر یہ بھی ہے کہ وہ خون اور نسل کے حیوانی رشتہ کے بجائے ایمان و اقدار کے انسانی (مومنانہ) رشتہ سے وابستہ ہوتے ہیں۔

رحم اور قوت

اب ایک اور گوشے کی طرف آئیے۔ دنیا میں رحم اور قوت دو ایسے عناصر ہیں جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ یہ اکٹھے ہو ہی نہیں سکتے۔ عیسائیت نے خدا کو سرتاسر رحم قرار دیا ہے اور قوت کے ہر قسم کے تصور کو شر سے تعبیر کیا۔ خدا کے اس تصور نے جس قسم کا ضابطۂ اخلاق مرتب کیا، اس کے نتائج و عواقب کے متعلق عصرِ حاضر کا ایک عظیم مفکر "وھائٹ ہیڈ" لکھتا ہے کہ:

اس ضابطہ کو اگر موجودہ معاشرہ میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ (ADVENTURES OF IDEAS).

اس تصور کے خلاف ردِ عمل کا انتہائی مظہر جرمن فلاسفر نیٹشے ہے جس کے نزدیک "زندگی کا راز" قوت اور بے پناہ قوت میں ہے۔ وہ اس خصوصیت کے سوا کسی قدر کا قائل ہی نہیں۔ اس تصورِ حیات نے کیا نتائج پیدا کئے، اس کی زندہ شہادت وہ جہنم ہے جس میں اس وقت ساری دنیا

مبتلائے عذاب ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ دونوں تصورات باطل اور غلط نگہی پر مبنی ہیں۔ خدا ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (۵۱/۵۸) یعنی بے انتہا محکم قوتوں کا مالک بھی ہے اور اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ٥ (۷/۱۵۱) بھی۔ یعنی سب سے زیادہ رحم کرنے والا۔ وہ ظالم کی کلائی مروڑنے کے لئے صاحبِ قوت ہے اور مظلوم کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے انتہائی شفقت و رحمت کا مظہر۔ عبدِ مومن خدا کی ان دونوں صفات کا حامل ہوتا ہے اور اقبالؒ نے ان صفات کے حسین و جمیل امتزاج کو مختلف اسالیب و انداز سے اس شرح و بسط سے بیان کیا ہے کہ اگر میں اس کی تفصیل میں جانا چاہوں تو اس کے لئے کئی نشستیں درکار ہوں گی۔ قرآن نے جماعت مومنین اور ان کے سربراہ حضور نبئ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ۔ خدا کے پیغامبر محمدؐ اور ان کے رفقاء کی کیفیت یہ ہے کہ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹) وہ حق و صداقت کے مخالفین کے لئے چٹان کی طرح سخت ہیں اور باہمدگر حریر و اطلس کی طرح نرم۔ اقبالؒ ان متضاد خصوصیات اور ان کے امتزاج کو انتہائی وجد و کیف کے عالم میں بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مومن کی کیفیت یہ ہے کہ

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

ضربِ کلیم کی وہ تابندہ نظم جس کا مطلع ہے — ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — اور جس کے چند اشعار میں اس سے پہلے پیشِ خدمت کر چکا ہوں۔ اس کے آخر میں کہا ہے کہ مومن کی کیفیت یہ ہے کہ

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

بانگِ درا کی مشہور نظم — طلوعِ اسلام — میں وہ مسلمان تک خدا کا یہ پیغام پہنچاتے ہیں کہ:

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر — شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

قیام و سجود

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ . اس کے بعد قرآنِ کریم نے فدائیوں کی اس جماعت کی خصوصیت یہ بتائی کہ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا (۴۸/۲۹) تو انہیں دیکھے گا کہ کبھی رکوع میں جھکے ہوتے کبھی سجدہ میں گرے ہوئے.

علامہ اقبالؒ مومن کی صلوٰۃ سے کئی نادر معانی اخذ کرتے ہیں. وہ کبھی کہتے ہیں کہ

بسوزد مومن از سوزِ وجودش کشودِ ہر چہ بستند از کسودش

جلالِ کبریائی در قیامش جمالِ بندگی اندر سجودش

عبدِ مومن کے قیام و سجود کے جلال و جمال کے حسین منظر سے، میرے افقِ ذہنی پر، بلاساختہ افغانستان کی ایک شاعرہ پری بدخشی کی غزل کا ایک شعر نمودار ہو گیا. اس نے کہا ہے اور دیکھئے کس ساحرانہ انداز سے کہا ہے کہ

برخاستی! قیامتِ کبریٰ بلند شُد

بنشیں دمے! کہ فتنۂ محشر نشستہ بہ

لیکن اقبالؒ کسی اور ہی مقام سے بات کرتا ہے. ارمغانِ حجاز کا ایک قطعہ آپ نے ابھی ابھی سُن لیا. اسی مضمون کا دوسرا قطعہ ہے کہ

دو گیتی را صلا از قرأتِ اوست مسلماں لایموت از رکعتِ اوست

نداند کشتۂ ایں عصرِ بے سوز قیامت ہا کہ در قد قامتِ اوست

مومن کا قیام و سجود آئینہ دار ہے اس حقیقت کا کہ وہ ایک خدا کے حضور جھک کر دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے مردانہ وار کھڑا ہو جاتا ہے. سجدہ، اگر بغیر قیام کے ہو تو وہ عیسائیت (بلکہ یوں کہئے کہ) مسلکِ رہبانیت کے "خدا" کا خود ساختہ تصور ہے. اور اگر قیام بلا سجدہ ہو تو وہ نیٹشے کے تصور کا (SUPERMAN) ہے جو اندھی قوت کا قہرمانی مجسمہ ہوتا ہے.

قرآن نے قوت اور اقدارِ خداوندی کے امتزاج کو نہایت بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ

اَلْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایت اور میزانِ عدل دے کر بھیجا تاکہ لوگ عدل و انصاف کے مطابق زندگی بسر کریں۔ لیکن اس مقصد کے لئے نظری تعلیم یا پند و نصائح کافی نہیں تھے۔ اس لئے وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ ہم نے ان کے ساتھ شمشیرِ خارہ شگاف بھی نازل کی۔ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۷/۲۵) اگر اسے خدا کے نازل کردہ ضابطۂ ہدایت کے مطابق استعمال کیا جائے تو وہ نوعِ انسان کے لئے بڑی منفعت بخش ثابت ہوتی ہے۔ ضابطۂ خداوندی اور اس کے ساتھ تلوار (یعنی مادی قوت) — یہ ہے اسلام۔ تلوار کے متعلق اقبالؒ کہتا ہے کہ:

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے — کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار
اس بیت کا یہ مصرعِ اوّل ہے کہ جس میں — پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

تنہا تلوار، بیتِ زندگی کا صرف ایک مصرع ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک اس کے ساتھ دوسرا مصرع نہ ہو، یہ شعر نہیں بن سکتا۔ وہ دوسرا مصرعہ اقتدارِ خداوندی کا ضابطہ ہے۔ اقبالؒ نے اپنی زندہ و پائندہ تصنیف، جاوید نامہ میں تلوار اور قرآن کے باہمی تعلق کو ایسے عمیق لیکن درخشندہ انداز سے بیان کیا ہے کہ جوں جوں چشمِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، انسان وجد میں آجاتا ہے۔ (مغلیہ خاندان کے) شاہ عالم کے زمانہ میں، پنجاب کے گورنر نواب خان بہادر خان کی صاحبزادی محترمہ شرف النساء کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ کمر سے تلوار باندھے رکھتی تھیں اور ہاتھ میں قرآن۔ اور انہوں نے اپنی والدہ کو وصیت کی تھی کہ اس کی وفات کے بعد یہ دونوں چیزیں اس کی قبر کے اوپر رکھ دی جائیں۔

اقبالؒ اپنے آسمانی سفر میں، جنت الفردوس میں اس شہزادی والاتبار سے ملتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں کہ اس کے اس شعارِ زندگی اور آخری وصیت کی حکمت کیا تھی — وہ جواب میں کہتی ہیں کہ میں تلوار اور قرآن کو اس لئے ساتھ رکھتی تھی کہ

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند — کائناتِ زندگی را محور اند!
مومناں را تیغ با قرآں بس است — تربتِ ما را ہمیں ساماں بس است

تلوار سے مراد عسکری قوت ہی نہیں بلکہ ہر قسم کا اقتدار ہے۔ جب دین بلا اقتدار کے ہو تو

وہ مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کا منتہیٰ وعظ و نصیحت کی منت خوشامد سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اور جب اقتدار ضابطۂ خداوندی سے الگ ہو جائے تو وہ ہر دور میں فرعونیت کا مظہر بن جاتا ہے۔ ضربِ کلیم کی اس جلال آفریں نظم کو پڑھیے اور دیکھیے کہ حکیم الامت نے اس حقیقت کو کیسے واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

تاریخ اُمم کا یہ پیامِ ازلی ہے ۔۔۔ صاحبِ نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے ۔۔۔ عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

واضح تر الفاظ میں کہ:

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو ۔۔۔ جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

مومن کی سیاست دین کے تابع رہتی ہے۔ قرآن اس کی تلوار کا محافظ ہوتا ہے کہ وہ بے راہ رَو نہ ہونے پائے اور تلوار قرآن کی محافظ کہ وہ مذہب بن کر نہ رہ جائے۔ اس طرح مومن کی تلوار اس کی قوت، اس کا اقتدار، اس کی سیاست، اس کی مملکت، دنیا میں مقاصدِ خداوندی کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جب مکہ کے مظلوموں نے اپنی امداد کے لئے خدا سے فریاد کی تو اس نے کس طرح مدینہ کے صاحبِ اقتدار مسلمانوں سے کہا کہ تم ان مظلوموں کی فریاد کو سنتے نہیں! تم اُن کی مدد کے لئے کیوں نہیں اٹھتے؟ اسی حقیقت کو اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ ۔۔۔ ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا!

مومن کو خدا کے قانونِ مکافات کی محکمیت پر بھروسہ ہوتا ہے اور خدا کو جماعتِ مومنین کی استقامت اور پامردی پر بھروسہ کہ جب یہ مشیتِ خداوندی کے بروئے کار لانے کے لئے اٹھتے ہیں، تو اس کی (مشیت) بروئے کار آکر رہتی ہے۔ اس لئے کہ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ یہ خدا کی پارٹی ہے۔ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۸/۲۲) اور سُن رکھو کہ خدا کی پارٹی کامیاب ہو کر رہتی ہے۔ صرف کامیاب ہی نہیں فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ (۵/۵۶)

یہ سب پر غالب آکر رہتے ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کوئی قوم ان سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آگے بڑھنا تو ایک طرف، کوئی قوم ان کے ہمدوش نہیں ہو سکتی۔ ان کی برابری کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتی۔

مومنے بالائے ہر بالا ترے غیرتِ او برنتابد ہمسرے

اس لئے کہ ان کے خدا کا ارشاد ہے کہ وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۝ (۳/۱۳۹) جب تم مومن ہو تو پھر تم سے بڑا کوئی نہیں ہو سکتا۔ وَ لَنۡ یَّجۡعَلَ اللّٰہُ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ سَبِیۡلًا ۝ (۴/۱۴۱) یہ ہو نہیں سکتا کہ کفار کبھی مومنوں پر غالب آجائیں۔ جب صورت یہ ہے تو پھر واضح ہے کہ دنیا میں (خدا کی طرف سے) حقِ حکومت صرف جماعتِ مومنین کو حاصل ہوگا۔ کسی اور کو نہیں۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

مومن جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے، اپنے آپ کو اس ماحول کے مطابق نہیں ڈھال لیتا۔ وہ اس ماحول کو اپنے نظریات و تصورات کے مطابق ڈھلنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔ اسی کا نام انقلاب ہے اور مومن دنیا میں سب سے بڑا انقلابی ہوتا ہے۔ مثنوی اسرار و رموز میں ہے کہ

مردِ خودداری کہ باشد پختہ کار با مزاجِ اُو بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں می شود جنگ آزما با آسماں
برکند بنیادِ موجودات را می دہد ترکیبِ نو ذرات را
گردشِ ایّام را برہم زند چرخِ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوّتِ خود آشکار
روزگارِ تو کہ باشد سازگار

اس قسم کا انقلاب، مردِ مومن کا ایمان ہی برپا کر سکتا ہے اور اس کا طریق یہ ہے کہ

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

(MARTIN BUBAR) نے اس حقیقت کو جس خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے، جی نہیں چاہتا کہ اس کیف میں آپ کو شریک کئے بغیر آگے بڑھا جائے وہ کہتا ہے کہ

جب قوتِ تخلیق ہم پر اثر انداز ہوتی ہے تو وہ اپنے آپ کو جلا کر ہمارے اندر جذب ہو جاتی ہے اور اس آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے ہماری تخلیقِ نو کرتی ہے۔ ہم اس کے آتشیں جلال کے حضور میں پہلے کانپتے ہیں گڑگڑاتے ہیں، سربسجود ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ہم خود عملِ تخلیق میں شریک ہو جاتے ہیں اور خالق سے جا ملتے ہیں اس کے معاون اور رفیق کی حیثیت سے۔
(I AND THOU).

اس قسم کا جہانِ نَو، مردِ مومن کی قوتِ بازو ہی سے وجود میں آسکتا ہے۔ ایسا انقلاب کوئی اور پیدا نہیں کر سکتا جس میں کیفیت یہ ہو کہ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ (۱۴/۴۸) یہ زمین بدل جائے، یہ آسمان بدل جائے۔ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۱۴/۴۸) اور ان میں ایک نئی دنیا اُبھرے جس میں صرف خدائے واحد کا سکہ رواں ہو۔ وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (۳۹/۶۹) اور زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ یہ ہیں وہ مردانِ حُر جو ہیگل کے "روحِ زمانہ" اور مارکس کے "تاریخی وجوب" کے تابع مجبور و مقہور زندگی بسر کرنے کے بجائے تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیتے ہیں۔ باردیو کے الفاظ ہیں :-

یہی وہ انسان ہے جو تاریخ اور کائنات کی زندگی جیتا ہے اور اس میں باعمل و متحرک رہتا ہے لیکن تاریخ اور کائنات سے متأثر نہیں ہوتا بلکہ انہیں اپنے ارادوں کے تابع ڈھال لیتا ہے۔ اس قسم کا انسان صرف اپنی

لہ بوبر چونکہ یہودی ہے اس لئے اس کا اشارہ حضرت موسیٰؑ کے واقعہ طور کی طرف ہے۔

ذات کی یا ان لوگوں کی ذمہ داری ہی نہیں لیتا جو اس کے گرد و پیش ہوں
بلکہ تمام نوعِ انسان کے مقدرات کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے۔

(THE DIVINE AND HUMAN)

قرآن کے الفاظ ہیں وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (۲/۱۴۳) اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا تاکہ تم تمام نوعِ انسان کے اعمال و کردار کی نگرانی کرو۔

یہ ہے مومن کا مقام اِس دنیا میں اور چونکہ زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی، آگے بھی چلتی ہے، اس لئے جہانِ فردا میں بھی امامت کا سزاوار یہی ہوگا۔ اس لئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اُٹھا یہ مقامِ انتہائے راہ نہیں

بانگِ درا میں ہے۔

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تُو ہے

اور بالِ جبریل کی یہ رقصندہ و سرایندہ غزل۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں!

قرآنِ کریم کی رُو سے تو، جنت بھی مومن کے سفرِ حیات کی آخری منزل نہیں، راستے میں ستانے کا مقام ہے یعنی دم لے کر آگے چلنے کا مقام۔ کاروانِ حیات نے اس کے بعد بھی کئی ارتقائی منازل طے کرنی ہیں۔ اسی لئے اہلِ جنت کے متعلق کہا گیا ہے کہ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ۔ ان کی (پیشانی کا) نور ان کے آگے اور دائیں بائیں راستے روشن کرتا جائے گا۔ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَ اغْفِرْ لَنَا (۶۶/۸) اور ان کی پکار یہ ہوگی کہ اے

ہمارے نشوونما دینے والے، ہمارے نُور کی تکمیل کر دے۔ اس نورانی سفر کی آخری منزل کونسی ہوگی، اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا۔ اس لئے کہ ہمارے شعور کی موجودہ سطح پر یہ حقیقت ہمارے حیطۂ ادراک میں آ نہیں سکتی تھی۔ اس کی سمت کا اشارہ کرتے ہوئے اتنا کہا گیا کہ وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى (۵۳/۴۲) اس سفر کا منتہٰی تیرے رب کی طرف ہے۔ یاد رہے کہ اہلِ تصوف کا جو نظریہ ہے کہ انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا ایک جزو ہے اور زندگی کی تمام تگ و تاز کا ماحصل یہ ہے کہ یہ جزو اپنی اصل یعنی ذاتِ خداوندی میں جا کر جذب اور فنا ہو جائے، یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے اور دوسروں کے ہاں سے مستعار لیا ہوا۔ خود اقبالؒ بھی اس نظریہ کے خلاف ہے۔ اس کی تلقین یہ ہے کہ

چناں با ذاتِ حق خلوت گزینی ترا اُو بیند و اُو را تو بینی
بخود محکم گذار اندر حضورش مشو ناپید اندر بحرِ نورش
(گلشنِ راز جدید)

یہ بہرحال ایک الگ موضوع ہے جس کی وضاحت کا یہ مقام نہیں۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ مومن وہ ہے جو زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس کے مقامات کا ہم اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔

مقامِ بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات
حریمِ ذات ہے اس کا نشیمنِ ابدی نہ تیرہ خاکِ لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات

خود آگہاں کہ ازیں خاکداں بروں جستند
طلسمِ مہر و سپہر و ستارہ بشکستند (ارمغانِ حجاز)

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا، قرآنِ کریم کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اس میں مختلف پہلوؤں اور متنوع گوشوں سے مردانِ مومن کی خصوصیات

---

[1] ذاتِ خداوندی میں فنا ہو کر نہیں، بلکہ اسی حریم میں، اس سے الگ۔

کیفیات کا تذکرہ ہے اور علامہ اقبالؒ کا پیغام بھی چونکہ حقائقِ قرآنی ہی کا ترجمان ہے اس لئے اس میں بھی مومن کی صفات و تجلیات کو پہلو بدل بدل کر بیان کیا گیا ہے۔ اکثر مقامات پر وہ پھول کی بکھری ہوئی پتیوں کی طرح فرداً فرداً سامنے آتی ہیں اور کہیں انہیں گلدستہ کی طرح جامع حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ میں ایسے مقامات کی دو ایک مثالیں پیش کرتا ہوں تاکہ اقبالؒ کے مردِ مومن کی ایک جھلک بیک نظر آپ کے سامنے آجائے۔ وہ اپنی سب سے پہلی تصنیف 'مثنوی اسرار و رموز' میں سورۂ اخلاص کی آیت وَ لَمْ یَکُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ کی شرح کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

رشتہ با لَمْ یَکُنْ باید قوی — تا تو در اقوامِ بے ہمتا شوی
آنکہ ذاتش واحد است و لاشریک — بندہ اش ہم در نسازد با شریک
مومنے بالائے ہر بالا ترے — غیرتِ او بر نتابد ہمسرے
پیشِ باطل تیغ و پیشِ حق سپر — امر و نہیِ او عیارِ خیر و شر
عفو و عدل و بذل و احسانش عظیم — ہم بقہر اندر مزاجِ او کریم
سازِ او در بزمہا خاطر نواز — سوزِ او در رزمہا آہن گداز

زیرِ گردوں می نیاساید دلش
بر فلک گیرد قرار آب و گلش

میں یہ اشعار پڑھ رہا ہوں اور میرے حافظہ میں ایک ایسے واقعہ کی یاد تازہ ہو رہی ہے جو ہے تو ذاتی لیکن جی نہیں چاہتا کہ میں اسے یہاں بیان کئے بغیر آگے بڑھ جاؤں۔ میری ابتدائی تعلیم و تربیت، میرے لائقِ صد احترام، دادا جان (مرحوم و مغفور) کے زیرِ سایہ عاطفت ہوئی تھی۔ انہوں نے حضرت علامہؒ کی یہ مثنوی مجھے خود پڑھائی تھی۔ اس وقت میری عمر چھوٹی سی تھی۔ انہوں نے جب اقبالؒ کے اشعار اور قرآن کی روشنی میں، مردِ مومن کی صفات و خصائص بیان کیں تو مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی اور میں نے نہایت استعجاب اور کچھ خوف کے سے، ملے جلے جذبات کے ساتھ ان سے کہا کہ بابا جان! مردِ مومن اگر ایسا ہوتا ہے تو مجھے تو آج ساری دنیا میں کوئی مردِ مومن نظر نہیں آتا۔ انہوں نے اپنے مخصوص محبت بھرے انداز سے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ آج مردِ مومن کہیں

نظر نہیں آتا۔ لیکن غنیمت ہے کہ اگر ہمارے دور میں کوئی مومن نہیں تو دنیا میں آج کوئی کافر بھی موجود نہیں۔ اگر صورت یہ ہوتی کہ ابوجہل تو ہوتا اور عمرؓ نہ ہوتا تو پھر البتہ گھبرانے کی بات تھی۔ دنیا آج کفر اور ایمان دونوں کی طرف سے بے اعتنا (INDIFFERENT). ہوتی جا رہی ہے اور جو لوگ زندگی کے حقائق کی طرف سے (INDIFFERENT). ہو جائیں ان سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ تھا جو کچھ دادا جان (مرحوم) نے فرمایا۔ اس واقعہ کے کافی عرصہ بعد جب ضربِ کلیم سامنے آئی تو اس کے شروع میں ہی یہ شعر نظر پڑا۔

نہ دیر میں، نہ حرم میں، خودی کی بیداری
کہ خاوراں میں ہے قوموں کی روحِ تریاکی

تو میری سمجھ میں آیا کہ دادا جان نے اتنا عرصہ پہلے کیا بات کہی تھی۔
یہ جملۂ معترضہ تھا۔ میں کلامِ اقبالؒ سے مردِ مومن کی صفات وخصوصیات کی مثالیں پیش کر رہا تھا۔ ضربِ کلیم میں وہ مردِ بزرگ کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

اس کی نفرت بھی عمیق اس کی محبت بھی عمیق	قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق
پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں	ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو	شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق
مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں	بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق

اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں کہ جب اقبالؒ کے کلام سے مردِ مومن کی خصوصیات میرے سامنے آئیں تو میں نے بصد تاسف کہا کہ دادا جان! مجھے اس بھری دنیا میں کوئی مومن نظر نہیں آتا۔ اب سوچئے کہ جب کلامِ اقبالؒ کے سامنے آنے سے میری یہ کیفیت ہو گئی تھی تو اس باب میں خود اقبالؒ کی کیفیت کیا ہو گی؟ اقبالؒ ساری عمر مردِ مومن کی تلاش کرتا رہا اور گلی گلی، کوچہ کوچہ، صحرا صحرا، دریا دریا پکارتا گیا کہ :-

در معرکہ بے سوزِ تو ذوقے نتواں یافت   اے بندۂ مومن! تو کجائی؛ تو کجائی؟

اس کی ساری عمر اسی پکار میں گذر گئی۔ لیکن زندگی بھر کی طلب و جستجو کے باوجود جب اسے مردِ مومن کی آواز کہیں سے سنائی نہ دی تو وہ ہار تھک کر بیٹھ گیا اور انتہائی کرب و الم کے ساتھ پکار اٹھا کہ

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش — مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
تمدن، تصوف، شریعت، کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ امت روایات میں کھو گئی
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے — مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

اور یہ اس لئے کہ

منزلِ و مقصودِ قرآں دیگر است — رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

دینِ حق از کافری رسواتر است — زانکہ مُلّا مومنِ کافر گر است

لہٰذا، مردانِ مومن کہاں سے آئیں؟

والسّلام
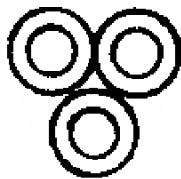
آدم کی کہانی اقبالؒ کی زبانی

یومِ اقبالؒ ۱۹۵۴ء کی تقریر

اسلام سے پہلے تمام مذاہب میں تصوّر یہ تھا کہ دنیا ایک جیل خانہ ہے جس میں انسان ایک بے کس و مجبور قیدی کی طرح زندگی کے دن کاٹ رہا ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان اپنے پچھلے جنم کے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا میں پابندِ سلاسل ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ ابنِ آدم اپنے اوّلیں ماں باپ، آدم و حوّا کے گناہ کی پاداش میں ماخوذ ہے۔ بدھ مت کے نزدیک انسان کی مصیبتوں کا راز اس کی آرزوؤں میں تھا اور اس مصیبت سے چھٹکارے کا علاج ترکِ آرزو۔ ویدانت کی رُو سے انسان کی ہستی ہی ایک فریبِ تصوّر اور عالم تمام حلقۂ دامِ خیال تھا۔ قرآن آیا اور اس نے سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) ہم نے ابنِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے۔ یہ مسجودِ ملائک اور مخدومِ خلائق ہے۔ کائنات کی پستیاں اور بلندیاں اس کے لئے مسخر کردی گئی ہیں۔ یہ شاہکارِ فطرت ہے۔ اِس کی تخلیق اَحسنِ تقویم کی مظہر ہے۔ اس کے مدارج بڑے بلند اور اس کے مناصب بڑے رفیع الشان ہیں۔

اقبالؒ چونکہ قرآن کا ترجمان ہے اس لئے اس کے کلام میں مقامِ آدم کو ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ آپ حضرت علامہؒ کی کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھئے، یہاں سے وہاں تک آدم کے احوال

ظروف کا تذکرہ ملے گا. کلامِ اقبالؒ میں آدم کی یہ سرگذشت اس قدر پھیلی ہوئی ہے کہ اس سے ایک مستقل کتاب مرتب ہوسکتی ہے. اس کے لئے تو بڑی فرصت درکار ہے. سر دست کچھ اُبھرے ہوئے عنوانات ہیں جن سے اس طویل و عریض داستان کے کچھ گوشے آپ کے سامنے لانے کی کوشش کی جائے گی. یہ سرگذشت حسبِ ذیل ابواب پر مشتمل ہے.

(۱) تخلیقِ کائنات.
(۲) پیدائشِ آدم.
(۳) ہبوطِ آدم.
(۴) آدم کی نیند. اور
(۵) اس کی بیداری.

علاوہ قلّتِ وقت کے، میری بڑی دشواری یہ ہے کہ حضرت علامہؒ کے کلام کا بیشتر حصّہ فارسی میں ہے اور اس قسم کی مخلوط محفلوں میں اُردو کے اشعار ہی زیادہ موزوں رہتے ہیں. لہٰذا، مجھے بھی زیادہ تر انحصار ان کے اُردو کلام پر ہی کرنا پڑے گا اور فارسی اشعار صرف وہاں پیش کروں گا جہاں اس کے بغیر چارہ نہ ہو.

اب سنئے سرگذشتِ آدم. یعنی اپنی اور میری سرگزشت.

پہلا عنوان تخلیقِ کائنات

ذرا تصوّر میں لایئے اس منظر کو کہ اس کائنات کی کوئی شے وجود میں نہیں آئی تھی. نہ زمین نہ آسمان. نہ چاند نہ ستارے. نہ شجر تھے نہ حجر. نہ صحرا تھے نہ سمندر. نہ حیوان تھے نہ انسان. ایک خدا کی ذات تھی اور باقی سب ہُو کا عالم. ظاہر ہے کہ ایسی سنسان حالت کب تک رہ سکتی تھی؟ ہر تصوّر اپنی نمود کے لیے بیتاب ہوتا ہے. ہر حقیقت، لباسِ مجاز میں آنے کے لئے پیکرِ اضطراب ہوتی ہے. ہر نقش اپنے اُبھرنے کے لئے پیچ و تاب کھاتا ہے. ہر جلوہ اپنے نکھرنے کے لئے برق در آغوش ہوتا ہے. ہر سبز پوش سرِ بام آنے کے لئے سیماب پا ہوتا ہے. یعنی ہر قوّتِ خاموش ذوقِ نمود و لذّتِ تخلیق سے عمل بیدار بننے کے لئے ہمہ تن شوق ہوتی ہے. شانِ الوہیت کی اسی لذّتِ تخلیق اور ذوقِ نمود نے

انگڑائی لی۔ خطیرۂ قدس کی ملکوتی فضا میں ہلکا سا تموج پیدا ہوا۔ عدم کے پردے اٹھے اور افق کے اس پار نگارخانۂ کائنات خاموشی سے ابھرنا شروع ہوا۔ یہ دن کارکنانِ قضا و قدر کی زندگی میں بڑی گہما گہمی کا دن اور یہ ساعت مدبرانِ امورِ الٰہیہ کے اوقات میں بڑی ہمہ ہمی کی ساعت تھی۔ یعنی وہ وقت جب کیفیت یہ تھی کہ:

سہانی نمودِ جہاں کی گھڑی تھی — تبسم فشاں زندگی کی کلی تھی
کہیں مہر کو تاجِ زر مل رہا تھا — عطا چاند کو چاندنی ہو رہی تھی
سیہ پیرہن شام کو دے رہے تھے — ستاروں کو تعلیمِ تابندگی تھی
فرشتے سکھاتے تھے شبنم کو رونا — ہنسی گل کو پہلے پہل آ رہی تھی

ہیولائے کائنات ابھرنے کو تو ابھرا لیکن بڑا بے کیف اور بہت بے رنگ۔ سورج اپنی نور افشانیوں اور حرارت سامانیوں کو لئے لئے سارا دن پھرتا رہتا لیکن نہ اسے کوئی آنکھ ایسی ملتی جو اس کی روشنی کی داد دیتی نہ کوئی سینہ ایسا ملتا جو اس کی تپش کو اپنی متاعِ سوز بناتے۔ چاند اپنے بلوریں ساغر میں مئے نور بھرے رات بھر محوِ تلاش رہتا لیکن اسے کوئی ایسا رندِ مست نہ ملتا جو اس آتشِ خنک کے جامِ مرمریں کو لپک کر اٹھالے۔ ستارے سرِ شام نقاب الٹ الٹ کر سرگرمِ تماشا ہو جاتے لیکن کوئی نگۂ نظارہ باز ایسی نہ ملتی جو ان کی چلمنی مسکراہٹوں سے آنکھ مچولی کھیلتی۔ لالہ اپنا سینۂ شق کئے دن بھر کسی کے انتظار میں چاروں طرف آنکھیں اٹھا اٹھا کر دیکھتا اور شام کو یاس و نا امیدی سے لڑکھڑا کر گر پڑتا۔ صحنِ چمن میں پھول خود ہی کھلتے اور تھوڑی دیر مسکرا کر خود ہی مرجھا جاتے۔ یعنی یہ وہ زمانہ تھا جب

عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے — ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذتِ رم سے
قمر اپنے لباسِ نو میں بیگانہ سا لگتا تھا — نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئینِ مسلم سے
ابھی امکاں کے ظلمت خانے سے ابھری تھی دنیا
مذاقِ زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے

کائنات کی اس تنہائی اور غمگینی، اس بے نوری اور بے سوزی، اس بے کیفی اور بے رنگی پر نقش طرازِ ازل کا جی بھر آیا۔ اس کے پاس سامانِ سوز و ساز کی کمی نہ تھی۔ صرف ایک ترکیبِ نو کی ضرورت

تھی۔ اس نے فرشتۂ میرِ سامان کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ پاکر تعظیم کے لئے جھکا اور سبُّوحٌ قدوسٌ کی بے صوت صداؤں میں تعمیلِ ارشاد کے لئے روانہ ہوا۔ اس نے

چمک تارے سے مانگی چاند سے داغِ جگر مانگا — اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی — حرارت لی نفسہائے مسیحِ ابنِ مریم سے

ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی!
ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیرِ شبنم سے

اور ان اجزا سے ایک مرکب تیار کیا۔ پھر اس میں کچھ آگ کی چنگاریاں بھریں اور اس پر خون کے چھینٹے دیئے۔ تسبیح بدست فرشتے چپکے ہی چپکے اس پیکرِ آب و گل کو دیکھتے جو ایسے متضاد عناصر سے ترکیب پا رہا تھا۔ وہ آج تک ہر عنصر کو الگ الگ دیکھنے کے عادی تھے۔ پانی کو پانی۔ آگ کو آگ۔ اس لئے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ آگ اور پانی۔ روشنی اور تاریکی۔ محبت اور عداوت۔ زہر اور تریاق۔ صلح اور فساد کا مجموعہ بالآخر بنے گا کیا؟ ہزارہا سال کی گردشوں کے بعد اس مشتِ خاک نے ایک متعیّن صورت اختیار کی۔ بکھری ہوئی شوخیاں سمٹ کر بجلیاں بن گئیں۔ زمین کانپی۔ آسمان تھرتھرایا۔ چاند کا ساغرِ زرّیں چھلک گیا۔ ستاروں کے نغمے سے دل دہل گئے۔ فضا میں اک شور اٹھا اور

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد — حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور — خودگرے خودشکنے خودنگرے پیدا شد
خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل — حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش بہ آغوشِ حیات — چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

اقبالؒ کی فارسی نظموں کا اردو میں ترجمہ بہت مشکل ہے۔ ترجمہ میں یوں بھی اصل کی روح نکل جاتی ہے۔ لیکن اس نظم کا ترجمہ علامہ اسلم جیراجپوریؒ نے کیا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان اشعار کو اردو داں طبقہ کو سمجھانے کے لئے اس سے زیادہ موزوں الفاظ ملنے مشکل ہیں۔ وہ ترجمہ یہ ہے:-

عشق چیخ اٹھا کہ اک خونیں جگر پیدا ہوا — حسن کانپ اٹھا کہ اک صاحبِ نظر پیدا ہوا
فطرت آشفتہ کہ خاکِ عالمِ مجبور سے — اک خود گر، خود شکن اور خود نگر پیدا ہوا
پہنچی گردوں سے شبستانِ ازل میں یہ خبر — پردہ دارو! ہوشیار اک پردہ در پیدا ہوا
آرزو تھی زندگی کی گود میں سوئی ہوئی — آنکھ کھولی اک جہانِ خیر و شر پیدا ہوا

زندگی بولی کہ تھی میں آب و گل میں مضطرب
بارے آج اس گنبدِ بے در میں در پیدا ہوا

علامہ اسلمؒ نے ان اشعار کے ترجمہ کے بعد کچھ اپنی طرف سے اضافہ بھی فرمایا ہے۔ ارشاد ہے۔

مسکرا کر یہ ملائک سے کہا ابلیس نے — لو تمہارا اک حریفِ تازہ تر پیدا ہوا
چرخ سے آئی ندا اے ساکنانِ بحر و بر — اک جہاں آشوب، ظالم، فتنہ گر پیدا ہوا
جس کی خاطر یہ زمین و آسماں چکر میں تھے — مادرِ فطرت کا وہ نورِ نظر پیدا ہوا

تھا فضائے عالمِ ناسوت کا بربط خموش
آخر اس سازِ کہن کا زخمہ ور پیدا ہوا

فرشتے اس پیکرِ خاکی کو دیکھ کر محوِ حیرت تھے کہ بالآخر اس میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر اسے تمام کائنات میں سب سے اونچے مقام پر بٹھایا جا رہا ہے۔ خلاقِ فطرت نے ان کا استعجاب دور کرنے کے لئے آدم کو باغِ جناں میں بھیج دیا جہاں ہر شے ایک خاص انداز سے رکھی گئی تھی اور کسی کو مجال نہ تھی کہ اس میں ذرا سی بھی تبدیلی پیدا کر سکے۔ آدم نے صحنِ چمن پر ایک تیرتی ہوئی نگاہ ڈالی اسے اس کی ترتیب کچھ پسند نہ آئی۔ اس نے اپنے دل میں کہا کہ یہ پیڑ وہاں ہونا چاہیئے۔ وہ روش یوں ہونی چاہیئے۔ اس پھول کا رنگ ایسا ہونا چاہیئے۔ اس پھل کے ذائقے میں یہ تبدیلی ہونی چاہیئے۔ وہ ابھی ان تبدیلیوں کا خیال ہی کر رہا تھا کہ جانبِ عرشِ عظیم سے آواز آئی کہ آدم! ہماری دی ہوئی ترتیب میں کوئی تبدیلی نہیں ہونی چاہیئے۔ آدم نے سر اٹھایا اور نہایت تمکنت سے کہا کہ معاف فرمایئے! جس جگہ مجھے رہنا ہے اس کی ترتیب میری پسند کے مطابق ہونی چاہیئے۔

گفت یزداں کہ چنیں است و چنیں خواہد بود
گفت آدم کہ چنیں ہست و چناں خواہد بود

آدم کے اس جواب پر صحنِ چمن سے دُور ایک طرف سے بلند قہقہے کی آواز اٹھی جس میں ابلیسانہ سرکشی کی گرج سی محسوس ہو رہی تھی۔ فضائے چمن پر سناٹا چھا گیا۔ معصوم فرشتے سہم کر کونوں گوشوں میں جا چھپے۔ ہر شے اپنی اپنی جگہ ساکت و صامت انگشت بدنداں کھڑی ہو گئی۔ اس سکوت کو ایک دلکش آواز نے یہ کہتے ہوئے توڑا کہ یہی وہ اختیار و ارادہ کی قوت ہے جو آدم کی سرفرازی و سربلندی کا موجب ہے۔ اسی سے یہ مسجودِ ملائک اور مخدومِ خلائق ہے۔ کشمکشِ حیات میں پُر کیف جاذبیتیں ہیں تو اسی سے اور کشاکشِ زندگی میں رنگین کیفیتیں ہیں تو اسی کے دم سے۔ بربطِ ہستی کے خوابیدہ نغمے بیدار ہوتے ہیں تو اسی کے مضراب سے اور مینائے حیات کے سادہ پانی میں کیفِ رنگ و تعطر کی ارغوانی موجیں اٹھتی ہیں تو اسی کے جوش سے۔ تم کائنات کی دوسری چیزوں پر غور کرو اور پھر انسان کی اس خصوصیتِ کبریٰ کو دیکھو۔ بات سمجھ میں آ جائے گی کہ ان میں اور انسان میں کیا فرق ہے۔

منظر چمنستان کے زیبا ہوں کہ نازیبا — محرومِ عمل نرگس مجبورِ تماشا ہے
رفتار کی لذت کا احساس نہیں اس کو — فطرت ہی صنوبر کی محرومِ تمنا ہے
تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں — انسان کی ہر قوت سرگرمِ تقاضا ہے
اس ذرہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم — یہ ذرہ نہیں شاید سمٹا ہوا صحرا ہے
چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی
یہ ہستیِ دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے

اب فرشتوں کو معلوم ہوا کہ اس پیکرِ آب و گل میں وہ کون سی قوتیں خوابیدہ ہیں جن کی بنا پر اسے کائنات میں یہ مقام عطا ہوا ہے۔ اس احساس سے ان کی نگاہیں تعظیم کے لئے جھک گئیں۔ آدم نے تبسم فشاں نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور کہا کہ اب مجھے اس دنیا میں جانا چاہیئے جسے میں اپنے نقشے کے مطابق ترتیب دے سکوں۔ آدم خراماں خراماں نیچے اُترا۔ اس کے جلو میں قطار در قطار فرشتے اسے رُخصت کرنے کے لئے ساتھ تھے۔ وہ نسیمِ سحر کی طرح آہستہ آہستہ ساتھ آ رہے تھے اور اپنی نور پاش بے صوت صداؤں سے یہ نغمۂ تبریک و تہنیت گا رہے تھے کہ

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بیتابی — خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سُنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن — تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی

جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی
گراں بہا ہے ترا گریہ سحر گاہی اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

یہ خسروانہ جلوس، بایں شوکت و سطوت جانبِ فلک سے سوئے زمین آیا۔ خاک کے ذرّے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ سبزۂ خوابیدہ جوشِ نمود سے بیدار ہوا۔ غنچے چٹکے، پھول کھلے، چاندنی مسکرائی۔ سینۂ بحر سے بیتاب موجیں اُبھر اُبھر کر دیکھنے لگیں۔ عروسِ فطرت نے اپنے حسین چہرے سے نقاب الٹی اور رُوحِ ارضی، اس تمام سامانِ رنگ و چنگ اور جہانِ شوخ و شنگ کو ساتھ لئے استقبال کے لئے آگے بڑھی۔ بربطِ ہستی کے خاموش تاروں میں ارتعاش پیدا ہوا اور سازِ فطرت کی ہم آہنگی سے رُوحِ ارضی نے یہ کہتے ہوئے آدم کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا کہ:۔

کھول آنکھ زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ ایامِ جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

خورشیدِ جہاں تاب کی ضَو تیرے شرر میں آباد ہے اِک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

آدم نے اس کرۂ ارضی کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ یہ ایک مٹی کا گھروندا ہے جس کا نہ کوئی متعین نقشہ ہے نہ ترتیب۔ سر پر آگ برسانے والا آتشیں گولہ۔ چاروں طرف بڑے بڑے پہاڑ۔ اِدھر اُدھر ساحل ناآشنا سمندر اور اس کی مہیب طغیانیاں۔ ڈراؤنے جنگل اور ان میں بڑے بڑے خطرناک درندے اور اژدہے۔ چاروں طرف خوفناک بلاؤں کا ہجوم اور ان میں نہتا ابنِ آدم، بے کس و

بے بس اور بے یار و مددگار۔ شروع شروع میں ان لرزہ انگیز بلاؤں نے اسے دبانا چاہا لیکن اس کے بعد اس کی مضمر قوتوں نے بیدار ہونا شروع کیا۔ اس نے پہاڑوں کے جگر شق کر دیئے۔ سمندر کے سینہ پر کشتیاں چلا دیں۔ بڑے بڑے مہیب طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے لئے آہنی دیواریں کھڑی کر دیں، دریاؤں کے رُخ بدل دیئے۔ ہواؤں کی سمتیں تبدیل کر دیں۔ آسمان کی بجلیاں مقید کر لیں۔ غرضیکہ اس زمین کا پورے کا پورا نقشہ بدل دیا۔ نہ وہ انداز رہے نہ وہ ترتیب، نہ وہ رنگ رہا نہ وہ ڈھنگ۔ اس نے فطرت کی ہر شے کو اپنے مطلب کے مطابق متشکل کر لیا۔ اس شکست و ریخت اور حرب و ضرب کو دیکھ کر ایک دن اللہ میاں نے اس سے کہا کہ تو نے یہ کیا کر دیا؟

جہاں را زیک آب و گل آفریدم — تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولاد ناب آفریدم — تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہالِ چمن را — قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

آدم نے یہ سُن کر کلہاڑا ایک طرف رکھ دیا اور کہا کہ گستاخی معاف! ذرا اپنی اور میری تخلیق پر غور تو کیجئے۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم — من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

ذرا اس مخلوق کو سامنے لائیے جسے تسبیح و تقدیس سے فرصت نہیں اور اس کے بعد یہ دیکھئے کہ میں نے اس دنیا کو کیا سے کیا بنا دیا ہے؟

قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن — ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد
مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے — وہ دشتِ سادہ وہ تیرا جہانِ بے بنیاد
مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں — انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

یہ تبدیلیاں تو وہ ہیں جو صرف مٹی اور پانی کی دنیا میں میرے ہاتھوں نمودار ہوئی ہیں لیکن ان سے کہیں اہم ہیں وہ نقوش و آثار جو دنیائے فکر و جہانِ تصورات میں میری کاہش و کاوش سے صورت پذیر ہوتے ہیں۔

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں
گاہ میری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

آدم کے اس دعویٰ کی شہادت زمین کے ذرّے ذرّے نے دی. چاروں طرف پہاڑوں سے اس کی صدائے بازگشت نے فضا کو معمور کر دیا اور پستیوں اور بلندیوں سے یہ آواز آنے لگی کہ یہ بالکل درست ہے

ہے گرمیِ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی

دن گذرتے گئے، آدم اپنے ہنگاموں میں سرگرمِ عمل رہا. ایک دن اس کے دو بیٹے کھیت میں کام کر رہے تھے. ایک کی کسی بات پر دوسرے کو تاؤ آ گیا. یہ تھا ذرا زور آور. اٹھا اور اسی کے تبر سے اس کا گلا کاٹ دیا. کھیت پر دُور دُور تک سُرخ خون کے چھینٹے بکھر گئے. اس نے اس سے پہلے کبھی سُرخ رنگ کے چھینٹے نہیں دیکھے تھے. وہ گھبرا گیا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو گیا. وہ دیوانہ وار بھاگ کھڑا ہوا. اس نے اپنے پیچھے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنی. مُڑ کر دیکھا تو اس کا بھائی اپنا سر ہتھیلی پر لئے اس کے پیچھے پیچھے بھاگے آ رہا تھا. اس منظر سے اس پر وحشت سی چھا گئی. یہ پہلا دن تھا کہ اسے ڈر معلوم ہوا. وہ جتنی تیزی سے بھاگتا اس کا بھائی اسی رفتار سے اس کا پیچھا کرتا. کام کرنے والے یہی دونوں بھائی تھے. دونوں اس افراتفری میں پڑ گئے. ایک کے پیچھے دوسرا. ایک ہاتھ میں کھلا ہوا خنجر، دوسرے کی ہتھیلی پر کٹا ہوا سر. زمین خون کے چھینٹوں سے لالہ زار. ان کی کھیتیاں اُجڑ گئیں. باغ ویران ہو گئے. مکان گر گئے. غاروں میں چھپے ہوئے درندے پھر باہر نکل آئے. پہاڑوں میں رُکے ہوئے طوفان دوبارہ اُمنڈ آئے. مسرتوں کے چشمے سُوکھ گئے. شادابیوں کے پھُول مُرجھا گئے. صحنِ عالم قتل گاہ بن گیا. جس پتھر کو اٹھایا نیچے سے خون کا فوارہ اُبھر آیا. جس شاخ کو توڑا لہو کے قطرے ٹپکنے لگ گئے. دنیا کا ہر بناؤ بگاڑ میں اور ہر تعمیر تخریب

میں بدل گئی۔ آدم کی ان وحشت سامانیوں کو فرشتے تعجب کی نگاہوں سے دیکھتے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ جاتے۔ مطلب صاف تھا کہ یہی ہے وہ اشرف المخلوقات، صدرِ بزمِ کائنات، گلِ سرسبدِ ممکنات جس کے سامنے جھکنے کے لئے ہمیں کہا گیا تھا! رفتہ رفتہ یہ باتیں اشاروں کنایوں سے گزر کر زبانوں تک آنے لگیں۔ اب بساطِ کائنات کے ہر گوشے میں یہی چرچا تھا۔ کارکنانِ قضا و قدر کی محفلوں میں ہر ایک ہی زبان پر یہی تذکرہ تھا۔ جو ان میں ذرا دیدہ ور تھے وہ کبھی کبھی یہ کہہ دیتے کہ آدم کا یہ جنوں عارضی ہے۔ اس کی یہ گراوٹ وقتی ہے ہمیں یقین ہے کہ

توڑ ڈالے گی یہی خاک طلسمِ شب و روز　　گرچہ الجھی ہوئی تقدیر کے پیچاک میں ہے

فرشتے یہ سُنکر سر ہلا دیتے۔ وہ درحقیقت آدم کی اس بربادی کو اپنی فتح سمجھتے تھے۔ اگرچہ وہ اس حرف کو زبان تک نہیں لا سکتے تھے۔ لیکن وہ خلاقِ فطرت سے کہنا یہی چاہتے تھے کہ "کیوں! ہم نہ کہتے تھے؟" ان کی اس سادہ لوحی کا طلسم کبھی کبھی اس قسم کی آواز توڑ دیتی ہے کہ یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ ایاز! قدرِ خود بشناس!

کجا نورے کہ غیر از قاصدی چیزے نمی داند　　کجا خاکے کہ در آغوش دارد آسمانے را

یعنی

عرشِ معلّٰی سے کم سینۂ آدم نہیں　　گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہر کبود
پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسّر تو کیا　　اس کو میسّر نہیں سوز و گدازِ سجود

بہرحال بزمِ پردگیانِ راز میں صبح و شام اس قسم کے چرچے رہتے، طعنے دینے والے طنز آمیز لہجے میں اور غمگساری کرنے والے ہمدردانہ انداز میں اس قسم کی باتیں کرتے کہ

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا　　وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے

ابنِ آدم بھی یہ سب کچھ سنتا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا کہ کیا کرے۔ وہ ہزار چاہتا کہ اپنے خنجر کو اٹھا کر کہیں دُور پھینک دے اور کسی طرح بھائی کا کٹا ہوا سر پھر سے اس کی گردن کے ساتھ جوڑ دے لیکن وہ یہ نہ کر سکتا نہ وہ۔ اب اس پر مایوسی چھانے لگی۔ وہ اپنے مستقبل سے ناامید ہونے لگا۔ وہ ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔ خاسر و نامراد، شرمندہ اور ناکام۔ ہتھیلی پر سر رکھ کر گہری سوچ میں ڈوب گیا اور اسی حالت میں سو گیا۔ آدم ہزاروں سال اسی طرح سویا رہا۔ سورج حسبِ معمول اس

کے دن کو روشن کرتا اور شام کو اسے سوتا چھوڑ کر اپنا چکر پورا کرنے چلا جاتا۔ چاند حسبِ دستور اپنی منزلیں پوری کرتا۔ لیکن آدم میں بیداری کے کوئی آثار نہ دیکھتا۔ فرشتوں سے اب نہ رہا گیا۔ انھوں نے جرأت کر کے بحضور رب العزت عرض کر ہی دیا کہ

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی　　نقش گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی
خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر　　تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست　　بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی
دانش و دین و علم و فن بندگیٔ ہوس تمام　　عشقِ گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی

جوہرِ زندگی ہے عشق جوہرِ عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغِ تیز پردگیٔ نیام ابھی

فرشتوں کو اس کا جواب سوائے ایک حسین تبسم کے اور کچھ نہ ملا۔ ایک دن جبریل کو ابلیس سرِ راہے مل گیا۔ اس نے اس سے کہا کہ ہمدمِ دیرینہ! یہ آدم کا معمہ کیا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر تم اس راز کو پا سکے ہو تو ذرا ہمیں بھی بتادو۔ ابلیس مسکرایا اور کہا کہ

یکے در معنیٔ آدم نگر از من چہ می پرسی　　ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے　　کہ یزداں را دل از تاثیرِ او پرخوں شود روزے

بہرحال زمانہ اسی طرح آگے بڑھتا گیا اور آدم خواب سے بیدار نہ ہوا۔ تا آنکہ

بیداری۔ آسمان پر کانفرنس

اِک رات ستاروں نے کہا نجمِ سحر سے　　آدم کو بھی دیکھا ہے کسی نے کبھی بیدار
کہنے لگا مریخ ادا فہم ہے تقدیر　　ہے نیند ہی اس چھوٹے سے فتنے کو سزاوار
زہرہ نے کہا اور کوئی بات نہیں ہے　　اس کرمکِ شب کور سے کیا ہم کو سروکار
بولا مہِ کامل کہ وہ کوکب ہے زمینی　　تم شب کو نمودار ہو وہ دن کو نمودار
واقف ہو اگر لذتِ بیداریٔ شب سے　　اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاکِ پُراسرار
آغوش میں اس کے وہ تجلی ہے کہ جس میں　　کھو جائیں گے افلاک کے سب ثابت و سیار

ناگاہ فضا بانگِ اذاں سے ہوئی لبریز
وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دلِ کہسار

اذان کی آواز پہاڑوں سے ٹکرائی اور ساری وادی اس ولولہ انگیز نعرے سے گونج اُٹھی کہ

برخیز کہ آدم را ہنگامِ نمود آمد　　　این مشتِ غبارے را انجم بہ سجود آمد

آدم نے ہزاروں سال کے بعد آنکھ کھولی۔ اس کے جاگنے سے سارا عالم جاگ اُٹھا۔ اس نے اپنے گرد و پیش نظر دوڑائی۔ جس دنیا میں وہ سویا تھا وہ دنیا کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ ایک نئی دنیا میں تھا۔ روحِ کائنات ایک بار پھر بے نقاب ہو کر اس کے سامنے آئی۔ اس نے پوچھا کہ یہ آواز کیا تھی، کہاں سے آئی اور کس نے دی؟ اس نے کہا کہ یہ آواز خاکِ پاکِ حجاز سے اٹھی۔ بلالؓ کے حلق سے نمودار ہوئی اور ساری دنیا کو یہ کہہ گئی کہ

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الاّ اللہ　　　خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الاّ اللہ
یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند　　　بُتانِ وہم و گماں لا الٰہ الاّ اللہ

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الاّ اللہ

اس آواز کو اذان کہتے ہیں۔ یعنی وحدتِ خالق اور وحدتِ آدم کا نعرۂ انقلاب۔ وہی اذان جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز　　　نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا!
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود　　　ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

یہی اذان ہے جو تمہاری بیداری کا موجب ہوئی ہے۔ اگر یہ اذان بلند نہ ہوتی تو آدم کبھی خواب سے بیدار نہ ہو سکتا۔ اب تو اٹھ اور پھر اپنا مقام پہچان۔

تو مردِ میداں تو میرِ لشکر　　　نوری حضوری تیرے سپاہی
کچھ قدر اپنی تو نے نہ جانی　　　یہ بے سوادی یہ کم نگاہی

تو نے اذان کے الفاظ کو سُنا ہے۔ اس کی حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لے کہ

رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا　　　اُتر گیا جو ترے دل میں لَاشَرِیکَ لَہٗ

جس کے دل میں "لَا شَرِيكَ لَهُ" اُتر جائے اسے بندۂ مومن کہتے ہیں اور

مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر زمیں سے تابہ ثریا تمام لات و منات

حریم ذات ہے اس کا نشیمن ابدی نہ تیرہ خاک لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات

اس پیامِ زندگی سے آدم کے دل میں نئی آرزوئیں بیدار ہوگئیں۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ اس کی مایوسیاں امیدوں سے بدل گئیں۔ دنیا اس کی نگاہوں میں پھر حسین نظر آنے لگی۔ وہ نئے ارادوں اور نئے ولولوں سے اٹھا اور ذوق و شوق کی ایک دنیا اپنے دل میں لئے اس سمت روانہ ہوا جدھر سے بانگِ اذان اس کے کان میں پڑی تھی، چلتے چلتے وہ حجاز کی وادیوں میں جا پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ ایک وسیع و رفیع قلعہ ہے جس کے دروازے پر جلی حروف لکھا ہے۔

مَنْ دَخَلَهُ كَانَ اٰمِنًا (۳/۹۷)

وہ دروازے پر ٹھٹکا کہ نہ معلوم اس حصارِ امن و عافیت میں داخلے پر کیا پابندیاں ہوں۔ پہرے دار نے کہا کہ اس میں داخل ہونے پر کوئی پابندی نہیں۔ صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ انسان کے پاس قلبِ سلیم ہونا چاہیئے۔ اور تمہارے خلوص اور تسلیم کی اس سے بڑھ کر دلیل اور کیا ہوگی کہ تم امن و سلامتی کی تلاش میں ہزاروں میل سے چل کر آئے ہو۔ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ۔ وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا (۱۵/۴۶-۴۷) اس میں امن و سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ اس میں داخل ہونے والوں کے دلوں سے کدورت، کینہ، عداوت، باہمی کبیدگی کی تمام آلائشیں دور ہو جاتی ہیں اور وہ خلوصِ قلب سے ایک دوسرے کے بھائی بن جاتے ہیں۔

آدم کو کسی ایسے ہی مقام کی تلاش تھی۔ اس نے پہرہ دار کو سلام کیا اور شاداں و فرحاں قلعے کے اندر چلا گیا۔

وہ جانے کو تو اندر چلا گیا لیکن اسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ فی الواقعہ ایک ایسا مقام ہے جہاں کوئی انسان دوسرے انسان کا گلا نہیں کاٹتا۔ جہاں کوئی سر بریدہ اپنا سر ہتھیلی پر لئے جوشِ انتقام میں دیوانہ وار کسی کے پیچھے پیچھے نہیں پھرتا؟ وہ رہ رہ کر اپنے آپ سے پوچھتا کہ یہاں فی الواقعہ خوف اور حزن کو کوئی دخل نہیں؟ کیا یہاں پہنچ کر انسان سچ مچ زمین کی پستیوں سے آسمان کی بلندیوں کی طرف اُبھرنے لگ جاتا ہے؟ اس کے دل میں رہ رہ کر یہ خیالات پیدا ہو رہے

تھے۔ ان وساوس کے ہجوم نے اس کے پاؤں میں لڑکھڑاہٹ سی پیدا کر دی۔ قریب تھا کہ وہ بیٹھ جائے یا پیچھے لوٹ آئے کہ اس نے سُنا کہ کہیں دُور افق کے اس پار سے یہ حیات آفریں آواز آ رہی ہے کہ کیوں گھبراتا ہے، کیوں خوف کھاتا ہے۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے — یقیں پیدا کر اے غافل مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی — ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

نہ معلوم اس آواز میں کیا سحر تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ اس کے اندر ایک نئی دنیا بیدار ہو رہی ہے۔ اسے ایسا نظر آ رہا تھا کہ جو کچھ وہ پہلے تھا وہ گم ہو رہا ہے اور اس کی جگہ ایک نیا آدم جنم لے رہا ہے وہ آدم کہ جس کی خاک کا ذرہ ذرہ اُبھر کر کہہ رہا ہے کہ

زمیں خاکِ درِ میخانۂ ما — فلک یک گردشِ پیمانۂ ما
حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است — جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

اس نئے آدم نے محسوس کیا کہ اس کے اندر عجیب و غریب قوتیں نمودار ہو رہی ہیں۔ اسے ایسا نظر آتا تھا کہ بحر و بر کی وسعتیں سمٹ کر اس کی مٹھی میں آ گئی ہیں۔ پہاڑوں بلکہ آسمانوں کی بلندیاں نیچے اتر کر اس کے لئے فرشِ راہ بن گئی ہیں۔ وہ اب اپنے آپ کو ساری کائنات سے اونچا دیکھ رہا تھا۔ اسے یوں دکھائی دیتا تھا گویا وہ زمین کو چھوڑ کر فضا میں اڑتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ تبدیلیاں کس طرح پیدا ہو رہی ہیں۔ یہ انقلاب کس وجہ سے آ رہا ہے۔ وہ اسی حیرت میں گم تھا کہ اس کے کان میں آواز آئی کہ اس میں حیرت و استعجاب کی کوئی بات نہیں حقیقت یہ ہے کہ

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

اس یقین سے اس کے جوہرِ خفتہ کی نمود ہو جاتی ہے۔ اسی سے اس کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہوتی ہیں۔ یہ قوتیں زمان و مکان کے محدود پیمانوں سے نہیں ناپی جا سکتیں۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

وہ حیران تھا کہ یہ آوازیں بار بار کہاں سے آتی ہیں جو اس کے دل میں پیدا ہونے والے ہر شبہ کا ازالہ کر کے اس کے اضطراب کو تسکین میں بدل دیتی ہیں۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتے اس سمت کو ہولیا جدھر سے یہ آوازیں آ رہی تھیں۔ آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ ایک وسیع و عریض میدان ہے۔ نہایت سرسبز و شاداب، سایہ دار گھنیرے درخت پھلوں سے لدے ہوئے، ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے اُبلتے ہوئے چشمے اور ناچتی ہوئی ندیاں، ہرے بھرے کھیت اور ان کے اناج سے لدے ہوتے خوشے۔ ہر سمت تازگی اور ہر طرف شگفتگی۔ اس میدان میں اِدھر اُدھر تندرست و توانا انسانوں کے گروہ تھے۔ جن کے چہروں سے سکون و طمانیت کا نور برس رہا تھا۔ ہر شخص کام میں مصروف لیکن کسی کی کسی حرکت سے تکان یا افسردگی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا تھا۔ جونہی یہ آدمِ نو اس میدان میں داخل ہوا چاروں طرف سے سلاماً سلاماً کی طمانیت تہنیت سے فضا گونج اٹھی اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل سے غیریت اور بیگانگی کے تمام حجابات دُور ہو گئے۔ اس نے ایسا محسوس کیا کہ وہ انہی میں سے ایک ہے اور یہ سب اس کے عمر بھر کے ساتھی ہیں۔ اتنے میں کھانے کا وقت آ گیا اور وہ سب ایک دسترخوان کے گرد بیٹھ گئے۔ نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں۔ کسی میں کوئی فرق اور کوئی تخصیص نہ تھی۔ اس نو وارد کے لئے یہ انداز بالکل نرالا اور یہ اسلوب غیر مانوس تھا۔ ان میں سے ایک نے اس کی حیرت کو بھانپ کر کہا کہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں؛

آب و نان ماست یک مائدہ دودۂ آدم کنفسِ واحدہ

یہاں ہر شخص کام کرتا ہے لیکن کام کے ماحصل کا کوئی مالک نہیں ہوتا۔

بندۂ مومن امیں، حق مالک است غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است

یہ باتیں تمہیں نئی نئی سی اس لئے دکھائی دیتی ہیں کہ تم ایک دوسری دنیا سے آئے ہو ورنہ یہ تو ایسی کھلی ہوئی حقیقت پر مبنی ہیں کہ ان کے سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہو سکتی۔ تم حیران ہو کہ ہم زمین میں ہل چلاتے ہیں۔ سال بھر محنت کرتے ہیں اور اس کے بعد ساری فصل کو خدا کے بندوں کے لئے کھلا چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے لئے صرف اپنی ضروریات کے مطابق رکھتے ہیں۔ تم ہماری محنت کو تو دیکھتے

ہو لیکن یہ بھی سوچو کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ 　　کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار 　　خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب 　　موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

جس نے یہ سب کچھ کیا ہے، ملکیت کا حق اس کا ہے یا تمہارا اور میرا؟ بس اتنا سا تل ہے جس کی اوٹ زندگی کا سارا پہاڑ کھڑا ہے۔ جو یہ سب کچھ کرتا ہے اس کا نام رازق ہے اور اتنی سی بات کے سمجھ لینے سے سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

ہماری دنیا میں حرام اور حلال کا یہی معیار ہے۔ جو رزق اس معاشرے سے ملے جس میں انسان صرف امین ہوں وہ رزقِ حلال، اور جس میں رزق، انسانوں کی ملکیت قرار پا جائے اور اس طرح اس کی نسبت غیر اللہ کی طرف ہو جائے وہ رزقِ حرام۔ تم یہاں جس قدر قوت و توانائی اور طاقتِ پرواز و برومندی دیکھتے ہو سب رزقِ حلال کی بدولت ہے۔

علم و حکمت زاید از نانِ حلال 　　عشق و رقت آید از نانِ حلال

اور اس نکتے کو یاد رکھو کہ

زندگی جز لذتِ پرواز نیست 　　آشیاں با فطرتِ او ساز نیست

جب زندگی نام ہی لذتِ پرواز کا ہے تو اس بات کے سمجھنے میں کیا دشواری پیش آ سکتی ہے کہ

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

ہمارے معاشرے میں چونکہ ہر ایک کو رزقِ حلال ملتا ہے اس لئے کسی کی پرواز میں کوتاہی نہیں آ سکتی۔ اور اس کا راز یہ ہے کہ یہاں ہر فرد، دوسرے کی سود و بہبود کی فکر میں مصروفِ کار رہتا ہے۔ "سودِ خویش" کی جگہ "سودِ ہمہ" یہاں کے نظام کا عروۃ الوثقیٰ ہے کیونکہ یہاں ہر فرد خدا کی صفتِ ربّ العالمینی کا مظہر ہے۔ ہماری ساری تعلیم کا ماحصل یہ ہے کہ

کس نباشد درجہاں محتاجِ کس　　نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

اس نووارد نے پوچھا کہ تم اپنے معاملات کس طرح طے کرتے ہو. یعنی یہاں حکومت کا انداز کیا ہے ؟ حکومت کا لفظ سُن کر اس مخاطب کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی. اس نے کہا کہ ہمارے ہاں حکومت کا تصور ہی نہیں. یہاں کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر حکم نہیں چلا سکتا. ہمارا ایمان یہ ہے کہ

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے　　حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آذری

ہمیں خدا کی طرف سے ایک کتاب ملی ہے جس میں نظامِ زندگی کے لئے محکم اور غیر متبدل اصول درج ہیں. اس کا نام قرآن ہے — اس لفظ کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر تبسم آگیا. ایک ثانیہ کے لئے گہری سوچ میں ڈوب کر اس نے سر اوپر کو اٹھایا اور کہا کہ تم نہیں جانتے قرآن کیا ہے!

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ　　دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست　　نقشہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است　　ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود　　جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اس ضابطۂ زندگی کے محکم اصولوں کی روشنی میں ہم اپنے معاملات علم و عقل کی رُو سے طے کرتے ہیں. اور ہم میں جو سب سے زیادہ صاحبِ فکر و عمل ہوتا ہے وہ ان فیصلوں کو جماعتی حیثیت سے نافذ کرتا ہے. نووارد نے پوچھا کہ اس صاحبِ فکر و عمل کو تم کیا کہتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ وہ ہمارے ہی جیسا ابنِ آدم ہوتا ہے. اسے ہم بندۂ حق کہتے ہیں. اور

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام　　نے غلام اُو را نہ اُو کس را غلام
بندۂ حق مردِ آزاد است و بس　　ملک و آئینش خداداد است و بس
رسم و راہ و دین و آئینش ز حق　　زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق

اس کا نام ہماری اصطلاح میں مردِ مومن ہے. وہ مردِ مومن جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن　　گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریل امیں بندۂ خاکی — ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرود ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمٰن

خاک کے ذرّے اپنی ارتقائی منازل طے کرتے کرتے پیکر آدم تک پہنچے اور آدم اپنی ارتقائی منازل طے کر لے کے بعد مقام مومن تک پہنچتا ہے۔ اور

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے — مومن کا مقام ہر کہیں ہے

مومن، فطرت کا شاہکار اور دائرۂ کائنات کا نقطۂ پرکار ہے۔ کائنات میں مومن کے مقام سے بلند اور کوئی مقام نہیں۔

مومنے بالاتے ہر بالاترے — غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اس کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔ کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث — مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

یہ مومن ہی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا — حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

لیکن اس کا ذوقِ سفر، ناقۂ بے زمام کی آوارگی نہیں کہ جدھر مُنہ اٹھایا چل دیئے۔ اس کے سامنے زندگی کا متعین نصب العین ہے اور اس کا ہر قدم اس نصب العین کی طرف اٹھتا ہے۔ یہ نصب العین اس کا اپنا متعین کردہ نہیں بلکہ اس ضابطۂ حیات کی رُو سے متعیّن شدہ ہے جو اس کی زندگی کی اساس ہے۔ وہ فضا کی پہنائیوں میں پورے زورِ بازو سے اڑتا ہے لیکن اپنی منزلِ مقصود کو کبھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ — نگاہِ اُو بشاخِ آشیانہ

مہ و انجم گرفتارِ کمندش   بدستِ اوست تقدیرِ زمانہ

قرآن کے محکم اصولوں کے ساتھ اس درجہ وابستگی اور اس کے بعد اپنے زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے میں اس درجہ آزادی۔ یہ ہیں وہ عناصر جن سے اس کی سیرت مرتب ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری   نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں
حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی   یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں
عناصر اس کے ہیں رُوح القدس کا ذوقِ جمال   عجم کا حسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں

آدم نو نے کہا کہ میں نے یہ سب کچھ سمجھ لیا۔ میں لفظاً لفظاً تم سے متفق ہوں کہ زندگی اسی کا نام ہے باقی سب وہم و تخیلات ہیں۔ میں اپنا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ مجھے اس حلقے میں شامل کر لیجئے۔ سننے والے نے کہا کہ ذرا اور سوچو۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے   لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اس نے کہا کہ میں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میرا فیصلہ مشرق اور مغرب کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ لیکن میں یہ اعلان عقل و ہوش اور قلب و نگاہ کی پوری تائید کے ساتھ کر رہا ہوں۔
اشھد ان لا الٰہ۔ اشھد ان لا الٰہ۔ سننے والے نے کہا کہ

لا الٰہ گوئی بگو از روئے جاں   تا ز اندامِ تو آید بوئے جاں
ایں دو حرفِ لا الٰہ گفتار نیست   لا الٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست
زیستن با سوزِ او قہاری است   لا الٰہ ضرب است و ضربِ کاری است

اس نے کہا کہ میں نے یہ بھی سمجھ لیا۔ اب مجھے بتا دیجئے کہ مجھے کرنا کیا ہے؟ اس نے کہا کہ اس کا سمجھنا کیا مشکل ہے۔ جاؤ دنیا میں چلو پھرو اور جہاں جہاں انسان اور خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نظر آئے۔ اسے درمیان سے مٹا دو تاکہ بندہ اپنے خدا کو اپنے سامنے بے حجاب دیکھ لے اور زمین اپنے پرورش کرنے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ تم دیکھو گے کہ

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے   قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

جاؤ اور صورِ اسرافیل لے کر ساری دنیا میں اعلان کر دو کہ

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ　　جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

تم دیکھو گے کہ اللہ کے دیئے ہوئے رزق کے سرچشموں پر انسان سانپ کی طرح گھیرا ڈال کر بیٹھے ہیں۔ جاؤ اور انہیں نقیبِ فطرت کا یہ پیغام ازلی سنا دو کہ

تدبّر کی فسوں سازی سے محکم ہو نہیں سکتا　　جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

تم مکتبوں اور خانقاہوں میں دیکھو گے کہ

شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ　　مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن

نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا　　ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن

میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد　　زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

یہ فریب کب تک قائم رہے گا۔ جاؤ اور انسانوں کے ان خود ساختہ پردوں کو الگ اٹھا کر پھینک دو۔

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے　　پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

حق را بسجودے صنماں را بطوافے　　بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

جاؤ اور ان تک خدا کا یہ پیغام پہنچاؤ کہ

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے　　میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

تم دیکھو گے کہ — ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو — آدمی کی تعظیم آدمی کی حیثیت سے کہیں باقی نہیں رہی۔ کہیں اس کی عزت، دولت کی وجہ سے ہوتی ہے کہیں جاہ و منصب کی وجہ سے۔ کہیں وہ رنگ و نسب سے پہچانا جاتا ہے کہیں ملک و قوم کی نسبت سے۔ دنیا میں انسان کی سب حیثیتیں اضافی رہ گئی ہیں۔ اس کی ذاتی حیثیت کہیں باقی نہیں رہی حالانکہ اس کے پیدا کرنے والے نے کہا تھا کہ وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ۔ ہم نے آدم کو بہ حیثیتِ آدم باعثِ عزت و تکریم بنایا ہے۔ جاؤ اور مہذب دنیا کے ایک ایک گوشے میں اعلان کر دو کہ

برتر از گردوں مقامِ آدم است　　اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

اس نے کہا کہ اس انقلابِ عظیم کے لئے مجھے کچھ ساز و سامان دے دیجئے۔ اس نے اس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تلوار دے کر کہا کہ

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند　　کائناتِ زندگی را محور اند

اوران دونوں کے مجموعے کا مطلب یہ ہے کہ یہی تلوار

لادیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر　　ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

اور دین سے مراد ہے جمیعتِ آدم کا ضابطۂ نظام جو وحی کی بنیادوں پر متشکل کیا گیا ہو۔ اس لئے

باخبر شو از مقامِ آدمی

آدمِ نو اس ساز و یراق اور اس جاہ و طمطراق کے ساتھ خراماں خراماں سوئے قوم آیا اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا۔ وہ اس طرح دنیا میں رہنے والوں کی طرف آ رہا تھا اور زمین کے ذرّے اُبھر اُبھر کر اس کے قدم چوم رہے تھے۔ آسمان جُھک جُھک کر اسے سلام کر رہا تھا اور فضا میں چاروں طرف سے یہ تہنیت بار زمزمہ بیدار ہو رہا تھا کہ

برتر از گردوں مقامِ آدم است　　اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

اور آسمان کی بلندیوں سے کوئی پکار کر کہہ رہا تھا کہ

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں　　کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

اتنے میں آنسوئے افلاک سے ندائے جمال نے نہایت محبت آمیز انداز سے کہا کہ آدم! تم یہاں سے گئے تھے۔ اب پھر یہیں آجاؤ۔ آدم نے نگاہ اوپر کو اٹھائی اور تعظیم اور شوخی کے ملے جلے حسین تبسم آمیز لہجے میں کہا۔

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر
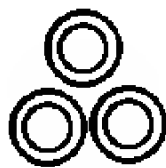
مجلسِ قلندرانِ اقبالؒ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ڈاکٹر عبدالوہاب عزامؒ کے ضربِ کلیم کے عربی ترجمہ کا تعارف پرویز صاحب نے لکھا تھا۔ ڈاکٹر عزام (مرحوم) نے صرف ضربِ کلیم کا ترجمہ نہیں کیا تھا اصل یہ ہے کہ دنیائے عرب کو پیامِ اقبالؒ کی روشنی سے منوّر کرنے کا سہرا انہی کے سر ہے۔ یہ شمع کس طرح سے روشن ہوئی اور اس کی روشنی کس طرح پھیلی، یہ داستان بڑی دلکش بھی ہے اور بصیرت افروز بھی۔ اسے پرویزؒ صاحب کے رفیقِ قدیم محترم خورشید عالم صاحب نے قلمبند کیا تھا اور وہ طلوعِ اسلام میں شائع ہوئی تھی۔ ہم زیرِ نظر تالیف کا اختتام اسی داستان پر کرتے ہیں کہ اس سے موزوں تر مقطع کا بند کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ (طلوعِ اسلام ٹرسٹ)

شروع ۱۹۵۱ء کا ذکر ہے کہ محترم پرویز صاحب کو یہ پیغام ملا کہ نئے سفیرِ مصر اُن سے ملنے کے متمنی ہیں۔ مملکتِ مصر کا نمائندہ اور ایک درویش سے ملنے کی خواہش! بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ پرویز صاحب اسی پر کم متحیّر نہ تھے کہ پیغامبر نے کہا کہ ان کے اس شوقِ ملاقات کا جذبۂ محرکہ وہ نسبت ہے جو آپ کو اقبالؒ سے ہے۔ اس پر پرویز صاحب کی آنکھوں کے سامنے یہ سارا نقشہ پھر گیا (جس کا تجربہ انہیں عمر بھر ہوتا رہا ہے) کہ کس طرح "بڑے لوگ" ضرورت کے وقت اقبالؒ سے وابستگی کا اظہار کرتے ہیں اور یوں طالب علمانِ اقبالؒ سے کس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس خیال نے پرویز صاحب کے دل سے اس ہلکے سے ردّ عمل کو بھی ختم کر دیا جو مجرّد تمنائے ملاقات سے قدرتاً

پیدا ہوا تھا، چنانچہ انہوں نے معذوری کا اظہار کیا۔ لیکن پیغامبر (سید عبدالواحد صاحب سیکرٹری مجلسِ اقبالؒ) نے اصرار کیا اور یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ صاحبِ موصوف کی طلب صادق ہے اور جذبہ خالص۔ ناچار پرویز صاحب آمادۂ ملاقات ہو گئے۔

پہلی ملاقات سفارت خانۂ مصر میں ہوئی۔ یہ اس لئے کہ پرویز صاحب وہاں خود چلے گئے تھے ورنہ سفیر صاحب نے تو یہ کہلا بھیجا تھا کہ انہیں بتایا جائے کہ کب اور کس وقت وہ پرویز صاحب سے ملنے کے لئے آئیں؟ سفارت خانے عجیب دنیا ہوتے ہیں۔ ان میں جھانک کر دیکھئے۔ شان و شوکت، ٹھاٹھ باٹھ، تصنع، تکلف، ظاہرداری (بے اختیار منافقت کا لفظ زبان پر آ رہا ہے) اور دیگر بے شمار بظاہر حسین مگر بباطن خبیث، دخترانِ مادرِ ڈپلومیسی قدم قدم پر نظر آئیں گی۔ یہ تن کی دنیا ہے جو "سود و سودا مکر و فن" سے معمور ہے نہ کہ "سوز و مستی جذب و شوق" سے آباد من کی دنیا۔ اس جہانِ گندم و جو میں ان درویشوں کا کہاں گزر جن کے قلوب و اذہان میں قرآن اور اقبالؒ نے اقدار کی ایک ایسی دنیا بسا رکھی ہو جس میں اضطرابِ موج کے ساتھ ساتھ سکونِ گہر بھی ہو جو بدلتے رہنے کے باوجود نہ بدلیں اور جن کی حالت یہ ہو۔

زبرونِ در گذشتم زدرونِ خانہ گفتم
سخنے نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم

بہرحال پرویز صاحب گئے اس حال میں کہ "آیا نہیں لایا گیا ہوں"۔ سفیرِ مصر ڈاکٹر عبدالوہاب عزام سے ملاقات ہوئی اور گفتگو شروع ہوئی۔ چند ہی لمحوں کے بعد پرویز صاحب نے محسوس کیا کہ وہ کاخِ نمایندۂ شاہی میں نہیں بلکہ کسی حجرۂ درویش میں ہیں۔ وہ درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی۔ ایک طرف ان کا علم و فضل تھا جو عالمانہ نمائش سے پاک تھا۔ اس میں سراسر طالب علمانہ تجسس تھا۔ دوسری طرف ان کا عشق تھا جس نے انہیں سراپا سوز و گداز بنا رکھا تھا۔ یہ اقبالؒ ہی کا فیض ہو سکتا تھا۔ اب پرویز اور عزام اس دنیا میں تھے جہاں تمام حجابات یک لخت اٹھ جاتے ہیں اور ملنے والے من تو شدم تو من شدی کی حقیقی "اَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ" کی تصویر بن جاتے ہیں۔

یہ منفرد ملاقات "مجلسِ قلندرانِ اقبالؒ" کا نقشِ اول تھی۔ اس بے مثل مجلس کی کوئی باقاعدہ

رسمی تاسیس نہیں ہوئی۔ حق تو یہ ہے کہ اس کا بیج ارکانِ مجلس کی کشتِ جاں میں بو دیا گیا۔ اس کا باقاعدہ نام بھی تجویز نہیں ہوا۔ جوں جوں سفر بڑھتا گیا مجلس کا نقشہ صاف تر ہوتا گیا تا آنکہ اسے ایک وقت اسے مجلسِ قلندرانِ اقبالؒ کہہ دیا گیا اور پھر اسے یہی کہا جانے لگا۔ بہرحال مجلس کی طرح یوں پڑی کہ عزام صاحب نے جو پیامِ مشرق کا عربی ترجمہ مکمل کر چکے تھے اور اس کی اشاعت کے انتظامات میں مصروف تھے، یہ خواہش ظاہر کی کہ انہیں (عزام صاحب اور پرویز صاحب کو) باقاعدہ ملتے رہنا چاہیئے تاکہ وہ آیندہ جس کتاب کا ترجمہ کریں، اسے ترجمے سے پہلے اکٹھے بیٹھ کر ازل تا آخر پڑھ لیں۔ سید عبدالواحد صاحب جنہوں نے پیغامبری کے فرائض سرانجام دیئے تھے بے اختیار بول اٹھے کہ اگر ایسی بات ہے تو اس میں انہیں بھی شریک کیا جائے تاکہ وہ بھی ان مباحث سے مستفید ہو سکیں۔ اس سے بات چل نکلی اور یہ فیصلہ ہوا کہ جو اور احباب اس محفل میں شریک ہونا چاہیں انہیں بھی شریک کر لیا جائے لیکن صرف انہی کو جو اس میں قلندرانہ رنگ میں شریک ہونا چاہیں۔ اس طرح ایک باقاعدہ اجتماع منعقد ہونا شروع ہوا۔

رفتہ رفتہ قلندروں کی تعداد ایک درجن کے لگ بھگ پہنچ گئی۔ گو ایسے حضرات بھی تھے جو کبھی کبھی آجاتے تھے لیکن ایک درجن کے قریب بالعموم پابندی سے شریکِ مجلس ہوتے رہے۔ لفظ "پابندی" شاید موزوں نہ ہو، لیکن ہم سب کا یہ حال تھا کہ مجلس ہو رہی ہوتی تو ہم اس میں شریک ہوتے تھے اور نہیں ہو رہی ہوتی تھی تو اس کے لئے انتظار اور تیاری میں لگے رہتے تھے۔ ہمارے لئے یہ وہ غذا جس کے بغیر نہ سینے کی کشود ممکن ہے، نہ قلب کا حضور، اور جب یہ دولت ہاتھ آجاتی ہے تو ——— کوئی اسے کو بہ قیامِ ہوش و حواس ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور قلندرانِ اقبالؒ کے لئے تو ہوش و حواس کا کھونا از قبیلِ محالات ہے۔

باچنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم
در جنوں از خود نہ رفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

مجلس بالعموم ہفتے میں ایک بار منعقد ہوا کرتی تھی۔ ہفتہ واری اجتماع کسی مجلس کے لئے بظاہر بڑا کافی ہے لیکن جن کے نزدیک گردشِ لیل و نہار کا معیار اوقات "ہماں بود کہ بایار بسر رفت" انھیں تو ہر وقت یہ خلشِ احساس رہتی ہے کہ "حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد" مجلس کے لئے دن کا کوئی

تعین نہیں تھا۔ گو وقت عموماً شام کے پانچ بجے کا ہوا کرتا تھا۔ یہ دن کی عدم تعیین قلندروں کے شوق
کا عجیب امتحان ہوا کرتی تھی۔ ہر بار نئی واردات اور نئی کیفیات کی حامل۔ عام طور پر مجلس برخاست
ہونے سے پہلے یہ طے کر لیا جاتا تھا کہ آئندہ اجتماع کب ہو؟ اس میں ایک رکاوٹ ہوا کرتی تھی اور
وہ تھی سفیر صاحب کی سرکاری مصروفیات۔ انہیں بہرحال ان کے مطابق وقت مقرر کرنا پڑتا
تھا اور محفل صرف اسی ایک رکاوٹ کے سامنے جھکنے کے لئے تیار ہوا کرتی تھی ورنہ کوئی اور مصروفیت
آئندہ یومِ انعقاد کے تعین میں حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ تعین کا منظر بھی قابلِ دید ہوا کرتا تھا۔ "آئندہ
کب؟" کے سوال پر سفیر صاحب اپنی ڈائری منگواتے تاکہ معین مصروفیات کا جائزہ لیں۔ گو انتظار
کیا جاتا کہ سفیر صاحب ڈائری دیکھ کر فارغ دن کا اعلان کریں لیکن بے صبری یا بے خودی کا یہ عالم
ہوتا تھا کہ ڈائری آتے آتے کئی دن "مقرر" ہو جایا کرتے تھے۔ ڈائری آتی تو سفیر صاحب اس کی
ورق گردانی کرتے اور مجلس ان کے چہرے کو پڑھتی۔ خود سفیر صاحب کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کہیں ہفتے سے
زیادہ کا وقفہ ہو گیا ہے تو وہ متردد نظر آتے تھے۔ اس وقت عجیب "سودا بازی" شروع ہو جاتی۔ چلئے ہم
صبح صبح آجائیں گے۔ اچھا یوں کیجئے۔ آپ ڈنر سے واپس آئیے اور پھر شب درمیان ہوئی۔ بہت سا
حساب بیباک ہو جائے گا۔ ایک مرتبہ ایسے ہی رات کی بات ہو رہی تھی تو سفیر صاحب نے بڑی بیساختگی
سے کہا "حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ" اس کے بعد مجلس میں یہ ضرب المثل ہو گئی تھی۔ اس سے ذوق و شوق کے
پیمانوں کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ مجلس کا وقت اس خیال سے مقرر
کیا گیا کہ اس سے فارغ ہو کر سفیر صاحب اپنی "غیر مجلسی" مصروفیت سے عہدہ برآ ہو سکیں گے لیکن ذوق
حضورِ دل میں طرح طرح کی راہیں تراشنا شروع کر دیتا۔ "یہ موضوع زیادہ اہم ہے۔" "یہ ٹکڑا زیادہ غور طلب
ہے۔" "اسے ایک ہی نشست میں نمٹا لینا چاہیئے۔" وغیرہ وغیرہ۔ سب کو رہ رہ کر خیال (اور بہت
حد تک افسوس) سفیر صاحب کی مصروفیت کا آرہا ہے۔ سفیر صاحب ہیں کہ فرما رہے ہیں کہ مجھے بھی جلدی
نہیں، تیار ہو کر چلے جانا ہے۔ چند منٹ اور بیٹھ لیتے ہیں، چند منٹ اور ــــ تا آنکہ ایک منٹ کا بیش و
بیش خلافِ مصلحت ہو جاتا اور سب بادلِ نخواستہ اٹھ کھڑے ہوتے۔

کسی مجلس کے ذکر یا تصور سے معاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے عہدیدار کون ہیں؟ سطورِ بالا
سے آپ کی توجہ شاید اس طرف نہ گئی ہو۔ یا ہو سکتا ہے کہ آپ نے یہ نتیجہ نکال لیا ہو کہ

مجلسِ قلندرانِ اقبالؒ میں مناصب کی تقسیم نہیں ہوگی۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ ہو بھی کیسے؟ اس مجلس کو باقاعدہ طور پر معرضِ وجود میں نہیں لایا گیا اور یوں بھی اس کی اٹھان اور فضا انجمنوں کے عام انداز و معیار سے بالکل مختلف رہی۔ لیکن نہیں۔ اس میں بھی مناصب پیدا ہو گئے تھے اور اس طرح سے جیسے وہ پہلے سے "مقدر" تھے۔

سب سے بڑا "عہدہ" پرویز صاحب کو ملا۔ وہ شیخ قلندراں کہلائے۔ اس کی صورت یوں ہوئی ہر چند مجلس کی تشکیل سفیر صاحب کی تحریک پر ہوئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر پرویز صاحب نہ ہوتے تو یہ تحریک لباسِ تشکیل اختیار ہی نہ کر سکتی۔ اگر سفیر صاحب نے مجلس کا ڈھانچہ تیار کیا تو پرویز صاحب نے اس میں روح پھونکی۔ چونکہ پرویز صاحب ہی اقبال پڑھا اور پڑھایا کرتے تھے اور اپنے مطالعۂ اقبال اور تدبر فی القرآن کی بدولت وہی اس کے اہل بھی تھے۔ اس لئے انہیں شیخِ قلندراں کہا جانے لگا۔ سفیر صاحب کو بھی منصب سے محروم نہیں رکھا گیا۔ اس میں ان کے سرکاری عہدے اور علمی مشاغل کی یہ رعایت رکھی گئی کہ انہیں "سفیرِ اقبال" کا لقب دیا گیا۔ وہ نہ محض والہانہ جوش سے ہر جگہ اقبالؒ کا پیغام پہنچاتے تھے بلکہ کلامِ اقبالؒ کا عربی میں ترجمہ کر کے آپ نے پوری دنیائے عرب کو فکرِ اقبالؒ کے نور سے منور کر دیا اور اس طرح اس دنیا کے لئے تنہا "سفیرِ اقبال" قرار پاتے۔

ایک منصب "ساقی" کا تھا۔ آج وہی ساقی ساقی گری کی شرم رکھ کر اس اجڑی محفل کی یاد کو دل و دماغ میں بساتے اس کی داستان گوئی کا فریضہ ادا کر رہا ہے۔ یہ منصب بھی بلا وجہ عطا نہیں ہوا۔ دراصل منصب بقدرِ ظرفِ عمل ہوتا تھا۔ ہر منصب کا استحقاق عمل تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ مجلس شروع ہوتی تو سفیر صاحب کے ملازمین چائے کی تیاری شروع کر دیتے (میں نے اس وقت انہیں "ملازمین" محض تعارف کے لئے لکھا ہے۔ ورنہ وہ بھی درحقیقت اس مجلس کا ایک جزو بن چکے تھے اور انہیں کسی بڑے سے بڑے مہمان کی تواضع میں وہ لطف نہیں ملتا تھا) جب چائے تیار ہو چکتی تو چائے کا دور چلتا۔ شروع شروع میں ایسا ہوا کہ چائے آئی تو اتفاق سے راقم الحروف نے چائے بنائی۔ دو ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا۔ ایک مرتبہ چائے رکھ دی گئی لیکن شروع نہ کی گئی کیونکہ شیخِ قلندراں اپنا بیان ختم نہیں کر چکے تھے۔ جونہی بیان ختم ہوا سفیر صاحب نے فرمایا "ساقی" اور چائے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی بیساختہ داد دی گئی اور ساقی پر ساقی گری کی دائمی ذمہ داری آ پڑی۔ چائے کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ کھانے کے لئے ضرور ہوتا تھا اس کی تقسیم کی ذمہ داری ساقی پر نہ تھی۔

ساقی کا کام "سقایتِ مجلس" تک محدود تھا. تقسیم کا کام "قاسم" کے سپرد ہوا. قاسم ہمیشہ ساقی کے معاون رہے. ساقی کا پیالہ بڑھتا تو قاسم کی پلیٹ اس کے ساتھ پہنچتی. ساقی گری بڑی نازک ذمہ داری ہے پھر قلندروں کی ساقی گری! کچھ پوچھئے نہیں. دس بارہ قلندر جن کی "ہر لحظہ نئی شان نئی آن" اسے کم دودھ اُسے تیز قہوہ. یہ اتنی شکر وہ اتنی شکر. مجلسِ قلندران کی ساقی گری ظرف شناسی سے کہیں زیادہ مزاج شناسی تھی اور مزاج شناسی کا امتحان شکر کے معاملہ میں ہوا کرتا تھا. کیونکہ جہاں ایسے قلندر تھے کہ جو چائے کو شکر آمیز کرنے کے روادار نہیں تھے وہاں ایسے قلندر بھی تھے جو "تلخئ چائے" کو شکر سے انگبیں بنا کر کام و دہن کی آزمائش کیا کرتے تھے. ساقی کو اس نشیب و فراز کی خصوصی رعایت مدنظر رکھنا پڑتا تھی. ساقی کو قاسم کی بھی خصوصیت سے رعایت رکھنا پڑتی تھی. کیونکہ اس کی "قسمت" کی پلیٹ قاسم کے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی. قریباً ہر محفل میں دونوں آنکھوں آنکھوں میں پیالی اور پلیٹ کے ایسے سودے کر لیتے تھے کہ قلندروں کو خبر تک نہ ہوتی تھی. اس راز کا افشا کرتے ہوئے ساقی کو یقین ہے کہ اگر وہ اہلِ محفل سے پوچھتے کہ کیا وہ مجھے ساقی تسلیم نہیں کرتے تو اس کا جواب "بلیٰ" ہوگا. قلندروں کے انداز بڑے نرالے ہوتے ہیں. ہاں تو یہ قاسم تھے سب کے ہر دلعزیز عزیزالحسن[1].

ایک عہدہ جو دیا نہیں گیا لیکن جس کا پورا پورا استحقاق پایا جاتا ہے "علی بخش" کا ہے. یہ ان خدامِ مجلس کو زیب دیتا ہے جن کے دماغ اقبالؒ کو نہ پا سکے لیکن جن کے دل قلندروں کی طرح گرم اور ہاتھ قلندروں کی طرح سرگرم تھے. ابراہیم، خمیس، محمد وہ "علی بخش" ہیں جو سفیر صاحب کے خدامِ خانہ تھے. وہ مجلس کے دن کا اتنی ہی بیتابی سے انتظار کرتے تھے جتنا کہ بڑے سے بڑا قلندر کر سکتا ہے. دوپہر کے بعد ان کا سارا کاروبار بند ہوتا تھا. وہ محبت آمیز انہماک سے چائے اور اس کے لوازمات تیار کرتے تھے. یہ ذہنی طور پر ہمارے شریک نہیں تھے لیکن روحانی طور پر ہم سے بالکل جدا نہیں تھے.

مجلس کا معمول یہ تھا کہ پرویز صاحب اقبالؒ کے اشعار پڑھتے جاتے اور ساتھ ساتھ ان کی تشریح بھی کرتے جاتے. یوں بھی ہوتا تھا کہ نئی کتاب یا نیا موضوع شروع کرنے سے پہلے ایک جامع تمہیدی تقریر ہوتی جس میں موضوع کا بسوط بیان ہوتا. اقبالؒ کا کلام اور پرویز صاحب کا بیان محفلِ علمی اور وجدانی طور پر ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتی. کراچی کی بے آب و گیاہ وادی میں مصری سفارت خانہ بمنزلہ نخلستان تھا. وہ نخلستان

---

[1] یہ لکھتے ہوئے کلیجہ سے اک ہُوک سی اٹھتی ہے کہ وہ اب مرحوم ہو چکے ہیں. (۱۹۷۴ء)

جہاں روح کی بالیدگی کے بے حساب سامان تھے۔ پرویز صاحب کے بیان کے بعد یوں تو بہت کم کسی سوال کی گنجائش رہ جاتی لیکن جب کبھی ان کے علم کے تخیلِ بلند تک کسی کا کوتاہ ہاتھ نہ پہنچتا وہ درخت خود جُھک کر اس کے دامن کو بھرپور کر دیتا۔

ایسا بیان کوئی آدھے گھنٹے تک کے لئے ہوتا۔ اس کے بعد "علی بخش" محفل کا رنگ بدل دیتے۔ پھر محفل کا چارج ساقی کے سپرد ہوتا اور شیخ ذرا سستا لیتے۔ قلندر مطالعۂ اقبالؒ میں مستغرق بحرِ قرآن کی غواصی کر رہا ہو تو کیا اور چائے کی میز پر مائل بہ تفریح ہو تو کیا۔ وہ ___ رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز ___ ہوتا ہے۔ دونوں اس کی ذات کے شئون ہیں اور وہ دونوں میدانوں میں قلندر رہے۔ وقفہ چائے میں لطافت و ظرافت کی مخصوص فضا پیدا ہوتی۔ وہ فضا جس کے تصور سے اب بھی روح میں شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد "شمع" پھر شیخِ قلندران کے سامنے پہنچ جاتی۔ پرویز صاحب ہمیں ان گذرگاہوں میں لے جاتے کہ ستارے بھی جن کی گردِ راہ بن جاتے اور فلک زمین معلوم دیتے۔ اس جذب و انہماک میں "سفیرِ اقبالؒ" زمین کے ہنگاموں" کو نہ بھولتے اور انہیں پتہ ہوتا کہ ترجمہ کرتے وقت ان کو کیا کیا دقتیں پیش آئیں گی۔ وہ ان دقتوں کو پیش کرتے اور پرویز صاحب ان کا حل کرتے۔ سفیرِ اقبالؒ کے متعلق غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ ایک زمانے سے اقبالؒ کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔ خود بلند پایہ ادیب اور شاعر ہیں۔ عربی تو ان کی مادری زبان ہے، انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور فارسی تک میں انہیں دستگاہ ہے۔ اس کے باوصف جب وہ پرویز صاحب سے ملے تو انہیں معلوم ہوا کہ جب علم و فکر، قرآن کی بھٹی سے ہو کر نکلتے ہیں تو کیا بن جاتے ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ انہوں نے اب اقبالؒ کو سمجھا ہے۔ انہوں نے سمجھا ہی نہیں، وہ سمجھاتے بھی پھرتے ہیں۔ "سفیرِ اقبالؒ" کا لقب انہی کو زیب دے سکتا ہے۔ اب تک وہ پیامِ مشرق، ضربِ کلیم اور اسرار و رموز کا عربی ترجمہ کر چکے ہیں۔ پہلے دونوں ترجمے شائع ہو چکے ہیں اور تیسرا پریس میں تھا کہ آپ کا تبادلہ ہو گیا۔ آپ نے ایک کتاب اقبالؒ کی سیرت، فلسفہ اور شاعری پر بھی لکھی ہے۔ آپ نے ضربِ کلیم کے ترجمے کا تعارف پرویز صاحب سے لکھوایا اور اپنے مقدمہ میں مجلسِ قلندران کا بڑی عقیدت سے ذکر کیا ہے۔

اس مجلس میں ضربِ کلیم، بالِ جبریل، ارمغانِ حجاز (حصہ اردو) جاوید نامہ، اسرار و رموز، پس چہ باید کرد، بانگِ درا (چیدہ چیدہ) لفظاً لفظاً پڑھی گئیں۔ ہمیں اس کمی کا احساس رہا کہ کوئی مختصر نویس مہیا نہ ہو سکا کہ جو ان مجالس کے نوٹ لے سکتا۔ یہ دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ اقبالؒ کے متعلق اس سے پہلے کبھی اتنا کچھ اور

اس طرح کہا یا سُنا نہیں گیا۔ اگر یہ سب کچھ جمع ہو جاتا تو اقبالؒ پر کئی مجلدات تیار ہو جاتیں اور پھر شاید ایک عرصہ تک اس سے آگے بات نہ کی جا سکتی۔ لیکن بقول غالب۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

سفیرِ اقبالؒ نے دامن بھر بھر کے اس متاعِ فقیر کو دنیائے عرب میں لٹا دیا۔

قارئین یہ سُن کر متعجب ہوں گے کہ مجلسِ قلندراں ـــ ایک "ختم" کی تقریب بھی منایا کرتی تھی۔ یہ تقریب ہر کتاب کے خاتمہ پر منائی جاتی تھی۔ جب کسی کتاب کا اس قدر حصہ باقی رہ جاتا جسے آئندہ نشست میں ختم ہو جانا تھا تو اس کتاب کی آخری مجلس معمول سے ذرا دیر میں یعنی مغرب کے لگ بھگ منعقد کی جاتی۔ سفیرِ اقبالؒ اپنی کتاب پر لکھتے کہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت فلاں جگہ کتاب ختم کی گئی۔ پھر اس تحریر کے نیچے تمام قلندروں کے دستخط ہوتے، اس کے بعد سب مل کر کھانا کھاتے۔ اس دعوت میں ساقی اور قاسم کے سب امتیازات ختم کر دیئے جاتے۔ ہر کوئی اپنا ساقی ہوتا اور اپنا قاسم۔ تکمیلِ مرحلہ کی خوشی قلندروں کی پیشانیوں سے ہویدا ہوتی اور گفتگو میں لطافت اور شگفتگی بن کر ظاہر ہوتی۔ محفل کا یہ رنگ چائے کے لگ بھگ تو ہوتا مگر اس کا دوران زیادہ ہوتا۔

اس مجلس کی آخری نشست ۱۱ دسمبر ۱۹۵۴ء کی شام کو منعقد ہوئی۔ یہ نشست عاجلانہ طور پر طلب کی گئی کیونکہ کسی فرزانے قلندر کو یہ سوجھ گئی کہ سفیرِ اقبالؒ پاکستان سے رخصت ہو رہے ہیں تو ایک نشست کو "منتشکل" کر کے محفوظ کر لیا جائے۔ قلندرانِ اقبالؒ جو نقوش و کیفیات کو دل کی لوح پر لیے پھرتے تھے اس کے قائل ہو گئے۔ آخری نشست کا سماں دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ سینوں میں تلاطم تھا، مگر چہرے سنجیدہ تھے۔ نہ گریاں نہ خنداں۔ فراق کی خلش ضرور تھی لیکن یہ اطمینان تھا۔

نہ کر ذکرِ فراق و آشنائی کہ اصلِ زندگی ہے خود نمائی
نہ دریا کا زیاں ہے نہ گہر کا دلِ دریا سے گوہر کی جدائی

اس لئے ہر ایک کی حالت یہ تھی۔

کشادم چشم و بربستم لبِ خویش سخن اندر طریقِ ما گناہیست

ہمیں اطمینان تھا کہ ہمارا سفیرِ اقبالؒ اس محفل کو سونا کر جائے گا تو کیا۔ وہ جہاں جائے گا نئی محفلیں آباد کرے گا جو اس ویرانی کا صلہ بن جائیں گی۔ یہ ضبط بھی درحقیقت پیامِ اقبالؒ اور تعلیمِ قرآن ہی کے صدقے میں تھا

دریہ سینے میں تلاطم خیزیاں ساحل ناآشنا ہو رہی تھیں۔

یہاں تک تو ضبط نے ساتھ دیا۔ لیکن جب محفل شروع ہوئی تو اس کا نقشہ کچھ اور ہو گیا۔ اتفاق سے اس دن "پس چہ باید کرد" کا آخری باب زیرِ مطالعہ تھا جس کا عنوان ہے "در حضور رسالتمآبؐ"۔ ایک طرف اقبالؒ حضورِ رسالتمآبؐ میں۔ آپ اندازہ لگائیے کہ اس کی کیفیت کیا ہو سکتی ہے؟ دوسری طرف شیخ قلندران اور سفیرِ اقبالؒ۔ دونوں کی حالت یہ ہے کہ حضور ختمی مرتبتؐ کی محبت میں ہمہ تن سوز۔ انہی کے سوز سے باقی قلندروں کے سینے بھی حرارتوں سے معمور۔ پوچھئے نہیں کہ مجلس پر کس قدر والہانہ کیفیت طاری تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ آسمان سے نور کی بارش ہو رہی ہے۔ اس کا اہتمام کر لیا گیا تھا کہ جہاں اس آخری محفلِ سوز و ساز کے نقشے کو کیمرے کی پلیٹ میں محفوظ کر لیا جائے وہاں اس کے الفاظ کو بھی ریکارڈ میں ضبط کر لیا جائے۔ چنانچہ ایسا کر لیا گیا۔ اب جس وقت اس محفل کی یاد سے قلندروں کے سینے میں ہوک سی اٹھتی ہے، وہ اسے اپنے لئے فردوس گوش بنا لیتے ہیں۔

یہ آخری محفل اس کیف بار حیات آور وعدہ پر ختم ہوئی کہ اگلی کتاب (ارمغانِ حجاز) خود حریم کعبہ اور صحن مسجدِ نبویؐ میں بیٹھ کر پڑھی جائے گی۔ یہی وعدہ ہے جو اب قلندروں کی تمناؤں کا حسین مرکز بن رہا ہے اور جس سے آنے والے دن، ان کی نگاہوں میں اس قدر تابناک ہو رہے ہیں۔ (دسمبر ۱۹۵۴ء)۔ (خورشید عالم)

اس کے بعد سفیر صاحب جدہ تشریف لے گئے اور اپنے ہر خط میں اس وعدہ کو دہراتے رہے کہ جونہی حالات مساعد ہوئے وہ تمام "قلندروں" کو دعوت دیں گے اور "ارمغانِ حجاز" کا مطالعہ اور ختم "حریم کعبہ اور صحن مسجدِ نبویؐ (علیہ التحیۃ والسلام) میں ہوگا۔ (اس دوران میں حالات ناسازگار سے رہے جن کے تذکرہ کی یہاں ضرورت نہیں)۔ دسمبر ۱۹۵۷ء میں، وہ انٹرنیشنل اسلامک کلوکیم (منعقدہ لاہور) میں تشریف لائے تھے۔ انہوں نے مجھے اس کی پہلے سے اطلاع دے دی اور تاکید سے لکھا کہ تم کلوکیم میں ضرور آنا تاکہ ملاقات کے لئے کافی وقت مل جائے۔ چنانچہ میں لاہور آ گیا اور جس گرمجوشی سے وہ ملے اس سے میرے سینے میں ابھی تک حرارت باقی ہے۔ انہی کے ایما سے کلوکیم کے دوران، دیال سنگھ کالج ہال میں "من و یزداں" کے عنوان پر میری تقریر ہوئی جس کی انہوں نے صدارت فرمائی۔ پھر یہیں یہ بھی طے ہو گیا کہ وہ کلوکیم کے بعد کراچی پہنچ کر ایک عام مختص کرنا چاہتے ہیں تاکہ ایک بار پھر مجلسِ قلندران کا انعقاد ہو جائے۔ ۹۔ جنوری ۱۹۵۸ء کی شام (سفارتخانے

کے مجاہدے میرے کاشانے میں، اس مجلس کا انعقاد ہوا اور زمانے کی طنابیں چار سال پیچھے کو کھنچ گئیں۔
نہ معلوم ان کے دل میں کیا خیال آیا کہ انہوں نے خاص طور پر کہا کہ اس مجلس کا ریکارڈ بھی ٹیپ پر محفوظ کر لینا۔
چنانچہ ایسا کر لیا گیا۔ رخصت کے وقت انہوں نے تمام قلندروں سے باچشمِ نم کہا کہ اب حریمِ کعبہ
میں ملاقات ہوگی۔

کیا معلوم تھا کہ یہ ملاقات "حریمِ جنت" پر ملتوی ہو جائے گی! جنوری ۱۹۵۹ء میں ان کا (الریاض
میں) حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ طوبیٰ لہٗ وحسن مآب۔

(پرویز)